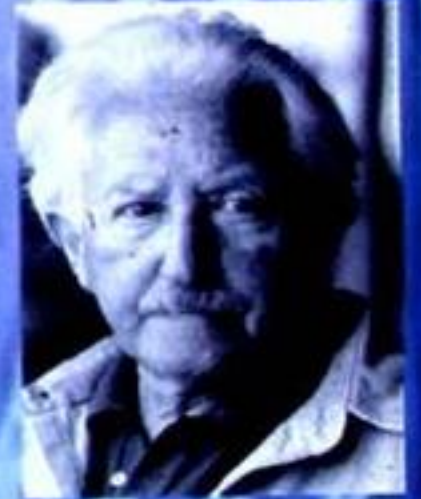
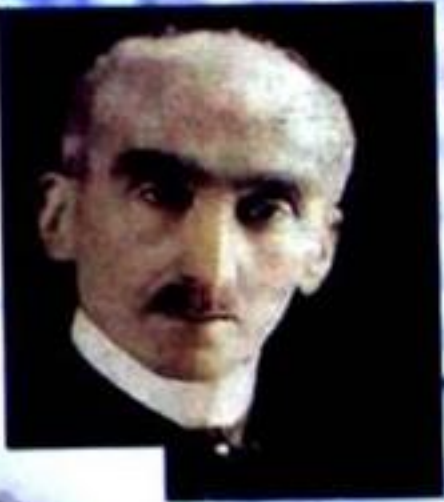


سید اقبال امر وہوی

# نفسیات کے معمار





سید اقبال امروہوی

---

## نفسیات کے معمار



**Tibbi Books for  
Atiba Karam**

[www.facebook.com/Tibbi.Books/](http://www.facebook.com/Tibbi.Books/)



# نفسیات کے معمار



مصنف:

سید اقبال امروہوی



زیر اہتمام:



**تخلیق کار پبلشرز**

۲۰۵، گلی نمبر ۶، جے۔ اے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲



نام کتاب : **نفسیات کے معمار**

ناشر و مصنف : سید اقبال امروہوی

رابطہ : ۶۰۹/بی، اے۔ کے ٹاور، مدینہ منزل کا مپلیکس، ایس۔ وی روڈ  
گورے گاؤں (ویسٹ)، ممبئی۔ ۴۰۰۰۶۲

تعداد : ۵۰۰

زیرِ اہتمام : انیس امروہوی

○ **تخلیق کار پبلشرز**

۲۰۵، گلی نمبر۔ ۶، جے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

سرِ ورق : مسعود التمش

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

مطبوع : کلاسیک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔ پی)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

کتاب دار، جلال منزل، نیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔ جے۔ اسپتال، ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۸

ہورائزن ڈسٹری بیوٹرس، گورا چاند روڈ، انشالی، کولکاتہ۔ ۷۰۰۰۱۳ (مغربی بنگال)

T.P.: 0211

NAFSIYAAT KE ME'AMAAR

By SYED IQBAL AMROHVI

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

205, St. No. 6, J-Ext., LAXMI NAGAR, DELHI - 110092

Ph.:011-22442572, 9811612373

ISBN-978-93-80182-26-1

2010

₹ 300.00

E-mail:qissey@rediffmail.com



# ماہرینِ نفسیات کے نام

جرات ہے تو افکار کی دُنیا سے گزر جا  
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے  
کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار  
جب تک تو اسے ضربِ کلیسی سے نہ چیرے

— علامہ ڈاکٹر محمد اقبال



# فہرست

☆	عرض حال	_____	سید اقبال امروہوی	۹
☆	تعارف	_____	شمیم حنفی	۱۷
۱۔	بقراط	_____		۱۹
۲۔	ارسطو	_____		۲۸
۳۔	ڈیکارٹ	_____		۳۸
۴۔	جان لاک	_____		۵۰
۵۔	برخ اپسی نوزا	_____		۶۱
۶۔	فرانس گیلٹن	_____		۷۲
۷۔	لہیم وونٹ	_____		۸۲
۸۔	ولیم جیمس	_____		۹۴
۹۔	ایوان بیولوف	_____		۱۱۱



- ۱۱۹ \_\_\_\_\_ سگمنڈ فرائڈ ۱۰۔
- ۱۳۹ \_\_\_\_\_ جان ڈیوی ۱۱۔
- ۱۵۶ \_\_\_\_\_ ایڈورڈ ٹچینر ۱۲۔
- ۱۶۷ \_\_\_\_\_ ایڈورڈ تھارنڈانک ۱۳۔
- ۱۷۴ \_\_\_\_\_ کارل یونگ ۱۴۔
- ۱۸۶ \_\_\_\_\_ الفریڈ ایڈلر ۱۵۔
- ۲۰۰ \_\_\_\_\_ ہنری برگساں ۱۶۔
- ۲۱۵ \_\_\_\_\_ جان وائسن ۱۷۔
- ۲۲۷ \_\_\_\_\_ زین پیازے ۱۸۔
- ۲۳۷ \_\_\_\_\_ کیرن ہارنائی ۱۹۔
- ۲۴۷ \_\_\_\_\_ کرٹ لیون ۲۰۔
- ۲۶۰ \_\_\_\_\_ گورڈن آلپورٹ ۲۱۔
- ۲۷۰ \_\_\_\_\_ امینویل کانٹ ۲۲۔
- ۲۸۰ \_\_\_\_\_ برہس فریڈرک اکیئر ۲۳۔
- ۲۹۲ \_\_\_\_\_ اینا فرائڈ ۲۴۔
- ۳۰۷ \_\_\_\_\_ ڈیوڈ ہیوم ۲۵۔



**Tibbi Books for  
Atiba Karam**



# عرض حال

جب کسی علم کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُس علم کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تاکہ اس کی بتدریج ترقی اور نشوونما کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکیں۔ اس سلسلہ میں اگر نفسیات کا ذکر کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات کی ابتداء اُسی وقت ہو گئی تھی جب انسان نے سوچنا شروع کیا تھا، یعنی نوع انسانی کے وجود کے ساتھ نفسیات کا بھی وجود ہو گیا تھا، لیکن اُس زمانے سے ہم نفسیات کی تاریخ مرتب نہیں کر سکتے کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی مواد ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

اگر ہم نفسیات کے کلاسیکی معنی سے بحث کریں تو اس علم کے تحت روح کے بارے میں بحث ہوتی تھی۔ اس طرح بھی ہم اُس زمانے میں پہنچ جاتے ہیں جب انسان نے ترقی نہیں کی تھی اور غاروں میں زندگی گزارتا تھا، کیونکہ اُس زمانے میں بھی روح کا تصور پایا جاتا تھا اور یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ انسان کے سب اعمال اس کے اندر پوشیدہ ایک غیبی طاقت کے اشاروں پر انجام دیے جاتے ہیں۔ مختلف تہذیبوں کی تاریخ مرتب کرنے والے مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی زمانہ کے قبائلوں پر کی گئی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ پتھر کے زمانے کے لوگوں میں بھی روح کا ایک تصور تھا اور وہ یہ مانتے تھے کہ انسان کی موت کے بعد اس کا جسم دُنیا میں رہ جاتا ہے اور اس کی روح عالم بالا میں چلی جاتی ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں بدروحوں اور بلاؤں کا بھی تصور پایا جاتا ہے۔ چونکہ اس موضوع پر پہلے فلسفہ کے تحت اور بعد میں نفسیات کے تحت بحث ہونے لگی، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات کی



ابتداء اُسی وقت ہو گئی تھی جب انسان نے روح کے بارے میں سوچنا شروع کیا، لیکن اس کی شکل ایک منظم علم کی نہیں تھی۔

اس علم کو ایک منظم علم کی شکل میں آنے کے لیے کئی صدیاں گزر گئیں اور جب یہ علم کی صورت میں پہچانا جانے لگا تو بھی اس کو جدید شکل میں آنے کے لئے کئی دہائیاں لگ گئیں اور اس دوران آہستہ آہستہ ترقی کی مسلسل طے کرتا ہوا آج یہ علم ایک مکمل ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ اب ہم اس کی موجودہ شکل میں آنے سے پہلے کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم بھی دوسرے کلاسیکی علوم کی طرح یونان میں پیدا ہوا اور اس زمانہ میں فلسفہ کے ایک موضوع کی حیثیت سے اس پر بحث ہوتی تھی جو روح کے وجود اور اس سے متعلق مسائل تک محدود تھی۔

یونانی زبان کی ترقی کے ساتھ اس زبان میں علم و ادب، تواریخ، ریاضی، فلسفہ و حکمت پر لکھنا شروع ہوا۔ تقریباً ایک صدی کے بعد بقراط نے حکمیات پر بہت کچھ لکھا اور علم طب کے تعلق سے اس کی خدمات کو آج بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بقراط کے بعد افلاطون (۳۴۷-۳۲۷ ق۔م) نے اس کے کام کو آگے بڑھایا۔

اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو نفسیات کے شعبہ کو اہمیت دینے میں ارسطو کا نام بطور خاص لیا جاتا ہے، جس کا دور ۳۸۴ قبل مسیح سے ۳۲۲ ق۔م تک ہے۔ اس زمانے میں جذبات، ہیجان، احساسات اور ادراک کا ذکر ملتا ہے اور اُسی زمانے سے انسانی شعور اور ذہنی اعمال پر بھی بحث کا آغاز ہو چکا تھا اور ابتداء میں روح کا علم کہلایا جانے والا یہ علم ذہن کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

یونانی تہذیب کا زوال چوتھی صدی عیسوی سے شروع ہوا اور ایک ایسا دور بھی آیا جب یونانی تہذیب میں پنپنے والے علوم کا ذکر بھی غائب ہو گیا۔ علمی لحاظ سے اس کو تاریخ کا تاریک دور کہا جاتا ہے اور یہ ۵ ویں صدی سے شروع ہو کر ۱۱ ویں صدی تک جاری رہا۔ جبکہ کچھ مورخین اس کو ۱۴ ویں صدی تک لے جاتے ہیں اور ان کے مطابق ۱۴ ویں صدی کے بعد ہی قدیم علوم کو پھر زندہ کرنے کا کام شروع ہوا اور اس



طرح یونانی علوم کا پھر سے احیا ہوا۔ کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ اسی زمانہ میں انگریزی لفظ Psychology کے مفہوم میں تبدیلی آئی اور یہ لفظ انسانی ذہن کے مطالعہ کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس لئے ہم بھی یہی مان کر چلتے ہیں کہ نفسیات کی تاریخ صحیح معنوں میں عہد وسطیٰ کے بعد شروع ہوئی۔ حالانکہ اس زمانہ میں بھی اس کو فلسفہ کا ایک شعبہ ہی تصور کیا جاتا تھا اور جو لوگ فلسفہ پڑھتے تھے، انہیں اس علم کی معلومات بھی حاصل کرنی ہوتی تھیں۔

نفسیات کی ارتقائی منازل پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ۶۰۰ سال قبل مسیح سے ہو جاتی ہے جب Thales نے اپنے مفروضات کتابی شکل میں پیش کیے۔ حالانکہ اس کا موضوع علم ریاضی سے متعلق تھا اور نفسیات کا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اس نے فطرت کے کچھ رازوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی اور کائنات کو موضوع بنا کر اپنا فلسفہ پیش کیا۔ اسی دور میں فیثاغورث کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس نے بھی علمیات میں ایک اہم مقام حاصل کیا اور علم ریاضی، خاص طور پر علم ہندسہ میں اس کے مسئلہ کا استعمال آج بھی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۴۷۰ سے ۳۹۹ تک سقراط کا دور تھا، جس نے فلسفہ میں خاص طور پر اہم خدمات انجام دیں، جس کی وجہ سے نفسیات بھی بالواسطہ متاثر ہوئی۔ اس کے بعد ڈیموکرٹس کا ذکر آتا ہے جو ۴۶۰ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۳۷۰ ق۔م میں انتقال کر گیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ دلیل پیش کی کہ کائنات کی تشکیل Atoms سے ہوئی ہے۔ پھر بقراط کا ذکر آتا ہے جو ۴۶۰ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۳۸۰ ق۔م میں انتقال کر گیا۔ دراصل نفسیات کی تاریخ بقراط سے ہی شروع ہو جاتی ہے کیونکہ بقراط نے علم طب میں بہت اہم کام کئے اور ساتھ ہی عضویات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس نے جب مختلف امراض کی تفصیل بیان کی تو پہلی مرتبہ دماغی امراض کو جسمانی امراض سے الگ رکھ کر سوچا اور یہ دلیل پیش کی کہ دماغی امراض کے اسباب انسان کے جسم میں نہیں بلکہ اس کے ذہن میں ہوتے ہیں اور اسی نظریہ پر غیر طبعی نفسیات کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بعد افلاطون کا ذکر



آتا ہے جو ۳۲۷ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۳۴۷ ق۔م میں انتقال کر گیا۔ یونانی تہذیب میں اور علمیات میں اس کا سب سے اہم کام اکاڈمی کی بنیاد ہے۔ یہ ایک اسکول تھا جو ایک باغیچے میں قائم کیا گیا تھا اور اس باغیچے کے نام کی مناسبت سے اس کو اکاڈمی کا نام دیا گیا۔ اس اسکول میں پہلی بار منظم طریقہ پر مختلف علوم کی تعلیم کا انتظام تھا اور اسی اسکول کی وجہ سے دنیا میں یونانی فلسفہ بھی متعارف ہوا۔

افلاطون کا ایک خاص شاگرد ارسطو، جو ۳۸۴ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۳۲۲ ق۔م میں انتقال کر گیا، دراصل نفسیات کے تعلق سے اس کا نام ہی سب سے پہلے لیا جاتا ہے، کیونکہ اس نے فلسفہ کے اس موضوع پر خاص دھیان دیا اور صحیح معنوں میں اس کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ اس کے بعد تاریک دور شروع ہو جاتا ہے اور نفسیات پر کسی اہم کام کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ابی سینا کا ذکر ملتا ہے، جس نے علم الامراض پر کافی توجہ دی اور اسی کے تحت دماغ کے وظائف طے کئے۔ اس نے دماغ کے افعال کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا اور ان ہی بنیادوں پر بعد میں حواس اور ادراک کا خیال پیش کیا گیا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ابی سینا نے بھی نفسیات کی خدمت کی۔ پھر ارسطو کے زمانہ کے تقریباً ۱۸۰۰ سال بعد فرانس بیکن کا نام سنائی دیتا ہے جس نے فلسفے اور نفسیات میں اہم خدمات انجام دیں۔

نفسیات کے مطالعہ کے دوران یہ محسوس کیا گیا کہ ۱۹ ویں صدی میں ایسے بہت سے دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے فلسفہ کو اپنا موضوع بنایا اور ساتھ ہی نفسیات پر بھی کام کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دنیا کی بہت سی جامعات میں نفسیات کے الگ شعبے قائم کیے گئے اور نئے نئے مکاتب فکر وجود میں آئے۔ حالانکہ ۱۹ ویں صدی سے پہلے بھی ڈیکارٹ، جان لاک، لائبنز، برکلی، ڈیوڈ ہیوم اور ایمونل کانٹ نے نفسیات میں اہم کام کیے اور ان مفکرین کی کوششوں سے ہی فلسفہ میں نفسیات کے شعبہ کو قابل توجہ تسلیم کیا جانے لگا اور آنے والے مفکرین نے اس شعبہ کی جانب توجہ کی۔ حالانکہ یہ چند نام ساڑھے تین سو سال کے دوران آتے ہیں، لیکن ۱۹ ویں صدی میں نفسیات سے دلچسپی



رکھنے والوں کا ایک سیلاب سا اُٹھ آیا۔ نہ جانے کیوں بے شمار دانشور اس شعبہ کی جانب متوجہ ہوئے اور انہوں نے نئے نئے نظریات پیش کیے، نئے اصول وضع کیے، نفسیات کے مطالعے کا ڈھنگ بدلا اور یہ ایک آزاد علم کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ مختلف کتابوں میں اس دور کے مفکرین کے جو نام ملتے ہیں، اُن کی تعداد تقریباً بارہ سو تک پہنچتی ہے جن کی وجہ سے نفسیات کی ارتقائی منازل تیزی سے آگے بڑھیں اور نفسیات کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

راقم الحروف نے سوچا کہ ۱۹ ویں صدی میں جو دانشور پیدا ہوئے اور ۲۰ ویں صدی کے نصف حصہ تک خاص کر جنہوں نے نفسیات کی خدمات انجام دیں، اُن میں سے چند ہی دانشور ایسے ہیں جن کے تذکرے اُردو میں مل جاتے ہیں۔ جیسے فرائڈ، ولیم جیمس اور ٹرونگ وغیرہ۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی ایسی اہم شخصیات ہیں جنہوں نے نفسیات کو عروج پر پہنچانے میں اہم خدمات انجام دی ہیں، لیکن اُن کی زندگی کے حالات اور نفسیات کے لیے ان کی خدمات کے تذکرے نہیں ملتے۔ اس لیے ایک خیال یہ آیا کہ کیوں نہ ایسے دانشوروں کے حالات زندگی اور ان کے کام کی تلاش کی جائے جنہوں نے نفسیات کو موجودہ علم کی شکل میں لانے کے لیے کوششیں کیں اور اُردو داں طبقہ کو اُن کے حالات زندگی سے واقف کرایا جائے۔ کوئی ۳۰ برس پہلے بھی احقر نے ایک ایسی ہی کوشش کی تھی، جس کے تحت فرائڈ اور اُس کے ہم عصر دانشوروں کے حالات زندگی جمع کیے اور اُن کی خدمات سے متعلق چند مضامین مرتب کیے۔ لیکن افسوس کہ یہ مضامین اور بہت سی کتابیں ایک حادثے میں ضائع ہو گئیں، جس کی وجہ سے ہمت پست ہو گئی۔ لیکن اب پھر ایک نئی توانائی کے ساتھ یہ منصوبہ بنایا اور اس پر عمل شروع کیا۔

بظاہر یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ اُردو میں تو ان سب کے حالات ملنا مشکل تھے۔ مقامی لائبریریز میں انگریزی میں بھی کوئی ایسی کتاب نہیں مل سکی۔ انصافی کتابوں میں جب مختلف مکاتب فکر کا ذکر آتا ہے تو اُن مفکرین کا ذکر بھی ہوتا ہے



جنہوں نے ان مکاتب فکر کی بنیاد ڈالی اور ان کو ترقی دینے کی کوشش کی، لیکن وہ بہت ہی مختصر ذکر ہوتا ہے۔

ان سب مشکلات کو نظر میں رکھ کر ابتدا میں صرف پندرہ ماہرین نفسیات کی فہرست تیار کی اور ان کے حالات زندگی اور نفسیات کے لیے ان کے کام کی تلاش شروع کی۔ امریکن لائبریری اور برٹش کاؤنسل کی لائبریری میں بھی ان سب مفکرین کے حالات زندگی نہ مل سکے۔ اتفاق کی بات ہے کہ انٹرنیٹ پر جب علمی انسائیکلو پیڈیا کی سائٹ تلاش کی تو ایک خزانہ ہاتھ لگ گیا۔ اس خزانہ کو دیکھ کر فہرست میں اضافہ کیا اور یہ تعداد پندرہ سے بڑھا کر بیس تک کر دی۔ جب بیس دانشوروں کے حالات زندگی اور ان کے اپنے اپنے مکاتب فکر میں خدمات کی معلومات جمع ہو گئیں، تب بھی تلاش جاری رکھی اور آہستہ آہستہ اور بہت سے ماہرین کے حالات سامنے آئے تو فہرست میں اضافہ کیا اور اعداد ۲۵ تک پہنچا دی۔ اس مجموعہ میں صرف ان مفکرین کے تذکرے شامل ہیں، جن کی زندگی کے حالات اور شخصیت کے بارے میں بہتر مواد حاصل ہو سکا ہے۔

چونکہ یہ معلومات زیادہ تر انٹرنیٹ سے حاصل کی ہیں، اس لیے ان سب کا حوالہ دینا تو ممکن نہیں تھا، لیکن یہ اعتراف ضروری ہے کہ ان مضامین میں جو معلومات دی گئی ہیں، ان کے ذرائع انٹرنیٹ پر موجود مختلف سائٹس ہیں، ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں، ان میں کوئی بھی مضمون براہ راست کسی دوسری زبان میں لکھے گئے کسی مضمون کا ترجمہ نہیں ہے۔

میرا یہ دعویٰ تو نہیں لیکن خیال ہے کہ یہ کتاب بھی نفسیات کے تعلق سے اردو میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے، جس میں اتنی بڑی تعداد میں ماہرین نفسیات کے حالات زندگی اور نفسیات کے لیے ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ کتاب نفسیات کے ان طلباء کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے، جن کی مادری زبان اردو ہے اور جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے نفسیات کا مضمون لیا ہے۔

فلسفہ میرا مضمون نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے، لیکن چونکہ



نفسیات پہلے فلسفہ کے ایک شعبہ کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے نفسیات کے مطالعہ کے وقت جن قدیم ماہرینِ نفسیات کا ذکر آتا ہے، اُن کے بارے میں اگر تفصیل سے معلومات حاصل کی جائیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند کو چھوڑ کر وہ تمام ماہرین پہلے فلسفی تھے اور پھر ماہرِ نفسیات بنے۔ ماہرینِ نفسیات کے سرسری طور پر تذکرہ سے تشفی نہیں ہوتی، اس لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ گہرائی تک جا کر اُن کی شخصیت اور اُن کے کام کا مطالعہ کیا جائے اور اس خواہش نے مجھے فلسفہ سے روشناس کرایا۔ میں نے جب ان تمام مفکرین کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا تو خود بخود فلسفہ سے منسلک ہوتا چلا گیا۔

عام طور سے دوسری زبانوں میں دیے جانے والے ناموں کے اردو تلفظ میں غلطی ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے ویسٹر انسائیکلو پیڈیا کا سہارا لیا اور اس میں جو تلفظ دیا ہے، اُسی کو بنیاد بنا کر ان ماہرین کے نام دیے ہیں۔ لیکن اس انسائیکلو پیڈیا میں بہت سے مشاہیر کا تلفظ دیا ہی نہیں گیا۔ اس لیے اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ ان ناموں کے لیے انگریزی حروف تہجی کی مناسبت سے جو تلفظ بنتا ہے، وہی صحیح سمجھا جائے۔ مثال کے طور پر Horney کا تلفظ 'Horn'eye' دیا گیا ہے۔ لیکن Titchener کا تلفظ نہیں دیا گیا۔ اس لئے اس کو ٹچینر ہی لکھا گیا ہے۔ اگر کہیں غلطی ہوگئی ہو اور کوئی قاری اس سلسلہ میں رہنمائی کرتا ہے تو احقر ممنون ہوگا۔

اس سلسلہ کے کچھ مضامین رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین نثار احمد فاروقی صاحب (مرحوم) کو بہت پسند آئے۔ جب امر وہہ میں اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے نہ صرف ان مضامین کی تعریف کی بلکہ نفسیات کے سلسلہ میں خاکسار کی کوششوں کو بھی سراہا۔ میں نے جب ان سے کہا کہ دُنیا کے مشہور ماہرینِ نفسیات کے نظریات، ان کی نفسیات کے لیے خدمات اور حالاتِ زندگی یکجا کر کے ایک کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ہے، تو انہوں نے اس خیال کو بہت سراہا اور ہمت افزائی کی۔ افسوس..... زندگی نے ان سے وفا نہیں کی اور اس کتاب کے مکمل ہونے سے پہلے ہی مختصر عرصہ اسپتال میں رہنے کے بعد وہ دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ لیکن ان سے



ملاقات کے بعد جو توانائی مجھے حاصل ہوئی اور میرے حوصلہ کو تقویت ملی، اس نے میری راہیں آسان کر دیں۔

پروفیسر جناب شمیم حنفی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک عظیم دانشور ہیں اور اردو ادب میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ جناب انیس امر وہوی کے توسط سے انہوں نے میری گزشتہ تینوں تخلیقات پڑھیں اور پسند فرمائیں۔ اس کتاب کا مسودہ بھی ان کو دکھایا گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں، تاکہ اس تحریر کو کتاب میں شامل کیا جائے۔ میں ان کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مصروفیت کے باوجود میری اس درخواست کو قبول فرمایا اور اپنے خیالات اور تاثرات قلمبند کیے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

جہاں تک جناب انیس امر وہوی صاحب کا تعلق ہے، تو وہ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں اور میری کتابوں کو شائع کرنے میں بے حد دلچسپی دکھاتے ہیں، اور اتنا ہی نہیں بلکہ مسودہ کو دیکھنے اور اغلاط کی پروف ریڈینگ جیسے مشکل کام کی ذمہ داری بھی خود ہی سنبھال لیتے ہیں اور اس کام میں ان کی بیگم محترمہ ڈاکٹر غیر جہاں بھی شریک ہوتی ہیں۔ ان کے فرزند مسعود التمش بھی بڑی محنت سے کتاب کی ظاہری خوبصورتی اور ٹائٹل کی تشکیل میں مصروف رہتے ہیں۔ میں ان سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ کتاب کا مسودہ میں نے لکھا ہے اور اس کو کتاب کی شکل میں پیش کرنے کا کام پوری طرح جناب انیس امر وہوی اور ان کے اہل خانہ نے کیا ہے۔

اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی ہے۔ آپ کی رائے میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔



— سید اقبال امر وہوی



# تعارف

اس کتاب سے پہلے مجھے سید اقبال امروہوی صاحب کی تین کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ کتابیں ”جدید نفسیات“، ”روزمرہ کی نفسیات“ اور ”اصطلاحات نفسیات“ کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ نفسیات کے طلباء تو خیر ان سے استفادہ کرتے ہی ہیں، لیکن اپنے اسلوب، زبان و بیان اور مواد کے اعتبار سے یہ کتابیں اس لائق ہیں کہ علم النفس سے بالواسطہ اور غیر پیشہ ورانہ شغف رکھنے والے بھی انہیں اپنے مطالعہ کا حصہ بنائیں۔ اس سلسلے میں بنیادی اور عمومی معلومات کی حصولیابی کے لئے یہ کتابیں بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ ان کتابوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے رواں دواں اسلوب اور شگفتہ و سہل زبان کے باعث ان کے مطالب تک رسائی عام قارئین کے لئے بھی مشکل نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب ”نفسیات کے معیار“ اسی سلسلے کی چوتھی کڑی کہی جاسکتی ہے۔ سید اقبال امروہوی صاحب نے اس کتاب میں نفسیات سے متعلق پچیس (۲۵) شخصیات کو متعارف کرایا ہے۔ انہوں نے تفصیلات کے بیان میں پیچیدہ مباحث سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور خالص تصوراتی (Conceptual) مسئلوں پر بھی بڑی سہولت کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔ ان کی زبان کہیں بھی ادق اور بوجھل نہیں ہوتی۔ اصطلاحات کا استعمال وہ حسب ضرورت کرتے ہیں، لیکن اس طرح کہ عام قاری کے لئے بھی انہیں سمجھنا دشوار نہ ہو۔

اردو نثر کی علمی روایت خاصی ثروت مند اور متنوع رہی ہے۔ اس روایت کی تعمیر کا



روشن ترین دور انیسویں صدی تھی۔ سائنسی علوم، سماجی علوم، مذہبیات، تصوف، انسانی علوم میں بالخصوص فلسفہ اور فنون لطیفہ پر علمی انداز سے بحث کرنا اور اردو زبان کو فکری اعتبار سے بھی مالا مال کرتے رہنا بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ایک عام بات تھی۔ مشرق و مغرب کی متعدد ترقی یافتہ زبانوں سے اردو میں ترجمے کی شاندار روایت اسی سرگرمی کا حصہ ہے۔ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، انگریزی، جرمن، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، روسی، یہاں تک کہ نسبتاً کم معروف زبانوں کے علمی سرمایے اور تخلیقی ادب سے اردو میں بہت اچھے ترجمے کئے گئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کی خدمات اس ضمن میں بہت غیر معمولی اور شاندار رہی ہیں۔ نظام تعلیم، علمی ماحول اور معاشرتی فضا میں تبدیلی کے باعث یہ روایت ہمارے عہد میں پہلے جیسی مستحکم تو نہیں رہی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ کسی نہ کسی سطح پر ابھی باقی ہے۔ سید اقبال امروہوی صاحب کے اس مسودے کو بھی میں نے اسی زاویہ نظر سے دیکھا ہے..... اور جیسے جیسے میں اس کتاب کو پڑھتا گیا، اس کی افادیت مجھ پر روشن ہوتی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم اختیار کرنے والے طلباء کے ساتھ ساتھ اردو کے عام قاری بھی، جو نفسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس کتاب کے مطالعے سے فائدہ اٹھائیں گے اور علمی حلقوں میں سید اقبال امروہوی صاحب کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

○○

— شمیم حنفی

نئی دہلی۔

۲۰/ اکتوبر ۲۰۱۰ عیسوی



# بقراط

Hippocrates ( 460- 370 BC )

دُنیا میں جتنی قدیم تہذیبوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں سب سے زیادہ شہرت یونانی تہذیب کو ملی اور اس قدیم تہذیب کے نقوش آج بھی مختلف علوم کی صورت میں باقی ہیں۔ کیونکہ تقریباً تین ہزار سال پہلے جن علوم کی بنیادیں ڈالی گئیں، وہ آج پروان چڑھ چکے ہیں اور دن بہ دن ترقی کی جانب گامزن ہیں، اور آج بھی جب ان ترقی یافتہ علوم کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اس کی ابتدا یونان سے ہی ہوتی ہے اور ان دانشوروں کا تذکرہ ضرور کیا جاتا ہے جن کی کوششوں سے ان علوم کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ مثال کے طور پر میڈیکل سائنس آج کتنی ہی ترقی کر جائے، لیکن یہ فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی بنیاد ڈھائی ہزار سال سے بھی پہلے یونان میں پڑ چکی تھی اور اسی بنیاد پر علاج معالجہ سے متعلق مختلف علوم کی عمارت کھڑی ہے۔

جب سے دُنیا وجود میں آئی، یا یوں کہنا چاہیے کہ جب سے نوع انسانی کا وجود ہوا، اس کی صحت کا مسئلہ اس سے جڑ گیا۔ انسان پیدا ہوتا ہے تو اسے کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی مرض لاحق ہوتا ہے اور وہ اس کو دُور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور یہ سلسلہ ایسا ہے جس کی ابتدا کا کوئی زمانہ طے نہیں کیا جاسکتا۔ لاکھوں سال پہلے بھی انسان بیمار ہوتے تھے اور ان کا علاج بھی ہوتا ہوگا، چاہے وہ کسی بھی طریقہ سے ہو۔ ہم یہ سوچ کر چلیں کہ ابتدائی زمانہ بھی بیماریوں کا علاج مقامی جڑی بوٹیوں سے کیا جاتا ہوگا اور ہر



علاقہ میں ہر مرض کا طریقہ بھی الگ ہوگا اور مختلف امراض کا علاج ہر علاقہ میں ایسے طریقوں سے کیا جاتا ہوگا جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہے ہوں گے۔ اس لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ علاج کا یہ طریقہ ایک منظم علم کی شکل میں کافی طویل عرصہ بعد وجود میں آیا ہوگا جس کے لئے نہ جانے کتنی صدیاں لگی ہوں گی۔

دنیا کی مختلف قدیم تہذیبوں کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ تقریباً چار ہزار سال پہلے ہی علاج معالجہ سے متعلق ایک منظم علم کا وجود ہو چکا تھا اور مختلف تہذیبوں میں مختلف طرز سے انسانوں کے دکھ دور کئے جاتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہزاروں سال پہلے آیوروید کا وجود ہو چکا تھا۔ اسی طرح چین میں بھی ایک طریقہ علاج رائج تھا اور یونان میں بھی علم طب پروان چڑھ رہا تھا، جو آج بھی اپنی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ کسی علاقہ میں یہ میڈیکل سائنس کی شکل میں ایلوپیٹھی کہلایا جاتا ہے تو کسی علاقہ میں یہ یونانی طریقہ علاج کہا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں کی جڑیں بہر حال یونان میں ہی ہیں۔

اس کتاب میں ان دانشوروں کے تذکرے شامل ہیں جنہوں نے نفسیات کی ترقی اور فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور ان دانشوروں کی فہرست میں سب سے پہلے یونانی تہذیب سے تعلق رکھنے والے عظیم مفکر اور حکیم بقراط کا نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق براہ راست نفسیات سے نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے علم الامراض، حیاتیات اور تشخیص و معالجہ میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ یہ اس کا ایسا کام ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس طرح اس نے بالواسطہ نفسیات کو بھی مستفید کیا ہے۔ اس نے خاص طور پر دماغی بیماریوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ایسی بیماریوں کو جسمانی امراض سے الگ رکھ کر سوچا ہے۔ اس کی وجہ سے نفسیات کا ایک اہم شعبہ ”غیرطبعی نفسیات“ کی شکل میں وجود میں آیا۔ اس سلسلہ میں بقراط کی تحقیقات کی وجہ سے ہی ہم دماغی امراض (جو بعد میں نفسیاتی امراض کہلائے جانے لگے) کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔



حالانکہ بقراط کی زندگی میں نفسیات کوئی علیحدہ علم نہیں تھا، لیکن فلسفہ کے تحت اس علم کے بعض موضوعات پر بحث ہوتی تھی اور یہ بحث عام طور پر روح کے تعلق سے ہوتی تھی۔ لیکن بقراط نے پہلی بار یہ خیال ظاہر کیا کہ دماغی امراض کی جڑیں ہمارے جسم میں نہیں بلکہ ہمارے دماغ میں ہوتی ہیں۔ یہاں لفظ دماغ سے اس کا مطلب ظاہر ہے جسم سے باہر کسی عضو سے نہیں بلکہ ذہن سے تھا۔ اس لئے اگر نفسیات کی قدم بہ قدم ترقی کا ذکر کرتے ہیں تو اس عظیم فلسفی اور طبیب کی ان خدمات کو خاص طور پر فراموش نہیں کیا جاسکتا جن کی وجہ سے دماغی امراض کو سمجھنے اور ان کے علاج میں آسانی ہو گئی اور دماغی مریضوں کو کسی حد تک جسمانی اذیتوں سے بھی چھٹکارا مل گیا۔

تعب کی بات ہے کہ بقراط کی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ تواریخ میں اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک معلم تھا اور اس نے یونان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا تھا۔ وہ کس سال میں پیدا ہوا، اس بارے میں اختلاف ہے۔ کہیں اس کا سال پیدائش ۴۶۰ قبل مسیح دیا ہوا ہے تو کہیں ۴۷۰ قبل مسیح درج ہے۔ وپسٹر انسائیکلو پیڈیا نے اس کی پیدائش کا سال ۴۲۰ رق۔ م لکھا ہے۔ اتنا ہی نہیں، اس کی وفات کے بارے میں بھی مورخین متفق نہیں۔ ایک جگہ اس کی وفات کا سال ۳۷۲ رق۔ م دیا گیا ہے، جبکہ ایک انسائیکلو پیڈیا میں ۳۷۰ رق۔ م اور ایک کتاب میں ۳۷۷ رق۔ م درج ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یونانی زبان نے کافی ترقی کر لی تھی اور یونانی ادب کی تخلیق بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ افلاطون کی درس گاہ قائم ہو چکی تھی اور وہاں منظم طریقہ پر تعلیم کا انتظام تھا۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو کے مکمل حالات دستیاب ہیں جو ۳۸۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن یہ بات ابھی بھی راز میں ہے کہ بقراط کی ذاتی زندگی کے بارے میں کسی کو زیادہ نہیں معلوم جبکہ اس کے نظریات ابھی تک زندہ ہیں۔

بقراط کی زندگی نے قدیم یونانی تہذیب کے کئی موضوعات کو متاثر کیا ہے کیونکہ یہ اپنے زمانہ کے ان چند یونانی فلسفیوں میں تھا جن کی تخلیقات کا ریکارڈ کسی حد تک



دستیاب ہے۔ اس لئے اس کی خدمات کا اعتراف آج بھی کیا جاتا ہے، خواہ وہ علم طب کے تعلق سے ہو یا فلسفہ سے۔ اس سلسلہ میں Corpus Hippocraticum نام کی کتاب کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں معلومات کا خزانہ ہے اور اپنے دور میں یہ ایک مذہبی صحیفہ کی طرح متبرک تسلیم کی جاتی تھی۔ حالانکہ یہ کتاب بقراط کے نام سے منسوب ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں اس زمانے کے مشہور مفکرین کے خیالات بھی شامل ہیں۔ بلکہ کچھ مفکرین اور یونانی تاریخ کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس کتاب میں جو مضامین شامل کئے گئے ہیں وہ اس دور کے مشہور اور قابل قدر دانشوروں نے تصنیف کئے تھے اور بقراط کی عظمت کو تسلیم کرنے کے لئے یا اس زمانہ کے رواج کے مطابق اس عظیم مجموعہ کے ساتھ بقراط کا نام جوڑ دیا گیا۔ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ.....

”اس زمانہ کے دستور کے مطابق اس کتاب کا یہ نام Hippocrates

لفظ کے لغوی معنی کی وجہ سے رکھا گیا ہے اور اس کتاب کے نام کا تعلق

بقراط سے صرف نام میں مماثلت سے زیادہ کچھ نہیں۔“

بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاتا کہ یہ

کتاب تقریباً ڈھائی ہزار سال سے Biomedical شعبہ کے طلباء کی رہنمائی کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں جو طریقہ کار اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے، وہ کسی حد تک آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کتاب میں زنانہ امراض کے بارے میں ایک باب ہے جس میں دوران حمل خواتین کو ہونے والی تکالیف کا ذکر ہے اور اس دوران کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے، یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے جدید زمانے کی Gynaecology کی ابتدا بقراط نے ہی کر دی تھی اور بقراط نے ہی یہ ضروری سمجھا کہ اس سلسلہ میں خاص طور پر معالجین کو خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح دماغی امراض، جسم کے مختلف حصوں پر زخم ہونے کی صورت میں ان کا علاج، مرگی کی وجوہات اور اس کا علاج، انسانی عضویات کی تشریح اور علم الابدان وغیرہ ایسے موضوع



ہیں جن پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بقراط نے پہلی بار بچوں کی مرگی اور بڑوں کی مرگی میں ایک نمایاں فرق قائم کیا۔

بقراط نے بے شمار مریضوں کے مکمل حالات کا ریکارڈ رکھا اور اس ریکارڈ کی بنیاد پر اس نے امراض کی علامات اور اسباب پر تفصیل سے تحقیقات کیں۔ اس طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بیماریوں کے ریکارڈ رکھنے سے اور اس ریکارڈ کی بنیاد پر امراض کے بارے میں تحقیقات کا سلسلہ بھی بقراط ہی نے شروع کیا۔

اس نے وبائی امراض کو عام امراض سے الگ کیا اور جب کوئی مرض وبا کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس صورت میں کیا احتیاط برتنا چاہئے، یہ بھی واضح کر دیا۔ اس نے لکھا کہ.....

”جب کوئی مرض وبا کی صورت اختیار کر لے تو یہ ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں، مریضوں کو چھوڑ کر بھاگنے کے بجائے اس کے علاج کی کوشش کریں، بیماری کو پھیلنے سے روکنے کے لئے معالجین کے مشوروں پر عمل کریں۔ تیماردار کو چاہئے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے حفظ ماتقدم کے اصولوں کی پابندی کرے۔“

اس نے یہ بھی لکھا کہ معالجہ ایک ایسا فن ہے جس میں تین عناصر ملوث ہوتے ہیں..... مرض، مریض اور معالج۔ معالج اس فن کا غلام ہے، مریض کو چاہئے کہ وہ معالج سے تعاون کرے تاکہ مرض کا قلع قمع کیا جاسکے۔

اس نے معالجہ کے بارے میں ایک نفسیاتی نقطہ بھی بیان کیا ہے کہ مریض کو معالج سے اپنے مرض کے بارے میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہئے اور تمام معلومات تفصیل سے فراہم کرنا چاہئے، کیونکہ یہ معلومات مرض کی تہہ تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اور ساتھ ہی معالج اور مریض کے درمیان ایک ہمدردانہ رشتہ قائم کر دیتی ہیں۔ مریض جب تک اپنے معالج کو اپنا ہمدرد نہ سمجھے اور اس پر اعتماد نہ کرے، مرض کا تدارک ممکن نہیں۔ بقراط کا یہ قول آج بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے



جتنا اُس کے زمانے میں رکھتا ہوگا۔

بقراط نے انسانی جسم میں چار عناصر کے توازن کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کے خیال میں اگر ان عناصر کا توازن بگڑ جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ پہلے اس نے صفرا اور بلغم کو زیادہ اہمیت دی تھی پھر بعد کے ابواب میں اس نے خون اور سوداویت کا بھی اضافہ کر دیا۔ اس نے لکھا کہ ان چاروں خلطوں کی کمی یا زیادتی پر ہی انسان کی صحت کا دارومدار ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا کہ ان اخلاط کی کمی یا زیادتی پر انسان کے مزاج کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان چاروں عناصر کو اس نے انسان کے جسم تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ایک جگہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ چار عناصر کی حکومت ہے۔ مثال کے طور پر چار موسم، چار حقائق (یعنی زمین، ہوا، پانی اور آگ) یا کسی عنصر کی چار خصوصیات، سرد، گرم، تر یا خشک، انسان کی عمر کے چار مراحل اور اس کے مزاج کی چار خصوصیات۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بقراط نے انسانی جسم کے اندر پیدا ہونے والے امراض کے بارے میں ایسی بنیادی معلومات فراہم کی ہیں جو بعد میں آنے والے معالجین اور محققین کے لئے روشن راہیں فراہم کرتی ہیں اور دُنیا کے مختلف طریقہ ہائے علاج آج بھی ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہاں اس بحث کو محدود کرتے ہوئے صرف ذہنی بیماریوں کے بارے میں بحث کریں گے جو براہِ راست نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں۔

پوری دُنیا کی طرح یونان میں بھی ذہنی بیماریوں کے بارے میں یہی نظریہ تھا کہ یہ کسی بدروح کی کارستانی ہوتی ہے اور جب کسی دوسرے فرد کی روح جسم میں داخل ہو جاتی ہے تو وہ اپنی من مانی کرواتی ہے اور انسان اپنے قابو میں نہیں رہتا بلکہ وہ بدروح کے اشاروں پر کام کرتا ہے۔ اس لئے ایسے مریضوں کو ایسے لوگوں کے پاس لے جایا جاتا تھا جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ بھوت پریت اور خراب روحوں کو وہ بھگانے میں ماہر ہیں۔ وہ لوگ مریض کو اتنی سخت ایذا نہیں دیتے تھے کہ روح کانپ جاتی تھی۔ اس زمانے میں یونان میں بھی یہی خیال تھا۔ لیکن بقراط نے پہلی مرتبہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس نے کہا کہ یہ مریض ذہنی بیماریوں کا شکار ہیں اور ان پر اس طرح سختی کرنا



انسانیت کے خلاف ہے۔ بقراط محض اس کے خلاف آواز اٹھا کر اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوا بلکہ اس نے اس بارے میں بہت ہی اہم نظریہ پیش کیا کہ ان امراض کی وجوہات مریض کے خیالات میں یا اس کے ماضی میں ہوتی ہیں، نہ کہ اس کے جسم میں۔ اس کے خیال کو اس وقت اہمیت نہ دی گئی ہو کیونکہ اس کے بعد بھی کئی صدیاں گزر گئیں اور ان مریضوں کی تکالیف میں کمی نہیں آئی اور ایسے مریض کبھی جادوگروں کے قبضے میں چلے جاتے۔ کبھی بھوت پریت اُتارنے والوں کے جو اُن پر ناقابل برداشت ظلم ڈھاتے اور اس طرح ان کی بیماری کا سبب بننے والی بدروح کو بھگانے کی کوشش کرتے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے اس زمانہ میں اس نے ذہنی امراض میں مبتلا افراد سے گفتگو کر کے ان کے دل کے حالات جاننے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں تحقیقات کے بعد اس نے دماغ کی اہمیت میں اضافہ کیا اور یہ بتایا کہ ہماری سوچ اور ہماری حرکات دماغ کے تابع ہیں۔ اس نے دماغ کو تمام ذہنی افعال کا مرکز بتایا اور اس نے اس بات پر زور دیا کہ اگر انسان اپنی سوچ اور عمل پر قابو نہیں رکھ پاتا ہے اور ایسی حرکتیں کرنے لگتا ہے جو غیر طبعی سمجھی جاتی ہیں، تو اس کی وجوہات اس کے جسم میں نہیں بلکہ اس کے ذہن میں ہوتی ہیں۔ اور چونکہ ذہن کا مرکز دماغ ہوتا ہے، اس لئے ان کو دماغی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ ایسے مریضوں کو ڈھونگیوں کے حوالے کر کے ان پر ظلم ڈھانا کسی بھی طرح مناسب نہیں بلکہ ایسے مریضوں سے ہمدردی کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور ایسے مریضوں کا علاج بھی اسی طرح کرنا چاہئے جیسے عام مریضوں کا کیا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نشاۃ الثانیہ کے بعد بقراط کے ان نظریات کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور اس سلسلہ میں ایک بار پھر بقراط کے نظریات کو نئی زندگی ملی۔

بقراط نے نہ صرف ذہنی امراض کی اصناف بندی کی بلکہ ان کی علامات کی بنا پر ان کے نام بھی تجویز کئے۔ مثلاً مانیا، مالیخولیا، مریضانہ خوف اور ابطاء ذہنی وغیرہ۔ اس نے ان امراض کی علیحدہ علیحدہ علامات طے کیں اور ان کے اسباب اور علاج پر روشنی



دالی۔ جہاں تک ذہنی امراض کے علاج کی بات ہے، ہم یہ نہیں تسلیم کر سکتے کہ بقراط نے جو طریقے تجویز کئے تھے وہ صحیح تھے یا وہ رائج رہے۔ بقراط نے ہسٹریا کو عضوی بیماری بتایا تھا لیکن جدید تحقیقات سے بقراط کے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ البتہ اس کا یہ خیال کہ ہسٹریا کی وجوہات میں جنسی زندگی کا اہم دخل ہوتا ہے، فرائڈ نے اس سلسلہ میں اپنے نظریہ کی بنیاد بنایا۔ بقراط نے مشورہ دیا تھا کہ اس بیماری میں مبتلا خواتین اگر غیر شادی شدہ ہیں تو ان کی شادی کر دینا چاہئے۔ بقراط کی تحقیقات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ سگمنڈ فرائڈ اور ذہنی امراض کے بہت سے ماہرین نے اس کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے۔

بقراط کے تذکرہ میں اگر ہم اس کے اس حلف نامہ کا ذکر نہ کریں جو اس نے معالجین کے لئے مرتب کیا تھا، تو یہ اس کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ اس نے یہ حلف نامہ اخلاقیات کے تحت مرتب کیا تھا اور اس میں جو نکات شامل کئے ہیں، ان سے کسی حد تک اس زمانے کی اخلاقی اقدار کے بارے میں بھی معلومات ہوتی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی کچھ لوگ مکمل علم حاصل کئے بغیر علاج معالجہ کا پیشہ اختیار کر لیا کرتے تھے۔ اس نے لکھا کہ یہ نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ مذہبی اصولوں کے مخالف بھی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں بھی طب کی تعلیم کا ایک منظم نظام قائم تھا اور وہاں علاج معالجہ سے متعلق ایک نصاب بھی رائج تھا۔ اس حلف نامہ میں پہلا ہی نکتہ یہ تھا کہ حلف لینے والا یہ عہد کرتا ہے کہ.....

”میں اپنے معلم اور اس کے خاندان کے افراد کی عزت کروں گا اور اگر مجھ سے مطالبہ کیا گیا تو میں اپنے معلم کی اولاد کو بلا کسی معاوضہ کے اس علم کی تربیت دوں گا۔“

..... اس حلف نامہ کی ایک قلم یہ بھی تھی کہ.....

”میں کسی شخص کو کبھی زہر نہیں دوں گا، چاہے وہ خود اس کا مطالبہ کرے یا اس کی خواہش کا اظہار کرے۔ میں اس کو اس سلسلہ میں کوئی ایسا مشورہ



بھی نہیں دوں گا جس کی وجہ سے اس کی زندگی کو خطرہ ہو اور اس طرح میں اپنے پیشہ کے تقدس کو نہیں پہنچنے دوں گا۔“

غالباً اس زمانہ میں جراحی کا پیشہ الگ تھا، کیونکہ اس حلف نامہ میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ.....

”میں کسی مریض پر عمل جراحی نہیں کروں گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں اس کو کسی جراح سے رجوع کرنے کا مشورہ دوں گا۔“

اس زمانہ کی اخلاقی حالات کا اندازہ لگانے کے لئے اس حلف نامہ میں ایک اہم نکتہ موجود ہے.....

”میں جب مریض کا معائنہ کروں گا تو مجھ پر اس کی مالی حالت کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میرے لئے ہر مریض برابر ہوگا۔ میں کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جو خلاف اخلاق ہو اور میں کبھی کسی مریض سے جنسی تعلقات کی کوشش نہیں کروں گا، نہ ہی اس سے متعلق جنسی تلافی کا خیال اپنے دل میں لاؤں گا۔“

اس حلف نامہ میں اس قسم کی شمولیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاید اس وقت بھی ایسے واقعات ہوتے ہوں اور بقراط نے یہ ضروری سمجھا ہو کہ ایک معالج سے یہ عہد لے لیا جائے کہ وہ کسی غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب نہ ہو۔ اسی لئے اس کو یہ شرط حلف نامہ میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ معالج کا فرض ہے کہ وہ اپنے مریض کے حالات کبھی کسی دوسرے فرد کے سامنے بیان نہ کرے اور اس کو مریض کے بارے میں جو بھی معلوم ہو وہ اس کو اس صیغہ راز میں رکھنا اپنا ایک مذہبی فریضہ تصور کرے۔

یہ حلف نامہ آج بھی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں کچھ تبدیلیوں کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہر طالب علم کو اس قسم کا عہد لازمی سمجھا جاتا ہے۔



# ارسطو

ARISTOTEL ( 384- 322 BC)

جیسا کہ بقراط کے تذکرہ میں بیان کیا گیا یونان میں علم و ادب کی ترقی کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ علم ادب، تواریخ، ریاضی، فلسفہ و حکمت اور اخلاقیات جیسے شعبوں میں مفکرین نے دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ حالانکہ بقراط کے دور تک آنے میں یونانی تہذیب کو کئی صدیاں لگی تھیں اور اس دوران یونانی زبان نے کافی ترقی کر لی تھی۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اس قدیم دور کی بعض تحریریں آج بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

بقراط کے دور کے بعد افلاطون کا دور شروع ہوتا ہے جو ۴۸۴ ق۔م سے لے کر ۳۲۲ ق۔م تک ہے۔ افلاطون کا سب سے اہم کارنامہ اکادمی (Academy) کا قیام ہے۔ یونانی زبان میں اس کو Academia کہتے تھے۔ یہ اتھینز شہر کے قریب ایک باغ کا نام تھا جہاں افلاطون نے اپنے شاگردوں کو درس دینا شروع کیا اور یہی وہ ادارہ تھا جہاں سے یونانی زبان کو اور یونانی تہذیب کو تقویت پہنچانے والے فلسفی اور دانشور تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ اس کو ”دبستان افلاطون“ بھی کہا جاتا تھا۔ دُنیا میں آج بھی علوم و فنون کے مطالعہ کے مرکز کی حیثیت کے لئے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔

اسی تعلیمی ادارہ سے ایک ایسا شخص بھی منسوب ہے جس کا نام آج بھی یونانی فلسفہ اور یونانی تہذیب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور آج بھی اس کو یونانی فلسفہ کے معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہمارا مطلب یونان کے مشہور دانشور، معلم اور حکیم ارسطو



سے ہے جس کو یونانی زبان میں Aristoteles کہا جاتا تھا۔

ارسطو شمالی یونان میں مقدونیہ کے علاقہ میں ستاگیر یا نام کے شہر میں ۳۸۴ ق۔م میں پیدا ہوا۔ ارسطو کا باپ مقدونیہ کے بادشاہ کے دربار میں ایک معالج کی حیثیت سے معمور تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ ارسطو کے آبا و اجداد بھی اسی حیثیت سے بادشاہ کے دربار سے منسلک تھے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارسطو کا طب سے تعلق موروثی تھا۔ ارسطو نے بھی طب کی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی۔ لیکن ارسطو دس سال کا ہی تھا کہ اس کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں پہلے ہی انتقال کر چکی تھی۔ اس طرح ارسطو صرف دس سال کی عمر میں ہی بے سہارا ہو گیا اور اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس کے چچا کے سر ہو گئی۔

ارسطو نے یونانی ادب میں تعلیم حاصل کی، لیکن وہ ایک معالج کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کرنا چاہتا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس شہر میں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں پاسکتا تو ۱۸ برس کی عمر میں وہ اتھینز چلا گیا اور افلاطون کی اکادمی میں داخل ہو گیا۔

ارسطو نے اپنے استاد افلاطون کو اپنی صلاحیتوں سے بہت متاثر کیا۔ اس لئے وہ افلاطون کا سب سے عزیز شاگرد ہو گیا۔ وہ اس اکادمی میں ۳۷ برس کی عمر تک رہا، اور جب تک افلاطون زندہ رہا، ارسطو نے اس کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ بعض معاملات میں دونوں میں اختلاف رائے بھی ہو جاتا تھا، لیکن اس کی وجہ سے دونوں کے رشتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ افلاطون کا کہنا تھا کہ اس طرح ہم دونوں کو غور و فکر کے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ افلاطون نے ایک جگہ لکھا تھا کہ.....  
”ارسطو کی حیثیت میرے لئے ایک شاگرد کی نہیں بلکہ ایک دوست کی ہے۔“

جب ۳۴۷ ق۔م میں افلاطون انتقال کر گیا تو ارسطو نے ہی اکادمی کی سرپرستی سنبھالی اور افلاطون کے کام کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ ارسطو کے علم اور ادب کے چرچے ہونے لگے اکادمی سے فارغ تحصیل طلباء نے اس کی شہرت



کو یونان کے مختلف علاقوں میں پھیلا دیا۔ شمالی یونان میں خاص طور پر ارسطو کو علم و ادب کا ماہر اور ایک عظیم دانشور کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونیہ کے بادشاہ نے اس کو بلا بھیجا اور اپنے شہزادہ کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اس شہزادہ کا نام اسکندر تھا اور اس وقت اس کی عمر صرف ۱۳ برس ہی تھی۔ یہی شہزادہ تاریخ میں سکندر اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔

کچھ مورخین کا خیال ہے کہ افلاطون کی موت کے بعد ارسطو نے اکادیمی کی ذمہ داریاں کچھ ہی وقفہ کے لیے سنبھالیں کیونکہ اس کے بعد افلاطون کے بھائی کے لڑکے کو اکادیمی کا سرپرست مقرر کر دیا گیا۔ اس لیے ارسطو ایتھنز چھوڑ کر Atarneus کے بادشاہ ہرے یاس کے دربار میں چلا گیا اور وہیں اس نے اس بادشاہ کی ایک رشتہ دار سے شادی کر لی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۳۴۴ قبل مسیح میں ہرے یاس کو قتل کر دیا گیا، اس لئے ارسطو نے وہاں رہنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی بیوی اور اپنی لڑکی کو لے کر Mytilene نام کی جانب کوچ کیا۔ اس نے راستہ میں ایک ایسے مقام پر قیام کیا جہاں اس کو حیاتیات کے کچھ نئے نمونے دستیاب ہوئے اور اس نے وہیں ایک مناسب جگہ تجویز کر کے ان پر کچھ تجربات کئے۔ اُس زمانہ میں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی، ساتھ ہی یہ بھی اندازہ لگایا گیا کہ یہ شخص ضرور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس بارے میں جب مقدونیہ کے بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے ارسطو کو بلایا اور اپنے بیٹے کا معلم مقرر کیا۔

۳۳۵ قبل مسیح میں جب سکندر نے ایشیاء میں مہمات کا ارادہ کیا تو ارسطو نے اس سے اتفاق نہیں کیا، کیونکہ وہ اس قسم کی جنگوں کے خلاف تھا۔ اس لئے اس نے سکندر کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ پھر یونانی علم و ادب کو فروغ دینے کے لئے واپس ایتھنز آ گیا۔ اس دوران اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا جس نے ایک لڑکی چھوڑی تھی۔ اس لیے ارسطو نے دوسری شادی کر لی اور مستقل طور پر ایتھنز میں ہی بس جانے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے وہاں اکادیمی کے طرز پر اپنی الگ ایک درس گاہ قائم کی جس کا نام Layceum



رکھا، جہاں فلسفہ اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ارسطو اپنے شاگردوں کو فلسفہ پڑھاتے وقت ان سے جسمانی کسرت بھی کراتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک زینہ تعمیر کروایا تھا جہاں سے وہ نیچے اترتے چڑھتے ہوئے اپنے شاگردوں کو فلسفہ کا درس دیتا تھا اور فلسفہ سے متعلق مسائل پر بحث کرتا تھا۔ اس لئے اس اسکول کو Peripatetic School بھی کہا جاتا تھا۔ یہ نام یونانی / لاطینی لفظ Peripatetico سے لیا گیا تھا جس کے معنی گھومنے پھرنے یا ٹہلنے سے لئے جاتے تھے۔ یونانی فلسفہ میں ارسطو کے پیرو یا مقلدوں کو Peripatetic بھی کہا جاتا تھا۔ (فلسفہ ارسطو کے لئے پروفیسر کلیم الدین احمد نے فلسفہ مشائی کا نام بھی دیا ہے۔)

ارسطو نے ۳۳۵ سے ۳۲۲ قبل مسیح تک یعنی ۱۳ برس تک اپنی اس درس گاہ میں سینکڑوں شاگردوں کو فلسفہ کی تعلیم دی اور اس کی بہت سی اہم تخلیقات بھی اسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس کی مشہور تخلیق Dialogue بھی اسی زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے کئی مقالات طبعیات اور مابعد الطبعیات پر بھی ملتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اس کے تعلقات سکندر سے خراب ہو چکے تھے، کیونکہ ارسطو نے اس کی مہمات کی مخالفت کی تھی۔ لیکن یہ بات عوام تک نہیں پہنچی تھی اور ایتھینز میں اس ہی کو سکندر کا قریبی دوست تسلیم کیا جاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس کو سکندر کے دربار کا ایک نمائندہ بھی مانا جاتا تھا۔ جب سکندر کی موت واقع ہوئی تو اس خبر کو عام نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بات زیادہ دن تک پوشیدہ نہیں رہ سکی اور جب عوام کو معلوم ہوا تو خانہ جنگی شروع ہو گئی، جس کو یونان کی تاریخ میں Lamian war کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس جنگ کے دوران کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ارسطو کو ایتھینز چھوڑنا پڑا اور وہ اپنے آبائی وطن چلا گیا اور وہیں کچھ دنوں بعد ۳۲۲ ق۔م میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی موت کے بارے میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ



معدہ کے ناسور کا مریض تھا اور اس کی موت کا سبب یہی بیماری تھی، جبکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کو زہر دے دیا گیا تھا، اور کچھ لوگوں نے یہ افواہیں اڑادی تھیں کہ وہ جوار بھانا کے اسباب کا پتہ لگانا چاہتا تھا اور اسی کوشش میں اس کی موت سمندر میں ڈوب جانے کی وجہ سے ہوئی۔ لیکن صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو معدہ کی پرانی بیماری تھی اور اسی بیماری کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔

ارسطو دنیا کا تنہا ایسا مفکر اور دانشور سمجھا جاتا ہے جس نے ایک ساتھ مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ ہر وہ علم جو اس کے زمانہ میں موجود تھا، اس نے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ سائنسی علوم میں اس نے علم فلکیات، علم ارضیات، جغرافیہ، طبیعیات، حیاتیات، علم الاعضاء، اناٹومی، علم الجنین، حیوانیات اور فلسفہ کے تحت جمالیات، اخلاقیات، حکومت، سیاست، نفسیات، علمیات اور ادبیات میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے شاعری کا بھی شوق تھا۔ اس زمانہ کی رزمیہ نظمیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ارسطو کی حیثیت یونانی زبان، یونانی علوم اور یونانی تہذیب کی ایک انسائیکلو پیڈیا کی طرح ہے۔ اس طرح اس کی زندگی ایک ہمہ گیر زندگی تھی جس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے دفتر کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تخلیقات کی فہرست اتنی طویل ہے کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ حالانکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کے بہت سے مقالات ضائع ہو گئے ہیں۔

اس کتاب میں اس کا تذکرہ شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں پہلی بار اس نے فلسفہ کے اس حصہ کو، جس میں حواس، اور ذہن سے بحث کی گئی تھی، الگ کر کے روح Psyche کے بیان میں شامل کیا اور یہی کوشش بعد میں جا کر علم النفس کے وجود کا باعث ہوئی۔ اس لیے جب نفسیات کی تاریخ مرتب کی جاتی ہے تو ارسطو کا ذکر پہلے آتا ہے کیونکہ مورخین نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ فلسفہ میں نفسیات کے شعبہ کی ترقی اور فروغ میں ارسطو کی نمایاں خدمات ہیں۔ بلکہ نفسیات کی تاریخ ارسطو کے زمانے سے ہی شروع کی جاتی ہے، اور جیسا کہ بقراط کے تذکرہ میں بیان کیا گیا ہے، نفسیات کے تعلق



سے بقراط کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی، کیونکہ بقراط کی کوششوں کو طبی سائنس کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

مفکرین کا خیال ہے کہ نفسیات کے تعلق سے اس کی تخلیق De Anima ہے جو اس کی اہم تصنیف Parva Naturalia کا ایک حصہ ہے۔ اس کتاب کو نفسیات میں اس لئے اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ اس نے اس حصہ میں روح کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ فلسفہ روح کے بارے میں اس کے اہم بیانات اسی کتاب میں ملتے ہیں۔ اس کتاب میں اس نے تکنیکی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے جن کو اس نے اپنے طبعیات اور مابعد الطبعیات سے متعلق مقالات میں واضح کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ روح پہلے ایک فطری نامیاتی جسم Organic Body کی حقیقت ہے یا روح ایک عنصر (یا جوہر) ہے جو فطری جسم کی شکل میں ہے، جو زندگی کی توانائی رکھتی ہے۔ ان دونوں بیانات کو ملا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”روح سب سے پہلے فطری جسم کی ایک حقیقت ہے جو زندگی کی شکل میں توانائی رکھتی ہے۔“ اس سلسلہ میں اس نے یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ یہ اصول صرف انسان اور حیوانات کے لئے ہی نہیں ہیں بلکہ نباتات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

حبیب حق نے اپنی کتاب ”کلاسیکی یونان: تہذیب، فلسفہ اور فنون لطیفہ“ میں لکھا ہے کہ.....

”ارسطو کی نفسیات اسی طرح ابہام اور پیچیدگی کا شکار ہے جیسے اس کی دیگر (نظری) تفکرات ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس نے عادت پر زیادہ زور دیا ہے جسے اس نے فطرت ثانیہ کہا ہے۔ یکجہایت کے اصولوں پر زور دیا ہے اور خود اختیاری یا نفسیاتی آزادی کا مادہ اس کے ہاں ہے۔ ہم کبھی براہ راست سعی نہیں کر سکتے کہ ہم اس سے مختلف ہو جائیں جو ہم ہیں۔ اس کے ہاں نفس کسی بھی ہستی کی مکمل نامیاتی خصوصیت ہے۔ وہ نفس کو ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ روح لازوالیت حاصل کر لے اور روح ازلی یعنی فکر



خالص میں ضم ہو جائے۔“

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ارسطو کی زندگی ہمہ گیر زندگی تھی اور اس نے اپنے زمانہ کے ہر علم کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنے مقالات میں اس نے ان تمام علوم پر اظہار خیالات بھی کیا ہے۔ اس کے اہم خیالات جو نفسیات سے خاص طور سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی تخلیق Parva Naturalia کے ان ابواب میں واضح ہو جاتے ہیں جو اس نے احساسات، یادداشت اور بازشیافت، نیند اور بے خوابی، خواب اور خوابوں میں پیشن گوئی، طویل عمری، عنفوانِ شباب اور معمری، اور زندگی و موت جیسے مسائل پر بحث کی ہے۔

ارسطو کی نفسیات کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کے لئے اس کے نظریہ قدم مادہ Hylomorphism کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس نظریہ سے اس کا مطلب تھا کہ ”مادہ کائنات کی علت اولیٰ ہے“۔ اس طرح اس نے مادہ کو اولیت دی ہے۔ یہ اصطلاح یونانی لفظ (Hyle)، جس کے معنی مادہ سے لئے جاتے ہیں، اور (Morphe) جس کے معنی شکل یا ساخت کے ہوتے ہیں، سے مل کر تشکیل دی گئی تھی۔ اس طرح ارسطو کے اس نظریہ کا مطلب یہ لیا گیا کہ روح ہی جسم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جسم چونکہ مادی ہے، اس لئے اس کو روح کا مادہ (matter of Soul) کہا گیا ہے۔ اس نے یہ خیال عمومیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک مثال دی تھی کہ اگر ہم کانسہ کا ایک پُتلا بنائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کانسہ کی جو نسبت اس پُتلے سے ہے، روح کی وہی نسبت جسم سے ہے اور اس طرح ہر مادہ کی نسبت اس کی شکل سے ہوتی ہے۔ یعنی ہر روح ایک شکل رکھتی ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر مادی چیز کے پیچھے ایک روح کا وجود ضروری سمجھتا ہے۔ اب یہ مادہ فطری بھی ہو سکتا ہے اور غیر فطری (یعنی ساختہ) بھی۔ روح کے متعلق اس کا یہ نظریہ اس وقت تسلیم نہیں کیا گیا تھا، اور مفکرین نے اس خیال کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ ارسطو اپنے خیال کو صاف طور پر واضح نہیں کر سکا۔



ارسطو نے De Anima مقالہ کا ایک بڑا حصہ روح کے متعلق بحث میں صرف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روح کی انفرادیت پر بحث ہونا ضروری ہے اور یہ بحث اس کی صلاحیت یا استعداد سے شروع ہونی چاہیے۔ وہ سب سے زیادہ اہمیت تغذیہ، ادراک اور شعور یا ذہن (جس کے لئے اس نے Mind کا لفظ استعمال کیا ہے) کو دیتا ہے۔ ادراک کو اس نے اس لئے اہمیت دی کیونکہ اس کے لئے توجہ کا بڑا حصہ استعمال ہوتا ہے۔ تغذیہ کو وہ اس لئے شامل کرتا ہے کیونکہ یہ عضویات کے لئے ضروری ہے۔ شعور کو بھی اس لئے اہمیت دیتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں تمام مخلوقات میں صرف انسان کے پاس شعور کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہر مخلوق میں، جس میں ادراک کی صلاحیت ہو، اسے تغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں افزائش نسل کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حیوانات میں ادراک کی صلاحیت ہوتی ہے اور انہیں بھی تغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ انسان میں ان صلاحیتوں کے علاوہ شعور بھی ہوتا ہے جو اس کو دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ شعور کی موجودگی سے انسان میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو اس کو دنیا پر قابض ہونے کی قابلیت پیدا کرتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ”ہر جاندار نشو و نما پاتا ہے پھر وہ پختگی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد وہ فنا کی جانب بڑھتا ہے۔ بغیر تغذیہ کے یہ ناممکن ہے۔“ اور آخر میں وہ کہتا ہے کہ ”نفسیات کا یہ کام ہے کہ وہ ادراک اور فکری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تغذیہ کی اہمیت پر بھی زور دے اور اس کو بحث میں شامل کرے۔“

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ارسطو نے ذہن کے لئے Mind کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اکثر وہ اس لفظ کو عقل اور فہمیدگی کے معنوں میں بھی استعمال کرتا تھا۔ ایک جگہ اس نے De Anima میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے اس کو روح کا ایک ایسا حصہ قرار دیا ہے جس کی وجہ سے انسان میں علم حاصل کرنے کی اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ تجسس انسان کی خاصیت ہے اور اس کو جاننے کی طلب ہوتی ہے، یعنی وہ علم کی خواہش کرتا ہے۔ اس لیے وہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس طرح حس کی



موجودگی ذی روح ہونے کی دلیل ہے، اسی طرح ذہن کی موجودگی انسان ہونے کا ثبوت ہے اور ذہن کی موجودگی کہ وجہ سے انسان میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہر فعل کو سوچ سمجھ کر انجام دے اور اس کو انجام دینے سے پہلے اس کے نتائج سے واقف ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ فکری صلاحیتوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا معیار ہر انسان میں مختلف ہوتا ہے، لیکن ان صلاحیتوں کا ہونا ہی انسانی شعور کی موجودگی کی نشانی ہے۔

نفسیات کے مطالعہ میں ارسطو کے خیالات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ فلسفہ کے اس شعبہ کو خاص طور پر ارسطو کی تحریروں نے کافی تقویت پہنچائی ہے کیونکہ اس سے پہلے اس موضوع کو صرف روح کے تعلق سے زیر بحث لایا جاتا تھا۔ ارسطو نے اس کو وسعت دی اور اس موضوع کو ہر ذی روح سے مربوط کر دیا۔ دوسرے سب سے اہم یہ بات ہے کہ اس نے نفسیات کے مختلف عنوانات کو اپنی ان تحریروں میں بھی استعمال کیا ہے جو اخلاقیات اور مابعد الطبعیات سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ یونانی زبان میں روح کے لئے Psuche کا لفظ استعمال ہوتا تھا جو بعد میں Psyche میں بدل گیا جبکہ لاطینی زبان میں روح کو Anima کہا جاتا تھا۔ ارسطو نے نفسیات کے تعلق سے اپنی تحریروں میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی ابتداء فطرت کی تلاش جیسے موضوع سے کی ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میں فطرت اور زندگی کے تعلق کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ موضوع براہ راست نفسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن اس تلاش میں اس کو روح کی گہرائیوں میں جانا پڑا اور یہ ایسا موضوع تھا جو نفسیات سے باہر رہ کر سوچا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

ارسطو نے بے شمار مقالے لکھے اور ان مقالات کے بارے میں Cicero نے کہا تھا کہ ارسطو کی تحریریں سونے کا ایک دریا ہیں۔ لیکن اس کی تمام تخلیقات محفوظ نہیں رہ سکیں اور نہ اس نے ہی کوشش کی کہ وہ ان کو محفوظ کرے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس زمانے میں طباعت کا کوئی نظام نہیں تھا۔ اس لئے ان کی اشاعت ممکن نہ ہو۔ لیکن اس کے مقالات کے بارے میں اس کے شاگردوں کی



تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے شاگردوں نے اپنی تحریروں میں ارسطو کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے ان سے ارسطو کے خیالات کا تو پتہ چل جاتا ہے لیکن اس کے کام کا تفصیل سے جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ لیکن مختلف مفکرین کی یہ رائے ہے کہ اس وقت دنیا میں مختلف جگہوں پر اس کی جو تخلیقات دستیاب ہیں، وہ کل تخلیقات کا تقریباً بیس فیصدی حصہ ہے۔

○○



# ڈیکارٹ

Rene Descartes ( 1596-1650)

سترھویں صدی کے دانشوروں اور فلسفیوں کا جب ذکر آتا ہے تو ذہن میں سب سے پہلے نام ڈیکارٹ کا ہی ابھرتا ہے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا مشہور اور مقبول مفکر تسلیم کیا جاتا ہے جس نے نہ صرف اپنی زندگی میں ہی شہرت کے آسمان چھو لئے تھے بلکہ کئی صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی اور فلسفہ میں اس کے نظریات کی آج بھی قدر و منزلت باقی ہے۔ ڈیکارٹ کی شہرت علم ریاضی میں مہارت رکھنے والے دانشور کی حیثیت سے ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ماہر عضویات اور ماہر طبیعیات کی حیثیت سے بھی اپنا الگ مقام رکھتا ہے۔ ساتھ ہی وہ فلکیات میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی فکر کا مرکز فلسفہ ہی تھا اور آج بھی ایک فلسفی کی حیثیت سے ہی اس کی پہچان باقی ہے۔ ایک مصنف نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ فلسفہ کے تعلق سے سترھویں صدی میں ڈیکارٹ کی عظمت کو قدیم یونانی فلسفی ارسطو اور بقراط کی عظمت کے مقابلہ رکھا جاسکتا ہے۔ اس بات کو مبالغہ سمجھا جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ڈیکارٹ کی اہمیت کو اور اس کی عظمت کو اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ وہ یونان کے قدیم فلسفیوں کے ہم پلہ سمجھا جانے لگا تھا۔ حالانکہ اس زمانہ کی روایات کے مطابق ارسطو اور دوسرے یونانی فلسفیوں کے نظریات کو اہمیت حاصل تھی، لیکن ڈیکارٹ نے فلسفہ میں اپنی الگ ایک راہ متعین کی



اور فلسفہ کو سائنس کی طرز پر پیش کر کے اپنی الگ پہچان بنالی۔ اس کے اثرات یہ ہوئے کہ فلسفہ اور مذہبی خیالات کا تعلق کم سے کم ہو گیا اور فلسفہ کو ایک نئی طرز دینے کی وجہ سے ڈیکارٹ نے فکری تقاضوں میں ایک انقلابی تبدیلی کی داغ بیل ڈال دی۔ جب ہم نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ڈیکارٹ کے نظریات کا بھی ذکر آتا ہے اور ساتھ ہی ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ ڈیکارٹ کی پہچان ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ لیکن جب ڈیکارٹ کا تفصیل سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈیکارٹ اپنے زمانہ کا عظیم ترین فلسفی تھا اور فلسفہ میں اس کی خدمات آج بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی اس زمانہ میں رکھتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈیکارٹ کا مطالعہ ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عظیم فلسفی اور دانشور کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ نفسیات کے تعلق سے اس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ سترہویں صدی میں اس نے نفسیات میں دلچسپی لی اور ایسے نظریات وضع کئے جو آج بھی تسلیم کئے جاتے ہیں اور نفسیات کی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مضمون میں ڈیکارٹ کے وسیع اور عریض فلسفہ کا تفصیل سے جائزہ لینا تو ممکن نہیں اس لئے ہم اس کے فلسفہ کے اس حصہ سے بحث کریں گے جس نے نفسیات کو متاثر کیا۔

ڈیکارٹ فرانس کے ایک غیر معروف گاؤں میں ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو مقامی اسکول میں ہی تعلیم کے لئے داخل کر دیا گیا اور وہاں سے وہ سیدھا Jesuit College میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں فرانس میں یہ کالج اپنے مذہبی رنگ کی وجہ سے کافی مشہور تھا اور وہاں کے نظم و ضبط کا چرچا پورے فرانس میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی مقبولیت کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ حالانکہ یہ ادارہ عیسائیت کی تبلیغ کو نظر میں رکھ کر مذہبی بنیادوں پر ہی قائم کیا گیا تھا، لیکن وہاں سائنٹفک علوم کی تعلیم کا بھی معقول انتظام تھا۔ ڈیکارٹ نے اپنے لئے علم ریاضی کا انتخاب کیا اور اسی مضمون میں مہارت حاصل کی اور گریجویشن مکمل کیا اور ولندیزی فوج میں شامل ہو گیا۔

۱۶۱۹ء میں اس نے ولندیز کے مشہور ریاضی داں اور سائنسداں Beeckman



سے متاثر ہو کر اس نے فطری مظاہر سے متعلق سائنس میں دلچسپی لینا شروع کی اور تمام تر توجہ کو اسی جانب موڑ دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اس نے اپنی تخلیق Rules for the Direction of The Mind شروع کی۔ اس کی اس تخلیق کے بارے میں مفکرین کا خیال ہے کہ فلسفیانہ خیالات پر مبنی اس تصنیف نے یہ بات واضح کر دی کہ ڈیکارٹ کے ذہن میں سائنس کے لئے ایک ایسا تصور موجود تھا کہ سائنس کو فلسفیانہ اور عقلی اصولوں پر بھی جانچا اور پرکھا جاسکے۔ جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ سائنس سے مطلب ایک منضبط اور منظم علم سے ہے اور ڈیکارٹ کے خیال میں فلسفہ کو بھی ان ہی اصولوں پر جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا کی تخلیق ہی اس لئے کی گئی ہے کہ انسان اس کی مختلف زاویوں سے تمام معلومات حاصل کرے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ دنیا کے بارے میں علم حاصل کرنے کے عمل کو کس طرح انجام دیتا ہے یا اس عمل کے کس طریقہ کار کو کس حد تک اختیار کرتا ہے۔

تقریباً دس سال تک ڈیکارٹ نے اپنا زیادہ وقت اس زمانے کے مشہور مفکرین اور دانشوروں کے ساتھ گزارا۔ اس سلسلہ میں اس نے کئی مقامات کے سفر کئے اور پیرس میں بھی رہا۔ اس کی دلچسپی علم ریاضی اور طبعیات میں قائم رہی۔ ۱۶۲۹ء میں ڈیکارٹ ہالینڈ چلا گیا اور وہاں جا کر وہ گوشہ نشین ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ کئی بار پیرس بھی آیا، لیکن کسی سے ملا نہیں۔ اس کو نہ جانے کیا خط تھا کہ اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ اور تنہائی میں رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ سفر کیا کرتا تھا اور اپنی رہائش بدل دیا کرتا تھا، تاکہ لوگ اس کے بارے میں کچھ نہ جان سکیں۔ اسی طرح اس نے اپنی زندگی کے بیس قیمتی سال گوشہ نشینی میں گزار دیئے۔ لیکن بقول اس کے، یہ مدت رائیگاں نہیں گئی۔ اس مدت میں اس نے اپنا زیادہ تر وقت غور و فکر میں صرف کیا اور پوری توجہ سائنس، تکنیک اور ریاضی سے متعلق مطالعہ میں صرف کی اور اس کے نتیجہ میں اس کے تین اہم مقالات ۱۶۳۷ء میں شائع ہوئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی معرکہ الآرا تخلیق The World اسی مدت میں تخلیق کی تھی،



جو اس کی موت کے بعد شائع ہوئی تھی۔

اس کی زندگی کے بیس سال جو اس نے گوشہ نشینی میں گزارے، مختلف علوم کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس مدت میں اس نے سائنس اور تکنیکی علوم کو اپنی فکر کا مرکز بنائے رکھا۔ ساتھ ہی فلکیات کا بھی مطالعہ جاری رکھا اور کچھ نئے نظریات پیش کئے۔ ڈیکارٹ نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ اس نے فلسفہ کی تعلیم کے دوران اپنے ابتدائی برسوں میں جو کچھ پڑھا ہے، اس میں تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس نے ارسطو اور بقراط کے بعض خیالات کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس کے ہم عصر دانشوروں نے سوچا کہ وہ کس طرح پرانے فلسفہ کی جگہ نیا فلسفہ لاسکتا ہے؟ کیونکہ یہ کام برسوں کا نہیں صدیوں کا ہے۔ اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ ہر شہر میں پرانی عمارات بھی ہوتی ہیں اور ایسی عمارات بھی جو جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق جدید طرز پر جدید ٹینک کے ذریعہ تعمیر کی جاتی ہیں۔ اب یہ رہنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کہاں رہنا پسند کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اس نے اپنی گوشہ نشینی کا استعمال کیا اور غور و فکر کو جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۶۳۷ء میں اس کے تین مقالات شائع ہوئے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی سب سے زیادہ مقبول تخلیق *The World* بھی اسی مدت میں تخلیق کی گئی تھی۔ لیکن یہ اس کی بد نصیبی تھی کہ اس کی زندگی میں یہ اہم کتاب شائع نہ ہو سکی۔ ڈیکارٹ کی غور و فکر کا نتیجہ ایک اور اہم کام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہمارا مطلب تجزیاتی علم ہندسہ کی ایجاد سے ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں اس نے *Galileo* سے بھی متبادل خیالات کیا تھا۔ تجزیاتی علم ہندسہ *Analytic Geometry* سے اس کا مطلب تھا کہ اس طرح جیومیٹری کے تجزیاتی عمل کے ذریعہ الجبرا کے مشکل مسائل کا حل تلاش کرنا یا الجبرا کے اصولوں کے ذریعہ جیومیٹری کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کے اس نظریہ کے ذریعہ ریاضیاتی طبعیات کی ایک جدید اصطلاح وجود میں آئی جس کے مفہوم میں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے جیومیٹری



کی سائنس کو طبعیات کے اصولوں کی بنیاد پر الجبرا سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ڈیکارٹ نے اپنی توجہ کا مرکز طبعیات اور جیومیٹری کو بنا رکھا تھا۔ لیکن جب وہ ایسٹرڈم منتقل ہوا تو اس کی توجہ فلسفہ کی جانب رخ کر گئی اور ۱۶۳۷ء میں اس کے مقالات کا مجموعہ Discourse on the Method کے نام سے شائع ہوا اور اس کے چار برس بعد یعنی ۱۶۴۱ء میں ایک بہت ہی اہم تخلیق Meditations on First Philosophy شائع ہوئی، جس نے فلسفہ کے میدان میں دھوم مچا دی۔ اس کتاب کا پورا نام Meditations on the first Philosophy: In Which The Existence of God and the Distinction Between Mind and Body are Demonstrated. اور یہ پہلے لاطینی زبان میں شائع ہوئی تھی اور ایک سال بعد ہی اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع ہوا۔ فرانسیسی زبان کے اس ترجمہ کی وجہ سے عوام میں ڈیکارٹ کی صحیح تصویر ابھر کر آئی اور عام لوگوں کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ڈیکارٹ کی فکر کا معیار کتنا بلند ہے اور وہ فلسفہ کے مشکل ترین موضوعات کو عام لوگوں میں لانے کی کتنی ایمانداری سے کوشش کرتا ہے۔

اس کتاب کے فرانسیسی ترجمہ سے ڈیکارٹ بھی مطمئن تھا۔ اس نے اس کتاب میں خود کئی اضافے کئے اور ان اضافی مضامین کے ساتھ یہ کتاب اپنے پیرو مرشد Father Mersenne کو روانہ کر دی جنہوں نے یہ مسودہ اور دوسرے دانشوروں کو بھی دکھایا۔ ان میں ایک مشہور مفکر تھا مس ہوب بھی شامل تھا۔ ان دانشوروں نے اس کتاب پر تفصیل سے تبصرے لکھے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ مسودہ اور تمام تبصرے ڈیکارٹ کو واپس بھیج دئے گئے۔ ڈیکارٹ نے ان تمام تبصروں کا فلسفیانہ انداز میں بہت تفصیل سے جواب دیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جواب بذات خود کتاب کے اصل مضمون سے زیادہ مکمل اور ضخیم ہو گیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اصل مضمون کے ساتھ تمام دانشوروں کے خیالات اور ان پر ڈیکارٹ کے



جوابات پر مشتمل ۱۶۴۴ء میں شائع ہوا۔

جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے، ڈیکارٹ نے Dualism یعنی ثنویت کا نظریہ پہلی بار اسی کتاب میں شامل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جسم اور روح کے تعلق سے دانشوروں میں بحث کا آغاز ہو چکا تھا اور اس سلسلہ میں ارسطو کے خیال کی تردید کی جانے لگی تھی۔ ڈیکارٹ نے چونکہ نفسیات کو سائنس سے مربوط کرنے کی کوشش کی تھی، اس لیے اس کے نظریہ ثنویت کو تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کے خیال میں ذہن اور جسم دو مختلف چیزیں ہیں جو اپنے اعمال کے تعلق سے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ڈیکارٹ ذہن کو جسم کا ایک حصہ نہیں مانتا بلکہ اس کو وہ ایک اضافی حصہ کہتا ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن کا مقام دماغ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ذہن کو ایک ایسی قوت تسلیم کرتا ہے جو تمام انسانی افعال کی ذمہ دار ہے۔ ذہن چونکہ غیر مادی ہے، اس لئے اس کو روح کا نام دیا جاتا رہا تھا۔ ڈیکارٹ روح کے قدیم مفہوم کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، لیکن ذہن کو غیر مادی تصور کرنے کے بعد اس کے اثرات انسانی افعال پر کس طرح پڑتے ہیں، یہ سوال پھر بھی باقی رہا۔ عام لوگ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ذہن غیر مادی ہے اور پھر بھی اس کا مقام طے کر دیا گیا ہے اور ذہن سوچ کا ذمہ دار ہے۔ انسان کی سوچ اس کے افعال پر اور اس کے کردار پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے، یہ سوالات اب بھی کبھی کبھی دانشوروں کو پریشان کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں طویل بحث کے بعد وہ خلاصہ کرتا ہے کہ.....

”میرے ذہن میں صاف طور پر مادی عناصر کا تصور ہے اور اس مادہ کے نمایاں اور لازمی خواص کی موجودگی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادہ کا وجود ہے۔ اس لئے ہمیں یقین کرنا پڑے گا کہ مادہ کا وجود ہے۔“

”اسی طرح میرے ذہن میں بالکل صاف طور پر ذہنی عناصر کے وجود کا ثبوت ہے جس کی صاف اور واضح شکل میرے خیالات ہیں۔ اس لئے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ذہن بھی اپنا وجود رکھتا ہے، یعنی وہ ذہن جس



میں خیالات پیدا ہوتے ہیں۔“

”اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادہ (یعنی جسم) اور ذہن دو الگ الگ اکائیاں ہیں جو اپنا الگ الگ وجود رکھتی ہیں۔ اس لئے دونوں میں واضح فرق ہونا لازمی ہے۔“

”چونکہ خالق مطلق نے روح کو ایک جسم دیا ہے اور جسم کو ایک روح عطا کی ہے اور دونوں کو اس طرح گہرائی سے ایک دوسرے میں ضم کر دیا ہے کہ ان کا اتحاد ایک وحدت کی شکل میں بھی قائم ہے اور دونوں انفرادی طور پر بھی اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔“

روح اور جسم کے تعلق کے بارے میں وہ وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لائبنز کے قانون عینیت Leibniz's law of Identity کے مطابق روح اور جسم میں کسی بھی قسم کی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ لہذا دونوں الگ الگ اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جسم ایک مادہ ہے اور اس کے حصے کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ذہن غیر منقسم ہے اور اس کے اوصاف اور خصوصیات بھی غیر منقسم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات بھی غیر منقسم ہیں۔ ہم اپنی خواہشات کے ٹکڑے نہیں کر سکتے، ہم اپنی خوشیوں کو یا غموں کو حصوں میں نہیں بانٹ سکتے اور نہ ہی اپنے یقین کے کچھ حصہ کو اپنے ذہن سے نکال سکتے ہیں۔ یہ سب سالم ہی وجود رکھتے ہیں، ایک ایسی اکائی کی شکل میں جو سالم ہے تو اس کا وجود ہے ورنہ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ.....

”میں ایک جسم رکھتا ہوں جو مادی ہے ساتھ ہی میرے پاس ذہن بھی ہے جو غیر مادی ہے۔ لیکن دونوں میں ایک تعلق ہے۔ جس طرح جسم میں تمام اعضاء حس مادی ہیں، لیکن ان کی وجہ سے جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ غیر مادی ہے اور اس طرح اعضاء، حس اور احساس میں ایک تعلق ہے۔ وہی تعلق جو جسم اور ذہن میں ہے۔“

ڈیکارٹ نے نفسیات کو جو اہم اصول دیے، ان کے مطابق نفسیات کو سائنس



کے زمرہ میں لا کر بحث کی ابتدا ہوئی۔ اس لئے عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈیکارٹ سے پہلے نفسیات فلسفہ کا ہی ایک حصہ تھی اور فلسفہ کے ایک شعبہ کی حیثیت سے اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن ڈیکارٹ کے بعد نفسیات کو ایک سائنسی موضوع کی حیثیت دی جانے لگی۔ ڈیکارٹ کا خیال تھا کہ جس طرح حیوانات مشین کی طرح حرکت کرتے ہیں، اسی طرح انسان بھی غیر عقلی کردار میں بڑی حد تک ان سے مشابہت رکھتا ہے۔ ڈیکارٹ کے اس مفروضہ کے بعد سائنسدانوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اگر نظام عصبی کے بارے میں اور گہرائی سے تحقیقات کی جائیں اور اس کا نعم البدل کوئی نظام ایجاد کیا جاسکے تو ہم ایک ایسا مشینی انسان بنا سکتے ہیں جو انسان کی طرح سوچ سکے اور حالات کے مطابق عمل کر سکے۔

ڈیکارٹ کا یہ خیال آنے والے ماہرین نفسیات کے لئے ایک مشعلِ راہ ثابت ہوا اور انہوں نے ڈیکارٹ کے نظریات کی روشنی میں نفسیات کا مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی نفسیات آہستہ آہستہ فلسفہ سے دُور ہو کر سائنس کے قریب ہوتی گئی اور آج بھی یہی روایت قائم ہے۔ ڈیکارٹ کے جن خیالات نے نفسیات کو فائدہ پہنچایا اور جن اصولوں پر چل کر بعد میں آنے والے ماہرین نے اس سلسلہ میں پیش رفت کی، اُن کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے.....

پہلا اصول یہ تھا کہ کائنات کے اصولوں کو واضح کرنے کے لئے چند جامع اور مکمل اصولوں سے کام چل سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنے اندر وسعت رکھتے ہوں۔ ان میں پہلا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت کو اس وقت تک تسلیم نہ کرو جب تک اس کے لئے تمہارے پاس ٹھوس دلائل نہ ہوں اور تمہیں پورا یقین ہو کہ تمہارے ذہن میں جو کچھ آیا ہے، وہ اتنا مکمل ہے کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسرا یہ کہ ہر مشکل مسئلہ کو مختلف اجزاء میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ اس کے ہر جز پر اچھی طرح اور بہتر طریقہ پر غور کیا جاسکے۔ اس طرح ہر جز پر الگ الگ توجہ مرکوز کرنے کے بعد وہ مسئلہ مکمل طریقہ پر حل ہو جائے گا۔



تیسرا اصول یہ تھا کہ اپنے خیالات کو اس طرح استعمال کرو کہ وہ آسان سے مشکل کی طرف بڑھیں۔ اپنے مسائل کی فہرست تیار کرتے وقت آسان مسائل کو پہلے رکھو اور مشکل مسائل کو بعد میں۔ اس طرح آسان مسائل جب حل ہو جائیں گے تو مشکل مسائل کی جانب پوری طرح توجہ دی جاسکے گی۔ اس اصول کو کائنات میں موجود عناصر کی معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جائے۔ جن مسائل کے بارے میں آسانی سے علم ہو سکتا ہے، ان کی معلومات پہلے حاصل کی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ معلومات تمہیں مشکل مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

چوتھا اصول یہ تھا کہ ہر چیز کو مکمل شمار کیا جائے اس طرح کہ اس کا کوئی عنصر باقی نہ رہ جائے۔

اسی طرح اس نے اپنی زندگی کے لئے بھی کچھ اصول وضع کر لئے تھے مثلاً.....

الف :- اپنے خالق مطلق پر مکمل یقین رکھو اور اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرو۔

ب :- دُنیا کے فطری اصولوں کو بدلنے کے بجائے اپنی خواہشات میں تبدیلی لاؤ کیونکہ فطرت کے اصول بدلنا ممکن نہیں، لیکن اپنی خواہشات مرتب کرنا ممکن ہے۔

ج :- اس نے لکھا تھا کہ میں نے دُنیا کا سب سے اچھا پیشہ اختیار کیا ہے، کیونکہ میں دُنیا میں فلسفی ہونا سب سے اچھا سمجھتا ہوں۔

د :- اپنی حدود مقرر کر لینی چاہئیں، چاہے وہ غیر حقیقی ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ ان پر عمل کرنے سے زندگی میں نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے جو زندگی میں ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔

ڈیکارٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تیقن کی تلاش میں عرصہ تک سرگرداں رہا۔ پہلے اس نے سوچا کہ علم ریاضی میں ہی میری منزل مقصود ہے کیونکہ یہی ایک ایسا علم ہے جس میں تیقن پوشیدہ ہے۔ لیکن ۱۶۴۰ء میں اس نے اپنی توجہ علم ریاضی سے ہٹالی اور ایک ایسے طریقہ کی تلاش شروع کی جہاں اس کو علم ریاضی کے باہر بھی استدلال کا وہی معیار حاصل ہو اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ علم ہندسہ میں اس کی کنجی پوشیدہ ہے جس کے ذریعہ فطرت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بعد میں اس نے محسوس



کیا کہ اس کی سوچ صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کنجی سے فطرت کے راز کس طرح افشاں کر سکتا ہے، جب ہر شخص اپنے ان اصولوں کو ہی مانتا ہے جو اس نے اپنے عہدِ طفلی میں اپنے لئے فرض کر لئے تھے اور ان کی سختی سے پابندی کرتا ہے۔ اس کے لئے وہی اصول سچے ہیں اور وہی راستہ صحیح ہے اور اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستہ پر چلنا اس کے لئے مذہب سے انحراف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے ڈیکارٹ کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ ان اصولوں کو غلط ثابت کرے جن پر چلنا ہی اس زمانے میں لوگ اپنا عقیدہ سمجھتے تھے۔

ڈیکارٹ کے فلسفہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی ہر تحقیق کو تشکیک سے شروع کرتا ہے اور پھر تحقیق کے ذریعہ اپنے شک اور شبہ کو دور کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ پہلے دُنیا کے وجود کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرتا ہے کہ یہ سب ایک خواب تو نہیں، اور پھر وہ غور و فکر شروع کرتا ہے اور تحقیق کے دوران اس کو خود اپنے وجود پر شک کرنے کی نوبت آ جاتی ہے، اور جب اس نے اپنے وجود کو شبہ کی نظر سے دیکھا تو اس کو عجیب و غریب تجربہ ہوا اور وہ سوچنے لگا کہ جب تک میرا وجود نہ ہو، میں اپنے وجود کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں؟ میرا سوچنا ہی میرے وجود کی نشانی ہے اور جب وہ اپنی حقیقت کو پہچان گیا تو پھر اس طاقت کو تسلیم کرنا پڑا جس کو خالق مطلق کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ خالق مطلق کا تصور جو میرے ذہن میں ہے، وہ میرے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی طاقت کا عطیہ ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کا مخزن ہے۔ اس کا ایک قول ہے I think, therefore I am اور یہ قول دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ ڈیکارٹ کے فلسفہ کے مطالعہ کی ابتدا اس کے اسی قول سے کی جاتی ہے۔ اس کے اس جملہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس کے مفہوم کو مختلف انداز میں لیا گیا ہے۔ لیکن اس کے خود کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالق مطلق کے وجود کے بارے میں سوچتا ہے، اور جب اس کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے دلائل کی تلاش کرتا ہے تو یہ دلائل خود اپنے اندر موجود پاتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر



چیز پر غور کرتا ہے، پھر اپنے وجود پر غور کرتا ہے۔ اس کی کتاب Meditations کا ایک حصہ اسی بحث پر مشتمل ہے اور اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور اسی کے نتیجہ میں اس کا Dualism یعنی ثنویت کا نظریہ ابھر کر آیا ہے۔ اس حصہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ میں جب اپنے وجود کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری بصیرت میری رہنمائی کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے وجود کے بارے میں صاف اور واضح دلائل پیش کر سکتا ہوں۔ اس نے اس سلسلہ میں تفصیل سے بحث کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ذہن کی حیثیت ایک Thinking Thing کی ہے اور اسی نکتہ پر پہنچ کر وہ ثنویت کا قائل ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ذہن کو اگر Thinking Thing تسلیم کر لیا جاتا ہے تو پھر ذہن کو مادہ کی شکل میں تسلیم کرنا پڑے گا۔ جبکہ سوچنے کا عمل مادہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ چیز ہمارے جسم میں ہے۔ جسم اور ذہن دو الگ الگ چیزیں ہونے کے باوجود اپنے عمل میں ایک وحدت کی شکل میں ایک ہی ہیں۔ ڈیکارٹ نے اپنے اس فلسفہ کی گہرائی اور وسعت، دونوں کو واضح کر دیا ہے۔ وہ اپنے اندر کے وجود کو تلاش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ..... ”جتنا میں تلاش کرتا ہوں اتنا ہی گہرائی میں چلا جاتا ہوں اور جتنی معلومات حاصل کرتا ہوں اتنا ہی اپنے آپ کو تشنہ پاتا ہوں۔ یہی تشنگی مجھے گہرائی میں لے جاتی ہے اور میں ڈوبتا ہی جاتا ہوں۔“

ڈیکارٹ نے فلسفہ میں ایک جدید نظریہ کا استعمال کیا جس کو عام طور پر مبالغہ آمیز تشکیک کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر تحقیق کے پیچھے تشکیک کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں کسی بھی معاملہ میں شک کرنے کا اسے پورا حق حاصل ہے اور وہ اپنے شک کو دور کرنے کے لئے اس معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی کوشش کو وہ تحقیق کہتا ہے۔ اس طرح جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ صرف شک کے بعد عمل کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ڈیکارٹ کے ذہن میں ہر حقیقت کے لئے شک کا جذبہ تھا، بلکہ اس نے حقائق کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک وہ جس کی تصدیق فطرت کی جانب سے ہو چکی ہے اور دوسری وہ



معلومات جو ہمارے ذہن میں ہمارے حواس کے ذریعہ ہم کو حاصل ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈیکارٹ نے جو کچھ کہا وہ فلسفہ کا ایک اہم حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے..... ”ہماری معلومات کا انحصار بنیادی خصوصیات اور ثانوی خصوصیات پر ہوتا ہے۔“ جس کی مثال اس نے اس طرح دی ہے کہ ایک سیب کو دیکھ کر مشاہدہ کرنے والے کو سیب کے رنگ اور اس کی شکل کے ساتھ ساتھ اس کی خوشبو اور اس کے ذائقہ کا بھی ادراک ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیب کی خوشبو اور ذائقہ کا احساس مشاہدہ کرنے والے کے ذہن کی پیداوار ہے جو اس کو تجربہ سے حاصل ہوئی ہے۔“ اس دلیل کو بنیاد بنا کر وہ اس کا اطلاق ریاضی کے اصولوں پر کرتا ہے۔ یعنی معروض کی شکل، تعداد، سائز، وقت اور فاصلہ وغیرہ بنیادی خصوصیات ہیں۔

۱۶۴۹ء میں سویڈن کی ملکہ کرسٹینا نے ڈیکارٹ کو اشاکہوم بلا لیا اور اس کو فلسفہ سکھانے پر معمور کر دیا۔ نہ جانے کیوں کرسٹینا نے ڈیکارٹ کو سخت تکالیف دیں۔ وہ روزانہ صبح پانچ بجے سے ہی ڈیکارٹ کو کام پر لگا دیتی تھی۔ وہ خود بھی اس سے فلسفہ سیکھتی تھی اور ساتھ ہی اس کے رفقاء اور محل کے دوسرے افراد کو بھی ڈیکارٹ کے پاس بھیج دیا کرتی تھی۔ ڈیکارٹ کی صحت پہلے سے ہی خراب تھی، وہ اتنی سخت محنت برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت جلد بستر کو لگ گیا اور ۱۶۵۰ء کے ابتدائی مہینوں میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ ڈیکارٹ سے منسوب کچھ تنازعات کے باوجود اس کی شخصیت کو کافی شہرت ملی۔ خاص طور پر کیٹھولک طبقہ نے اس کو بہت زیادہ سراہا اور اس کو اتنی اہمیت دی کہ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ پوپ کی جانب سے اس کو ایک مذہبی رہنما (یعنی سینٹ) کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اس کی موت کے بعد اس کی میت کو فرانس لے جایا گیا اور وہیں اس کو دفنایا گیا۔ ایک کتاب میں لکھا تھا کہ جب اس کی میت کو سویڈن سے فرانس لے جایا جا رہا تھا تو راستہ میں ہر مقام پر اس کے عقیدت مندوں کا ہجوم اس کے آخری دیدار کے لئے موجود رہتا تھا۔



# جان لاک

John Locke (1632 - 1704)

نفسیات میں ہی نہیں بلکہ فلسفہ میں بھی جسم اور روح کے تعلق پر صدیوں سے بحث ہوتی آئی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف دانشوروں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ نفسیات کی ابتداء ہی اس بحث سے ہوئی ہے اور یونان میں ایک طویل عرصہ تک ان دونوں عناصر کے باہم رشتہ کا کوئی مدلل ثبوت پیش نہیں کیا جاسکا۔ سترہویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مشہور فلسفی ڈیکارٹ نے ثنویت کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک روح اور جسم دو مختلف اکائیاں ہیں جو اپنے اپنے راستے پر چلتی ہیں۔ اس کے فوراً بعد برطانوی فلسفی جان لاک کا ذکر آتا ہے جس نے ڈیکارٹ کے فلسفہ میں کچھ اصلاح کی اور اس نے روح کے مفہوم کو بدلتے ہوئے اس کی جگہ ذہن اور شعور کا استعمال کیا اور ساتھ ہی اس نے نفسیاتی زندگی میں تجربہ کو اہمیت دی۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ.....

”بچہ کا ذہن سفید کاغذ کی مانند ہے جس پر کوئی نقش نہیں ہوتا اور وقت کے ساتھ ساتھ جب اس کو مختلف تجربات سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ تجربات اس ساادہ کاغذ پر اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں اور ان ہی نقوش کی ترتیب اور تنظیم سے علم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔“

جب ہم نفسیات کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو جان لاک کے اس خیال کو اہمیت



دی جاتی ہے کیونکہ ڈیکارٹ کے بعد جان لاک نے اس سلسلہ میں اپنا نظریہ پیش کیا اور ساتھ ہی اس نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ روح کے مفہوم کو بدل کر اس کی جگہ 'ذہن' کا لفظ استعمال کیا۔ اس نے کہا کہ جب جسم کے تعلق سے بات کی جائے تو ذہن کی بات آتی ہے اور یہی علمیت ہے۔ اس نے کہا کہ روح کے وجود کا مسئلہ فلسفہ کے لئے چھوڑ دیا جائے اور نفسیات میں ذہن کو ایک غیر مادی چیز تصور کر کے جسم سے اس کا تعلق طے کیا جائے۔

جان لاک ۲۹ اگست ۱۶۳۲ء کو سمریٹ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک چھوٹا جاگیردار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ خانہ جنگی کا شکار تھا اور شہری زندگی ابتری کا شکار تھی۔ جان لاک نے ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں ہی حاصل کی اور جب وہ ۱۴ سال کا ہوا تو ویسٹ منسٹر اسکول میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد ۱۶۵۲ء میں آکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھتا ہے.....

”میں جب دنیا میں آیا اور مجھے اپنے وجود کا احساس ہوا تو میں نے اپنے

آپ کو طوفان میں گھرا ہوا پایا اور یہ طوفان ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہا۔“

..... وہ لکھتا ہے کہ میں یونیورسٹی کی روائتی تعلیم کو کبھی پسند نہیں کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ارسطو کے فلسفہ کو پڑھنے کے بجائے ڈیکارٹ کے فلسفہ کو پڑھنا پسند کیا۔ آکسفورڈ کالج میں کچھ سال گزارنے کے بعد وہ اسی کالج میں ٹیچر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

اس کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تجرباتی سائنس میں دلچسپی رکھتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کی تعلیمی سرگرمیوں کا بالترتیب کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ ایک جانب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۶۸ء میں اس کو رائل سوسائٹی کی فیلوشپ کے لئے منتخب کر لیا گیا تھا۔ دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۷۴ء میں اس کو میڈیکل سائنس میں گریجویشن کی ڈگری مل گئی۔ کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس نے ڈاکٹری کی تعلیم



کب حاصل کی اور اس کو اپنا پیشہ کب بنایا۔

۱۶۷۴ء میں ہی اس کو کرائسٹ چرچ کالج میں اس کو اسٹوڈنٹ شپ عطا کر دی گئی تھی۔ بعض تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ دنوں تک مصوری کی تعلیم حاصل کی تھی اور اس میں کسی حد تک مہارت بھی حاصل کر لی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میڈیکل سائنس میں اس کی معلومات اور ساتھ ہی مصوری میں اس کی دلچسپی کی وجہ سے وہ Lord Ashley سے متعارف ہوا۔ حالانکہ ان دونوں کی ملاقات محض ایک اتفاق تھی لیکن ان دونوں کی دوستی میں استحکام آتا رہا اور اس کی دوستی کی وجہ سے جان لاک کو اپنا کیریئر بنانے میں کافی مدد ملی۔ کچھ عرصہ بعد جان لاک کی اہمیت لارڈ آشلے کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گئی۔ وہ اس کو نہ صرف سیاسی معاملات میں بلکہ گھریلو امور میں بھی مشورہ دیتا تھا اور لارڈ آشلے اس کے مشوروں کی قدر کرتا تھا۔ ۱۶۷۲ء میں لارڈ آشلے کو Earl of Shaftesbury بنا دیا گیا۔ برطانیہ میں یہ ایک بہت ہی اہم اعزاز تھا۔ آشلے کے ساتھ ساتھ جان لاک کی اہمیت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ جان لاک نے اب اس کی تجارت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں۔ کچھ عرصہ بعد لارڈ آشلے لارڈ چانسلر بنا دیا گیا اور جان لاک کو اس کا سکرٹری مقرر کر دیا گیا اور ایک سال بعد ہی وہ تجارت سے متعلق سرکاری ادارہ کا سکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ جان لاک یہ جانتا تھا کہ اس کی اپنی شخصیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس کی ترقی اس کے آقا کی مرہون منت ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ بہت جلد اس کا زوال شروع ہونے والا ہے۔ ۱۶۷۵ء میں برطانیہ میں سیاسی اٹھل پھٹل ہوئی تو لارڈ آشلے کے تمام عہدے سلب کر لئے گئے، ساتھ ہی جان لاک کے بھی تمام مراتب ختم کر دئے گئے۔

جب سرکاری پابندیوں سے اس کو آزادی ملی تو اس نے برطانیہ کو بھی خیر باد کہا اور مختلف ممالک کے سفر کو نکل گیا۔ وہ کچھ دنوں فرانس میں رہا۔ اس نے ایک بار لکھا تھا کہ اس کو لنڈن کی آب و ہوا کبھی راس نہیں آئی اور وہ ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن آشلے کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس کو لنڈن میں رہنا پڑا۔ اب موقع ملا تو



پھر اس نے فرانس میں جا کر بس جانے کا من بنایا۔ اس دوران اس نے پھر تعلیمی سرگرمیاں شروع کر دیں اور تخلیق کی جانب توجہ دینے لگا۔ جب وہ لارڈ آشلے کے ساتھ تھا تو اس نے اپنی پہلی کتاب Characteristics شائع کی تھی اور اس کی سب سے اہم تخلیق جو غالباً اس نے فرانس میں رہائش کے دوران تخلیق کی تھی Essay Concerning Human Understanding۔ وہ کچھ عرصہ کے لئے ۱۶۷۹ء میں لندن واپس آیا لیکن یہاں کی حکومت کے عتاب کا شکار ہو جانے کا خوف اس پر ہمیشہ طاری رہتا تھا۔ اس لئے کچھ عرصہ تک وہ اپنی رہائش ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرتا رہتا تھا، تاکہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھ سکے۔ آخر کار ۱۶۸۳ء میں وہ ہالینڈ میں مقیم ہو گیا اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اب یہاں سے کہیں نہیں جائے گا اور اپنے نقل مکانی کے رجحان پر قابو پانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس نے یہ اعتراف کیا کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو اس خوف سے آزاد نہیں کر سکا کہ حکومت برطانیہ اس کے خلاف کوئی نہ کوئی قدم اٹھا کر اس کو پریشان کرنے کی کوشش کرے گی۔

برطانیہ میں سیاسی انقلاب کے بعد ۱۶۸۹ء میں پھر وہ واپس انگلینڈ آ گیا اور لندن میں رہنے لگا۔ نئی حکومت نے اس کی خدمات کا اعتراف کیا اور ان کو سراہا اور اس کو برلن میں سفیر بنانے کی پیش کش کی۔ لیکن جان لاک اپنی صحت سے مطمئن نہیں تھا اور اس کو برلن کا ماحول بھی سازگار نہیں لگتا تھا، اس لئے اس نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ لہذا اس کو لندن میں ہی ایک محکمہ کا کمشنر مقرر کر دیا گیا اور اس کو سرکاری رہائش کے طور پر جو مکان دیا گیا، وہ اوٹس کے مقام پر تھا اور اتفاق کی بات یہ کہ اسی مکان کے ایک حصہ میں ایک مشہور فلسفی اور دانشور رہتا تھا۔ جان لاک کو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سیاسی کاموں سے فراغت پانے کے بعد وہ اپنا وقت علمی سرگرمیوں میں گزارتا اور یہی وجہ ہے کہ تخلیقی تعلق سے اس کی زندگی کے آخری کچھ سال بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ وہاں اپنی زندگی کے آخری دن تک رہا اور ۲۸ اکتوبر ۱۷۰۶ء کو انتقال کر گیا۔

جہاں تک جان لاک کے علمی کام کا سوال ہے، تو اس نے ابتدائی دنوں میں اس



طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور سیاسی الجھنوں میں پھنسا رہا۔ برطانیہ واپس آنے سے پہلے اس کی صرف ایک ہی تخلیق کا ذکر ملتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ جب برطانیہ واپس آیا تو اس کی عمر ۵۷ برس کی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے پرانے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اب سیاسی معاملات میں کم سے کم دلچسپی لی اور اپنے آپ کو صرف ان معاملات تک ہی مصروف رکھا جو اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ اس نے اپنا باقی وقت پھر مطالعہ میں صرف کرنا شروع کیا۔ جس زمانے میں وہ اپنی زندگی سفر میں گزار رہا تھا، اس وقت اس نے ایک کتاب ولندیزی زبان میں لکھی تھی۔ برطانیہ آنے کے بعد اس نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اس کو شائع کر دیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ایک بار پھر وہ علمی حلقوں میں شامل ہو گیا۔

ہم یہاں نفسیات کے تعلق سے اس کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس کی پہلی کتاب ہی بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہ نہ صرف فلسفہ میں اپنا مقام رکھتی ہے، بلکہ نفسیات کے بعض اہم موضوعات پر بھی عالمانہ بحث کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کو مکمل کرنے میں اس کے ۱۹ برس لگے۔ وہ خود لکھتا ہے کہ یہ کتاب ایک منصوبہ بند عمل تھا جس کی ابتدا ۱۶۷۰ء میں ہی ہو گئی تھی۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک دن اس کے کمرے میں اس کے پانچ دوست جمع تھے اور اخلاقیات و مذہب موضوع گفتگو تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ہم دوستوں میں یہ گفتگو کئی دنوں تک چلتی رہی، لیکن ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ اس نے سوچا کہ ہم نے شاید اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے مناسب راستہ اختیار نہیں کیا اور بنیادی مسائل کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس وقت اس نے سوچنا شروع کیا کہ اس وسیع اور عریض موضوع پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں اپنی خود کی صلاحیت اور قابلیت پر بھی غور کرنا چاہئے تھا اور اپنی فہم و فراست کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد ان پانچ دوستوں نے یہ کام جان لاک کے سپرد کر دیا اور اس سے کہا کہ تم اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرو اور یہ بتاؤ کہ ہمیں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے



کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے؟

جان لاک لکھتا ہے کہ میں نے کاغذ کا ایک صفحہ لیا تاکہ میں فہم و سمجھداری پر اپنے خیالات کا اظہار کروں اور وہ خیالات اگلی نشست میں اپنے دوستوں کے سامنے رکھوں۔ جان لاک کہتا ہے کہ کاغذ کا وہ صفحہ مضمون کے ابتدائیہ کے لئے ہی نا کافی ہوا اور میں لکھتا رہا اور لکھتا رہا، اور مجھے ایسا لگا کہ یہ موضوع ختم ہی نہیں ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ جس موضوع کو میں اتنا آسان سمجھتا تھا، وہ میری زندگی میں اتنا اہم ثابت ہوا کہ اس پر غور و فکر کے لئے مجھے اپنی زندگی میں آرام و چین کے اوقات کو انیس سالوں کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔ بظاہر اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کتاب اس کے انیس سال کی سوچ کا نچوڑ تھی۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل تھی اور بقول اس کے، یہ اُس وقت بھی نامکمل تھی اور اس نے اس موضوع کو چھوڑا ہی نہیں اور اس پر غور و فکر کے عمل کو جاری رکھا۔ اس کتاب کی پانچویں جلد Conduct of the Understanding کے عنوان سے اس کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے.....

”انسان میں فہمیدگی کی صلاحیت ہی اس کو دوسری مخلوقات میں بلند مقام دیتی ہے۔ لہذا اس صلاحیت کا جائزہ لینا ہی سب سے اہم کام ہے۔ آنکھ کے ذریعہ ہم دُنیا کو دیکھتے ہیں اور دُنیا میں موجود ہر چیز کا ادراک قوتِ باصرہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اس قوتِ باصرہ سے ہمیں اپنی ہی آنکھ دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح فہمیدگی جو ہمیں اشرف المخلوقات ہونے کا شرف دیتی ہے، وہ خود ہماری سوچ سے باہر ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں اسی صلاحیت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔“

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ جان لاک کا ذہن کے بارے میں کیا خیال تھا۔ اس نے ذہن کو کبھی ماڈی چیز نہیں مانا۔ وہ دماغ کو ایک عضو مانتا ہے، ذہن کو ایک غیر مادی شے کہتا ہے اور شعور کو ذہن کی خاصیت کا نام دیتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب کو چار جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی جلد میں اُس نے خلقی یعنی پیدائشی صلاحیتوں اور آئیڈیا



کے بارے میں مناظرہ کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوسری جلد میں آئیڈیا پر تفصیل سے بات کی ہے۔ تیسری جلد میں الفاظ اور لسانی خصوصیات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، اور چوتھی جلد میں علم اور معلومات سے متعلق مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

(نوٹ: Idea کے لئے اردو میں انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ فرہنگ میں تصور عین کی اصطلاح دی ہے لیکن اس اصطلاح سے وہ مفہوم ذہن میں نہیں آتا جس کے لئے جان لاک نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کے مطابق جان لاک نے اس لفظ کا جو مفہوم لیا ہے، وہ کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے..... ”جو شے بلا واسطہ معروض فکر و ادراک میں ہوتی ہے۔“ اس لئے راقم الحروف نے آئیڈیا لفظ ہی استعمال کرنا مناسب سمجھا۔)

جان لاک نے فہمیدگی کی صلاحیتوں کے لئے ذہن میں آئیڈیا کی اہمیت پر زور دیا ہے اور ساتھ ہی اس نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ ذہن میں آئیڈیا کیسے پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر کسی فرد کے ذہن میں کیوں نہیں پیدا ہوتے؟ اس نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی کہ آئیڈیا اور سمجھداری میں کیا رشتہ ہے۔ جان لاک کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے لفظ آئیڈیا کے وسیع مفہوم کو سمجھنے اور بیان کرنے میں ڈیکارٹ کے خیال سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عام لوگوں کے لئے آئیڈیا اور حقیقت میں ایک واضح فرق ہے اور اس نے اس فرق کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس سلسلہ میں اس نے فلسفیانہ بحث کی اور انسان کی زندگی میں آئیڈیا کو فہمیدگی کا ایک اہم ذریعہ بتایا۔ اس نے یہ بھی کوشش کی کہ وہ یہ پتہ لگا سکے کہ آئیڈیا اور تجربہ میں کیا تعلق ہے؟ کیا انسان کے تجربات اس کے ذہن میں نئے نئے خیالات کو جنم دینے کا باعث ہوتے ہیں؟ لاک یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ آئیڈیا ایک خلقی مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرد کی خواہش، غور و خوص اور ارادہ... یہ تین عناصر ایسے ہیں جنہیں ذہنی کارکردگی کہا جاسکتا ہے، جن کی وجہ سے آئیڈیا کا وجود ہوتا ہے۔ اس نے اس سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ آئیڈیا کے تعلق سے تجربات کی اہمیت دو طرح سے ہے۔ اول ہمارے مشاہدہ سے خارجی اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اور ان سے متعلق آئیڈیا وجود میں



آتا ہے۔ دوئم ہمارے ذہن میں جو عمل جاری ہے وہ بھی آئیڈیا کے پیدا ہونے کا ایک سبب ہے۔ اس نے کہا کہ فرد کو خارجی اشیاء کا ادراک حسیت کے ذریعہ ہوتا ہے اور وہ دنیا کی کسی بھی شے کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ لیکن اندرونی طور پر اس کے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں، وہ صرف اس کی ذات تک محدود ہوتے ہیں۔ اس میں خارجی دنیا کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس کو اندرونی حس Internal Sense کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے اس نے Reflection کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا مفہوم اس نے ”غور و فکر کے ذریعہ تجربہ حاصل کرنے سے لیا ہے۔“

اس نے اپنی کتاب میں آئیڈیا کی دو قسمیں طے کی ہیں، ایک کو وہ سادہ آئیڈیا کہتا ہے اور دوسرے کو پیچیدہ آئیڈیا کا نام دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آئیڈیا ذہن کی پیداوار ہوتا ہے اور ذہن کے ذریعہ ہی فہمیدگی کا وجود ہوتا ہے۔ اس لئے ذہن میں آئیڈیا پیدا ہوتا ہے اور ذہن کے ذریعہ ہی اس کو سمجھا جاتا ہے، اور سمجھ جانے کے بعد اس پر عمل ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارا علم رشتوں کی پہچان قائم کرتا ہے اور رشتوں کی پہچان ہمارے ذہن میں ہوتی ہے۔ یہ کوئی مادی شے نہیں ہے اور جو آئیڈیا رشتوں کے تعلق سے ہوگا وہ ذہن میں ایک ترکیبی عمل کے ذریعہ وجود میں آئے گا اور جو آئیڈیا ترکیبی عمل کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، وہ پیچیدہ آئیڈیا کہلاتا ہے۔ آئیڈیا کے بارے میں اتنی تفصیل سے بحث کے بعد جان لاک نے نفسیات میں ایک اہم مقام تو حاصل کر لیا، ساتھ ہی بحث کے لئے کئی نئے موضوع بھی پیدا کر دئے اور یہ سلسلہ اس کی موت کے بعد بھی چلتا رہا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جان لاک نے آئیڈیا کے تعلق سے جو بحث کی، اس کی وجہ سے ماہرین نفسیات کے لئے اس سلسلہ میں غور و فکر کا راستہ کھول دیا۔ ذہن میں غور و فکر کے بعد کوئی خیال آنا اور خارجی دنیا کی کسی شے سے واسطہ پڑنے کے بعد کوئی آئیڈیا پیدا ہونا، یہ دونوں علیحدہ عمل ہیں۔ ان دونوں کو الگ کرنے سے ادراک کی خصوصیات کے سلسلہ میں جو نظریات تھے، ان میں بھی اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا۔



کتاب کے چوتھے حصہ میں جان لاک نے گزشتہ تینوں جلدوں میں بحث کے بعد وہ جن نتائج پر پہنچا ان کا استعمال کرتے ہوئے اس نے ایک ایسے موضوع پر اظہار خیال کیا جس پر دنیا میں سب سے زیادہ بحث ہوتی رہی ہے۔ اس جلد میں اُس نے ”میں کیا ہوں؟ میں کیوں ہوں؟ میں کیسے ہوں؟ اور میری ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟“ جیسے سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس جلد میں خدا کے وجود اور اخلاقیات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے جیسا کہ ڈیکارٹ کے تذکرہ میں بیان کیا گیا کہ اس کے ایک سوال کے جواب میں خود کے وجود کا ثبوت اس کو مل گیا۔ اس طرح جان لاک نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ..... ”میں نے اپنے وجود کو محسوس کیا۔ یہی میرے وجود کا ثبوت ہے اور اس سے زیادہ اس معاملہ میں کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں۔“

اس سلسلہ میں وہ آگے لکھتا ہے کہ.....

”اگر مجھے جسم کے کسی حصہ میں درد محسوس ہوتا ہے تو میرا یہ احساس ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ درد کا وجود ہے۔ ساتھ ہی میرا یہ درد کا احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ جسم کے جس عضو میں درد محسوس ہو رہا ہے، اس عضو کا بھی وجود ہے اور چونکہ وہ عضو جسم کا ایک حصہ ہے، اس لئے جسم کا بھی وجود ہے۔“

..... اس نے لکھا کہ میرا اپنا وجود میرا کوئی آئیڈیا نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جب اس جلد میں اس نے خدا کے وجود سے بحث کی تو اس کے خیالات میں اپنی نوزا کے خیالات سے مماثلت پائی گئی۔ جان لاک نے خدا کے وجود کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ اس نے لکھا.....

”ہمارا وجود ہی خدا کے وجود کا ایک ثبوت ہے۔ جب ایک شخص وجدانی طریقہ پر محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنا وجود رکھتا ہے اور یہ سلسلہ ازل سے چلا آ رہا ہے اور ابد تک چلتا رہے گا۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کوئی



طاقت ہے جو لافانی ہے اور ازل سے ابد تک اس نظام فطرت کو چلا رہی ہے۔ وہی طاقت خالق مطلق ہے۔ وہی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے اور وہی خدا ہے۔“

بیرونی دنیا کے بارے میں اس نے تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ علم کے اصول کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک وجدانیت، یعنی فہمیدگی کی صلاحیت کے ذریعہ خارجی اشیاء کا علم، دوسرا طریقہ دلالت پر منحصر اظہاریت۔ اس نے یہ بھی کہا کہ خارجی دنیا میں خالق مطلق کی ذات اور اپنی ذات کو شامل نہ کیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ.....

”وجدان اور دلالت پر منحصر اظہاریت کے ذریعہ ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے، وہی حقیقی علم ہے اور ان کے علاوہ اگر کسی اور ذریعہ سے ہم کچھ سیکھتے ہیں تو اس کو علم نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ایک عقیدہ یا ایک رائے ہو سکتی ہے۔“

جان لاک اپنے دور کا ایک مشہور فلسفی تھا اور اس کا فلسفہ بہت وسیع اور عریض ہے، جس میں بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے تذکرہ کو اس کتاب میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ اس کی خدمات نفسیات کے لئے بھی قابل ذکر ہیں۔ اس کے فلسفہ کے تمام پہلوؤں پر تو اظہار خیال نہیں کیا جاسکتا، لیکن جن خیالات نے نفسیات کو متاثر کیا ہے ان کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ اس نے ۱۲ کتابیں اپنی زندگی میں شائع کیں اور ان کے علاوہ متعدد مقالات شائع ہوئے، اور پانچ کتابیں اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔ اس نے اپنی تخلیقات میں فلسفہ کا سہارا لے کر مذہبی روایات پر بھی لکھا ہے اور سیاست پر بھی۔ اس کی موت کے بعد شائع ہونے والی کتابوں میں Conduct of the Understanding نام کی کتاب بھی شامل ہے۔ اس کی یہ کتاب اور ۱۶۹۳ء میں شائع ہونے والی Thoughts concerning Education دونوں ہی تعلیمی میدان میں کافی اہمیت رکھتی ہیں اور ان دونوں تصانیف میں اس نے کافی اہم نظریات پیش کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بچے کا ذہن



بہت نازک ہوتا ہے اور اسے آسانی سے ایک سمت سے دوسری سمت موڑا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہم پانی کے لئے جس طرف راستہ بنائیں وہ اُسی طرف بہنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم ایک پوشیدہ توانائی کے ساتھ دُنیا میں آئے ہیں اور اس توانائی کا استعمال کر کے ہم لامحدود علم حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ علم کو کالج یا یونیورسٹی تک ہی محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ اس دُنیا کی وسعت کا اندازہ لگا کر یہ سوچنا ضروری ہے کہ ہمارے اندر علم حاصل کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ یہ دُنیا ہمارے لئے تخلیق کی گئی ہے اور اس کی ہر چیز کی معلومات حاصل کرنا ہی صحیح معنوں میں علم کی تکمیل ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا تھا کہ جب خالق مطلق نے کسی پیغمبر کو تخلیق کیا تو اس کے بعد اس نے دوسرے انسانوں کی تخلیق بند نہیں کی، یہ سوچ کر کہ سب انسانوں سے افضل ایک شخص کا وجود ہو چکا ہے تو اب دوسرے انسانوں کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ اُس نے اس دُنیا کو اور اس میں رہنے والی ہر مخلوق کی تخلیق کو جاری رکھا تا کہ فطرت اپنا کام کرتی رہے اور اس کا پیغمبر اس کی قدرت کا اندازہ لگا سکے اور اس پر یقین کر سکے کیونکہ کسی بھی مسئلہ میں استدلال اور تصدیق ہی کسی فیصلہ کی بنیاد ہے۔

۰۰



# برخ اپسی نوزا

Baruch Spinoza (1632-1677)

سترہویں صدی میں تین بہت ہی عظیم فلسفی گزرے ہیں، جن کے نظریات کے بغیر فلسفہ کا مطالعہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تین فلسفی ڈیکارٹ، لائبنز اور اپسی نوزا ہیں۔ ان تینوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے اور ان تینوں میں کسی بھی وجہ سے فرق پیدا کرنا مناسب نہیں ہے۔ خاص طور پر علم انفس کے مطالعہ کے دوران ان تینوں کا نام بار بار آتا ہے اور ان کے نظریات کی نفسیات میں بہت اہمیت ہے۔ لیکن اپسی نوزا کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ زندگی بھر گمنامی کی زندگی گزارتا رہا اور اس کے قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے درمیان ایک ایسی عہد ساز شخصیت بھی موجود ہے جو مستقبل میں اپنے فلسفیانہ خیالات اور نظریات کی وجہ سے اپنا ایک اہم مقام پیدا کر لے گی اور صدیوں تک اس کی پہچان ایک کلاسیکی فلاسفر کی حیثیت سے قائم رہے گی۔ اپسی نوزا کا فلسفہ بڑی حد تک مذہبی خیالات سے متعلق تھا اور چونکہ مذہبی خیالات براہ راست انسان کی سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے نفسیات میں بھی اس کے نظریات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپسی نوزا کا عہد ڈیکارٹ کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے خیالات پر ڈیکارٹ کے فلسفہ کے اثرات پائے جاتے ہیں، اور کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے کیونکہ اپسی نوزا نے اپنے خیالات میں نظریہ ثنویت کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنی توجہ کا مرکز خدا کے وجود کے بارے



میں بحث کو بنایا ہے اور اس سلسلہ میں وہ اپنے آپ کو ڈیکارٹ کا ہم خیال مانتا ہے۔ دوسری طرف اس نے ڈیکارٹ پر تنقید بھی کی ہے۔ ڈیکارٹ پر اس کتاب میں ایک تفصیلی مضمون شامل ہے۔ اس لئے ہم یہاں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہیں گے لیکن چونکہ اپسی نوزا نے بھی نظریہ ثنویت پر اظہار خیال کیا ہے۔ لہذا اس تعلق سے اس کا ذکر آنا گزیر ہے۔ ڈیکارٹ نے سترہویں صدی کی ابتدا میں ہی افلاطون کے اس نظریہ کو تقویت پہنچائی تھی کہ روح اور جسم دو الگ الگ اکائیاں ہیں اور اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے اس نے ان دونوں اکائیوں کو ہم آہنگ کر دیا تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ اس نے روح کی جگہ ذہن کا لفظ استعمال کیا تھا۔ جبکہ اپسی نوزا نے یہ تو تسلیم کیا کہ جسم اور روح دو الگ الگ اکائیاں ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ دونوں اکائیاں ایک مکمل اور منضبط عملی نظام کے تحت ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

برخ اپسی نوزا (Baruch Spinoza) ۱۶۳۲ء میں ایمسٹرڈم میں ایک درمیانی طبقہ کے خاندان میں پیدا ہوا۔ وہ پرتگالی یہودی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے اس کو ایمسٹرڈم کی مذہبی درسگاہ Talmud Torah میں داخل کر دیا گیا۔ ابتدا سے ہی اپسی نوزا غیر معمولی طور پر ذہین تھا اور اس کے ساتھیوں میں اس بات کا ہمیشہ چرچا رہتا تھا۔ اپنی درسگاہ میں وہ اپنی تعلیم میں اس قدر محو رہتا تھا کہ اس کے ساتھیوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک دن اسی درسگاہ میں ربی (یعنی یہودیوں کا مذہبی رہنما) کی حیثیت سے شامل کر لیا جائے گا۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ حقیقت بالکل مختلف ہوئی۔ اس کو ۱۷ برس کی عمر میں ہی درسگاہ چھوڑنا پڑی اور اپنی تعلیم منقطع کر کے اپنے باپ کی موت کے بعد اس کے کاروبار کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ اس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اس درسگاہ میں گیارہ برس گزارے۔ وہاں مذہبی تعلیم کے تحت توریت کا مطالعہ کیا اور ساتھ ہی ابرانی زبان کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس درسگاہ میں اسی تعلق سے فلسفہ کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ لیکن چونکہ یہ درسگاہ مذہبی بنیادوں پر ہی قائم کی گئی تھی، اس لئے وہاں جو فلسفہ پڑھایا جاتا تھا، اس پر یہودی فلسفہ حاوی تھا۔



اپنی تعلیم منقطع کرنے کے بعد بھی اس نے فلسفہ اور مذہبیات کا مطالعہ جاری رکھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ درسگاہ چھوڑنے کے سات برس بعد اس کو اپنے وقت کی سب سے بڑی سزا دی گئی اور ۲۷ جولائی ۱۶۵۶ء کو اپسی نوزا پر یہودی مذہب کے خلاف نفرت انگیز حرکات کا موجب ہونے اور کافرانہ عمل کا مرتکب ہونے کے الزام میں اس کو یہودی قوم سے نکال باہر کرنے کے احکامات جاری کر دئے گئے۔ یہ احکامات سب کے لئے تعجب خیز تھے کیونکہ اس وقت تک اپسی نوزا کے خیالات سامنے آئے ہی نہ تھے اور اس کے فلسفہ کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ لیکن بعد میں جب اس کے خیالات سامنے آئے تو یہ احساس ہوا کہ اس نے اس وقت کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ اس سلسلہ میں ضرور تبادلہ خیالات کیا ہوگا اور ان رہنماؤں نے اس ڈر سے کہ اور لوگ اس کے ہم خیال نہ ہو جائیں، یہ بات سب سے پوشیدہ رکھی۔ اس سلسلہ میں بعض مفکرین کا خیال ہے کہ ابتداء میں اس کا مقصد یہودی مذہب پر تنقید کرنے کا نہیں تھا بلکہ وہ بعض حقائق میں اصلاح چاہتا تھا لیکن جب اس کو اس سزا کا سامنا ہوا تو اس نے کھل کر یہودیت کے بوسیدہ عقائد کے خلاف تبلیغ کرنا شروع کر دی۔ لیکن یہ تبلیغ بھی صرف اس کے دوستوں اور ملنے والوں تک ہی محدود رہی۔ اس نے اس کو ایک تحریک بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے یہودیت کو خیر باد کہہ دیا اور ساتھ ہی ایسٹرڈم بھی چھوڑ دیا اور ہیگ کے قریب ایک غیر معروف علاقہ میں رہائش اختیار کر لی۔

اس نے ۱۶۶۱ء میں پہلی بار ایک مقالہ *Treatise on the Emendation of the Intellect* کے عنوان سے شائع کیا۔ اپسی نوزا کے اس مقالہ نے فلسفہ سے تعلق رکھنے والے دانشوروں میں اس کی پہچان قائم کی اور اپسی نوزا کی فلسفیانہ فکر کا چرچا ہونے لگا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کا دوسرا مقالہ *Short Treatise on God, Man, and his Well Being* کے نام سے شائع ہوا جس کی وجہ سے اس کے مابعد الطبعیاتی اور علمیات و اخلاقیات سے متعلق اس کے فلسفہ کی وضاحت ہوئی۔



اس سلسلہ میں بعض مفکرین کا خیال ہے کہ وہ اپنے مقالات اپنے نام سے شائع نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے لئے ایک فرضی نام اختیار کر لیا تھا۔ اس نے اپنے نام سے اپنی زندگی میں صرف ایک کتاب شائع کی ہے جو ڈیکارٹ کے فلسفیانہ اصولوں پر تنقید کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کی سب سے اہم اور معرکتہ الآرا تخلیق Ethics کے نام سے اس کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ اس پر اس نے ۱۶۶۳ء میں کام شروع کیا تھا لیکن وہ اس کو اپنی زندگی میں شائع نہ کر سکا۔ اس کی موت کے بعد جب اس کے دوستوں نے اس کے مقالات کی تلاش کی تو اس کتاب کا مسودہ بھی ملا، جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں اس کی زندگی کے تجربات کا انچوڑ ہے اور اس میں اس وقت کے احساسات بھی شامل ہیں جو اس نے مذہبی مرکز میں گزارا تھا۔

ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر اس کی یہ کتاب اس کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو شاید کٹر مذہبی رہنماؤں کی نظر میں اس کے لئے موت کی سزا طے کی جاتی۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی نوزا کی حقیقت اس کی موت کے بعد ہی ظاہر ہوئی اور شاید اہل علم کو اس بات کا افسوس رہا ہوگا کہ ایک بہت ہی عظیم مفکر اور فلسفی ان کے درمیان رہا، لیکن گمنامی کی زندگی گزارتا رہا۔

ایسی نوزا کا فلسفہ خاص طور پر اس لئے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے اس عہد کے نہایت نازک مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور فلسفہ میں ان موضوعات کی شمولیت پر زور دیا تھا۔ اس کی یہ کتاب اگر اس کی زندگی میں شائع ہو جاتی اور اس کے ہم عصر مفکرین کو اس پر بحث کا موقع اس کی زندگی میں ہی مل جاتا، تو اور بہت سے مسائل پر اس کے خیالات کھل کر سامنے آ جاتے۔ اس کتاب میں اس نے کائنات کے بارے میں، انسان اور خدا کے تعلق سے، اور ساتھ ہی خالق مطلق کے بارے میں اس زمانے میں جو تصور تھا، اس پر تنقید کی ہے۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار سخت الفاظ میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ



”خدا اور فطرت کی حقیقت کو سمجھنے میں مذہبی رہنماؤں نے اپنے مفاد کو سامنے رکھا ہے اور ان کی اس کوشش کی وجہ سے انسان اور اس کے خالق میں ایک فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔“

..... اس کتاب میں اس نے کوشش کی ہے کہ انسانیت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہوئے معاشرہ کے بلند اصولوں اور اخلاقی اقدار کی روشنی میں مابعد الطبعیات، فلسفہ انسانیت اور نفسیات کے اصولوں کے ساتھ معبود کی حقیقت تلاش کی جائے۔

اس نے Ethics کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں خدا اور فطرت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ کئی مفکرین کا خیال ہے کہ اس نے خدا کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ سترہویں صدی کے دانشوروں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ.....

”خدا ایک ایسا جوہر ہے جو قائم بالذات ہے اور وہ خود سے ہی وجود میں آیا

ہے۔ خدا..... جیسا کہ میں سمجھتا ہوں..... ایک ذاتِ لامحدود اور لافانی ہے۔“

..... اپنی اس تخلیق میں اس نے مذہب پر زیادہ توجہ دی ہے اور کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ اپنے آپ کو یہودیت سے باہر کرنے کے فیصلہ کے خلاف اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اس کتاب میں خدا اور فطرت کے بارے میں ایک جامع فلسفہ موجود ہے، ساتھ ہی انسانیت اور علمیات پر بھی کافی مواد موجود ہے۔ خدا کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ.....

”خدا (یا ایشور) ایک ایسی ذاتِ لامحدود ہے جو لازمی طور پر لافانی ہے

اور اس کا احساس ہی اس کے وجود کا اخذ صریح ہے، جس کو مزید کسی ثبوت

کی ضرورت نہیں۔“

..... خدا کے اوصاف کو وہ ایک جلوہ کہتا ہے اور اس کے خیال میں خدا کا ہر وصف اس کے وجود کا ثبوت ہے۔

اس سلسلہ میں اگر اس کے فلسفہ کے مرکزی خیال کو اختصار کے ساتھ بیان کیا



جائے تو اس کے چند اقوال سے ہی اس کے خیالات کی کسی حد تک عکاسی ہو جاتی ہے۔ ”خدا ہی فطرت ہے اور فطرت ہی خدا ہے۔“ اس نے یہ تسلیم کیا کہ نوع انسانی اشرف المخلوقات ہے اور دنیا کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے اور انسان کو اس لئے تخلیق کیا گیا ہے کہ وہ اپنے خالق مطلق کی عبادت کرے۔

”انسان اپنی ذات میں اور ذات سے باہر بھی ہر چیز سے کچھ نہ کچھ استفادہ کرتا ہے، تاکہ وہ اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کر سکے۔“

”یہ کائنات خود ہی نہیں بن گئی۔ کائنات کا خالق خدا ہے کیونکہ کوئی مادی یا غیر مادی چیز خود بخود وجود میں نہیں آتی۔“

”خدا کوئی معجزہ نہیں اور نہ وہ کوئی معجزہ دکھاتا ہے، کیونکہ اس کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ انسان کے لئے جو مظاہر معجزہ ہیں وہ خدا کے وجود کا ثبوت ہیں جن کو ہم اپنی لاعلمی کی وجہ سے ایک معجزہ سمجھ لیتے ہیں۔“

اس بات کو واضح کرنے کے لئے اس نے ایک مثال دی کہ اگر دو آدمی ایک ہی راستہ پر ساتھ ساتھ چل رہے ہوں اور ان میں سے ایک کے سر پر اچانک اوپر سے ایک پتھر گر پڑے اور وہ وہیں مر جائے تو یہ واقعہ بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً وہ پتھر اسی شخص کے سر پر ہی کیوں گرا؟ دوسرا شخص کس طرح محفوظ رہا اور اس کے لئے یہ واقعہ ایک معجزہ مانا جائے گا۔ اس سلسلہ میں سینکڑوں سوال کئے جائیں تو ان کا کوئی جواب نہیں کہ پتھر اس ہی کے سر پر کیوں گرا؟ سوالات کا سلسلہ اس وقت ختم ہو گا جب یہ کہہ دیا جائے کہ خدا کی یہی مرضی تھی۔

وہ کہتا ہے کہ یہ سوچنا صحیح نہیں کہ فطرت کے عناصر انسان کی مرضی سے حرکت کرتے ہیں بلکہ خالق مطلق نے ان کے افعال طے کر دیے ہیں اور دنیا کی ہر چیز فطرت کے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے۔ ”فطرت کے مطابق کوئی چیز غیر یقینی نہیں۔ ہر شے ایک طے شدہ حقیقت ہے اور کسی نہ کسی ضرورت کے تحت اس کی تخلیق کی گئی ہے اور اس کا وجود فطرت پر کسی نہ کسی طرح ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔“ اس کا خیال ہے



کہ..... ”ہر چیز کی تخلیق اسی شکل میں ممکن تھی جس شکل میں وہ موجود ہے، اس کے علاوہ کسی اور شکل میں یا کسی اور طریقہ سے اس کی تخلیق ممکن نہیں تھی۔“ اس نے لکھا تھا کہ حالانکہ مختلف اشیاء کا خالق مطلق پر انحصار مختلف طریقوں سے اور مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ پھر بھی کچھ چیزیں کائنات کے اصولوں کی طرح ایک مخصوص نظام کے تحت کام کرتی ہیں تو کچھ یقینی طور پر خالق مطلق کی صفات کی شکل میں ظہور میں آئی ہیں۔ یہ صفات کائنات میں ابدی حیثیت رکھتی ہیں اور دُنیا کو دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان میں کائنات کے وہ تمام اصول شامل ہیں جو کائنات پر چھائے ہوئے ہیں اور جو ہر چیز کو ایک خاص شکل میں رکھنے اور ایک خاص حالت میں عمل کرنے کے لئے ضروری ہیں اور ان صفات کی وجہ سے دُنیا کے تمام اُمور منظم طریقہ پر کاربند رہتے ہیں۔ اس کے خیال میں خالق مطلق کی صفات کی ایک شکل انسان میں فکر کی صلاحیت ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مخصوص اور انفرادی اشیاء اصول علت کے تحت خالق مطلق سے فاصلہ پر ہیں اور وہ خدا کی صفات کی نشانیاں ہیں یا وہ ایسے ذرائع ہیں جن کے ذریعہ خدا کی صفات کسی خاص شکل میں یا کسی خاص حالت میں دُنیا میں واضح ہوتی ہیں۔ ایسی نوزا کے خیال میں مخصوص اشیاء کی تخلیق اور ان کے وظائف دواہم اصولوں کے پابند ہیں۔ اول فطرت کے وہ عام اصول ہیں جو قدرتی طور پر لازمی قرار دئے گئے ہیں اور جن کا اطلاق فطرت پر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک مخصوص شے دوسری کسی بھی شے جو اس سے تعلق پیدا کرتی ہے، متاثر ہوتی ہے۔ اس نے Ethics میں اکثر مقامات پر جوہر کا ذکر کیا ہے اور اس کو لے کر بہت سے مسائل وضع کئے ہیں۔ مثلاً.....

- ۱۔ ایک جوہر اس کے اوصاف سے پہلے وجود میں آتا ہے۔
- ۲۔ دو ایسے عناصر جو الگ الگ اوصاف رکھتے ہیں، ان میں کوئی بات مشترک نہیں ہوتی۔ یعنی اگر دو عناصر کی خصوصیات میں یکسانیت نہیں تو وہ دونوں عناصر مختلف ہیں۔



۳۔ ایک جو ہر کسی دوسرے جو ہر کو پیدا نہیں کر سکتا۔

۴۔ ہر جو ہر لازمی طور پر لامنتہائی ہوتا ہے۔

۵۔ کسی عنصر کی جتنی حقیقت واضح ہوگی، اتنے ہی اس کے وظائف زیادہ ہوں گے۔

۶۔ کسی جو ہر کی خصوصیات کا ادراک بذات خود اس جو ہر کے ذریعہ ہونا لازمی ہے۔

۷۔ کسی جو ہر کی کوئی صفت ایسی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس کو منقسم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ہر وہ جو ہر، جو لامنتہائی ہے، غیر منقسم بھی ہے۔

اپنی نوزانہ کئی مقامات پر نوع انسان کو اشرف المخلوقات کہا ہے اور اس کے خیال میں نو انسان کی تخلیق خدا کے سب سے اہم وصف کو ظاہر کرتی ہے۔ اس نے اپنے فلسفہ میں ایک مقام پر انسان کو اہمیت دیتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ انسان میں خدا کے اوصاف اس حد تک موجود ہیں کہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انسان کہیں خدا ہی کا ایک جز تو نہیں۔ اس کے اس بیان کی وجہ سے اس پر کافی تنقید کی گئی اور ناقدین کا خیال تھا کہ انسان کو خدا کا ایک جز تسلیم کرنے سے خدا کا مادی ہونا طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنی نوزا پر دہریا اور ملحد ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ مگر اس کا جواب دینے کے لئے اپنی نوزا دُنیا میں موجود ہی نہیں تھا۔

ڈیکارٹ نے سترھویں صدی کی ابتداء میں نظریہ ثنویت Dualism پیش کیا تھا، جس کی رو سے اس نے کہا تھا کہ ذہن اور دماغ (بھیجہ) دو الگ الگ عناصر ہیں۔ دماغ جسم کا ایک عضو ہے جو مادی شے ہے۔ جبکہ ذہن ایک غیر مادی چیز ہے لیکن اس کا مرکز دماغ ہے اور ذہنی افعال دماغ کے وظائف کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔ ڈیکارٹ کے اس نظریہ کے بعد مفکرین نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کس طرح جسم اور ذہن جیسے دو عناصر، جو بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہم عملی کے ذریعہ ایک ہو جاتے ہیں؟ ایسے وقت میں اپنی نوزا نے اپنا نظریہ Double Aspect Theory پیش کیا، جس کے مطابق اس نے خیال ظاہر کیا کہ ذہن اور جسم کے افعال کا ایک ہی مرکز ہے جو الگ الگ شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں ذہنی اعمال



اور جسمانی اعمال کے پس پشت ایک ہی توانائی کام کرتی ہے۔

اپنی نوزا کے فلسفہ میں خالق مطلق کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیالات اسلامی فلسفہ سے متاثر ہو کر قائم کیے گئے ہیں اور مذہب کے تعلق سے اس کے خیالات میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ کا مطالعہ کیا ہو۔ کیونکہ جب وہ خالق مطلق کے اوصاف کے بارے میں ذکر کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے اسلام کا نام لئے بغیر اس مذہب کے فلسفہ کا ذکر کر رہا ہو۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف کا یہ خیال اس لئے ہے کہ اس کے بارے میں ایک مضمون میں محمد الفرابی اور ابن طفیل کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ محمد الفرابی نویں صدی عیسوی میں ترکمانیہ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے وقت کا ایک مشہور عربی فلسفی تھا اور اپنے آپ کو افلاطون کا پیرو سمجھتا تھا اور افلاطونی فلسفہ کو عربی میں اس کے خیالات نے کافی تقویت پہنچائی۔ عام طور سے اس کو پہلا اسلامی Neoplatonist یعنی اشراقی سمجھا جاتا ہے۔ (اس کے لئے اردو میں نوافلاطونیت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایک مکتب فکر تھا، جس کی ابتدا تیسری صدی عیسوی میں اسکندریہ میں ہوئی۔ اس مکتب فکر کا خیال تھا کہ کائنات اس توحید یا خالق کل کا مظہر ہے اور روح دوبارہ خالق کل کے نزدیک جمع ہو جاتی ہے اور اسی مقصد سے ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگی تلاش کرنے کے لئے افلاطونی تعلیمات میں ترمیم کی تھی۔ اس مکتب فکر کے ماننے والوں کو اشراقی کہتے تھے۔)

اپنی نوزا کے جو مقالات شائع ہوئے، ان کے بارے میں کچھ مفکرین کا خیال تھا کہ اس کے دوستوں نے ان میں کچھ ترمیم کی تھی تاکہ موت کے بعد بھی اپنی نوزا یہودی انتہا پسندوں کی تنقید سے محفوظ رہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے مقالات میں کبھی اسلام یا عیسائیت کی حمایت میں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن یہودیت پر سخت تنقید کرنا اور اس مذہب کا پیرو ہوتے ہوئے اس کے اصولوں سے اتنا منحرف ہو جانا کہ یہ زندگی کا سب سے سنگین گناہ مانا جائے اور اس کو اتنی سخت سزا دی جائے کہ



مذہب سے خارج کر دیا جائے، یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ ضرور کسی دوسرے مذہب سے متاثر تھا۔

اس نے گیارہ سال کی مدت ایمسٹرڈم کی یہودی درسگاہ میں گزاری۔ اس درسگاہ میں ابرانی زبان کا سیکھنا لازمی تھا اور اسی زبان میں توریت کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس مدت میں اس نے ابرانی زبان سیکھی اور اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اس زبان کا گرامر مرتب کی۔ اس درسگاہ میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا تھا، وہ بھی، ظاہر ہے اُن عقائد سے متاثر ہوگا جن عقائد کی تبلیغ کے لئے یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی۔ اپنی نوزا کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس درسگاہ سے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی، بلکہ اس سلسلہ کو درمیان میں ہی منقطع کرنا پڑا کیونکہ اس کے والد کی موت کے بعد اس کو اپنے کاروبار کی جانب توجہ دینی تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی بھی عیسائیت کی حمایت نہیں کی اور ایک مقام پر اس نے یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ خدا کسی انسان کا باپ بھی ہو سکتا ہے، چاہے مجازی ہی سہی۔ لیکن عیسائیوں کے کیتھولک مسلک نے اپنی نوزا کے فلسفہ سے مذہبی طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے کئی مضامین ملتے ہیں جن میں صاف طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اپنی نوزا نے عیسائیت کے اصولوں کو تسلیم کر لیا تھا اور یہودیت سے منحرف ہو گیا تھا۔ ان مضامین میں اپنی نوزا کے ان خیالات کا حوالہ دیا تھا جو اس نے ابرانی قوم کے بارے میں قائم کر لیے تھے۔ اپنی نوزا نے ایک بار کہا تھا کہ ابرانی قوم کا یہ خیال، کہ خدا نے اُن کو ہی اپنی پسندیدہ اُمت منتخب کیا ہے، غلط ہے۔ اس نے کہا تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ ابرانی قوم اپنے آپ کو دوسری قوموں سے برتر سمجھتی ہے کیونکہ بقول ان کے، خدا نے ان کی سرپرستی قبول کی ہے۔ ان کا یہ خیال بچکانہ ہے۔ البتہ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ فہم و فراست اور دانشوری میں ابرانی قوم دوسری قوموں سے برتر نہ ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا سماجی ڈھانچہ دوسری قوموں سے بہتر تھا اور اسی وجہ سے ان کی تہذیب اور تمدن پر بھی اس کے اچھے اثرات تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”اب قدیم قومی سرمایہ ختم ہو چکا



ہے اور ابرانی (یہودی) قوم اپنی برتری گنوا چکی ہے، کیونکہ جن خصوصیات کی وجہ سے، بقول ان کے، خدا نے ان کا انتخاب کیا تھا، وہ خصوصیات اب ختم ہو چکی ہیں۔ اس لئے یہودیوں کو اب کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو سب قوموں سے بہتر سمجھیں اور اپنی ہی قوم کو فوقیت دیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، اپسی نوزا کی چار تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔ ان میں سے ایک جس میں اس نے ڈیکارٹ کے فلسفہ پر تنقید کی تھی، اس کی زندگی میں اسی کے نام سے شائع ہوئی۔ دوسری تخلیق، جس نے اس کو دانشوروں میں ایک اہم مقام دلایا، وہ Ethics کے نام سے اس کی موت کے بعد شائع ہوئی اور اس کا انگریزی

میں ترجمہ ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ تیسری تخلیق Theological- Political Treatise کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ اس کے مقالات کا مجموعہ تھا اور یہ بھی اس کی موت کے بعد اس کے دوستوں نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں تو بہت پہلے ہو گیا تھا، لیکن انگریزی میں اس کا ترجمہ، جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، ۱۹۵۲ء میں ہی شائع ہوا۔ اس کی یہ تخلیق انگریزی میں Ethics سے زیادہ مقبول ہوئی۔ ان دونوں کتابوں کے شائع ہونے کے بعد ہی اپسی نوزا کی شہرت انگریزی داں لوگوں تک پہنچی اور اس کے بعد اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کا کام شروع ہوا۔ اس کے فلسفہ کو انگریزی زبان میں تفصیل سے پیش کرنے کا کام ۱۹۳۴ء میں شروع ہوا، جب

Harry Wolfson اپسی نوزا پر تحقیق کے بعد اپنی تخلیق The Philosophy of Spinoza کے نام سے شائع کی۔ اس کے بعد اسپینوزا کے کام کی تلاش شروع کی گئی اور اس پر تحقیقی مقالات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو آج بھی جاری ہے اور اس سلسلہ میں امریکہ کی کیمرج اوریل یونیورسٹی اہم خدمات انجام دے رہی ہیں۔



# فرانس گیلٹن

Francis Galton - (1822-1911)

اُنیسویں صدی میں پیدا ہونے والے بے شمار فلسفی اور دانشوروں کی فہرست میں ایک ایسا بھی نام ہے جس نے نہ صرف فلسفہ میں، بلکہ جغرافیہ اور سائنس میں بھی کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ خاص طور پر علم بشریات میں اس کی تحقیقات نے سائنس کے بعض شعبوں میں نئے نظریات پیش کئے اور اسی وجہ سے اس وقت رائج بعض نظریات پر نظر ثانی کی ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی۔ ہم جس کا ذکر کر رہے ہیں اس کا نام فرانس گیلٹن تھا، جس کی شہرت برطانیہ میں اس لئے عروج پر پہنچی کیونکہ اس نے بہت چھوٹی عمر میں جغرافیہ میں نئے اُفق تلاش کئے تھے، ساتھ ہی اس نے علم بشریات (فلسفہ انسانیات) Anthropology میں بھی ایک اہم مقام حاصل کیا تھا اور اس کے علاوہ اس نے علم اصلاح نسل انسانی کا نظریہ بھی پیش کیا اور اس کے لئے Eugenics کی بنیاد ڈالی۔ نفسیات سے بھی اس کا تعلق ہے، کیونکہ اس نے اپنے کچھ نظریات کی وجہ سے علم انفس کو بھی ایک نیا موڑ دیا۔

وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ ہر انسان اپنی جسمانی ساخت اور اپنے چہرے مبرے کے تعلق سے دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتا ہے، بلکہ اپنی نفسیاتی خصوصیات اور ذہنی صلاحیتوں کے تعلق سے بھی دوسرے افراد سے بہت کم مماثلت رکھتا ہے۔ فرانس گیلٹن کا خیال تھا کہ دو افراد میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی پیمائش کا کوئی طریقہ ایجاد کرنا



چاہیے۔ وہ یہ بھی سوچتا رہتا تھا کہ فرد کے مزاج کی کیفیت اور اس کے سوچنے کے انداز پر اس کی ارثی خصوصیات کس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں، اور اس کا ماحول اس سلسلہ میں کیا رول ادا کرتا ہے۔ اس کی بھی تحقیق ہونی چاہئے۔ کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ اس کے مضامین اور اس کے خیالات ہے آگے چل کر جنس پر تحقیقات کا ایک ذریعہ بنے۔ اس کی ایک اہم تصنیف Hereditary genius: An enquiry into its laws and consequences ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی، تو اس نے مفکرین کو سوچنے پر مجبور کیا۔ اپنی اس تصنیف کی وجہ سے فرانس گیلٹن نے ایک نفسیات داں کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان بنالی۔

سر فرانس گیلٹن چارلس ڈارون کا خالہ زاد بھائی تھا اور ڈارون سے ۱۳ برس چھوٹا تھا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے گویا سائنسی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور اس نظریہ کی وجہ سے سائنس کے بہت سے شعبے متاثر ہوئے تھے۔ اس وقت فرانس بھی انسان میں ارثی خصوصیات کی اہمیت پر اپنی توجہ مبذول کیے ہوئے تھا۔ ڈارون کے نظریہ کے بعد فرانس کی سوچ کو تقویت ملی اور اس نے اپنے کام میں اب اور دلچسپی دکھائی اور اس پر تیزی سے عمل شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم کی ابتداء ہو چکی تھی اور اس وقت فوج میں بھرتی کے لئے ذہانت کی پیمائش پر زور دیا جانے لگا تھا۔ فرانس کا خیال تھا کسی فرد کی ذہانت کا معیار ماحول کے ساتھ تبدیل ہو سکتا ہے، کیونکہ فرد کی ذہانت کا تعلق جتنا اس کے ارث سے ہے، اتنا ہی اس کے ماحول سے بھی ہے، جہاں اس کی تربیت ہوئی ہے یا جہاں اس کی پرورش کی گئی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس زمانے میں حالانکہ ذہانت کی پیمائش کا طریقہ عام نہیں ہوا تھا، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرانس کی ذہانت کا معیار بہت اونچا تھا اور فرانس کا خود اپنے بارے میں یہی خیال تھا کہ اس کی ذہانت کا جو معیار ہے، اس کی وجہ ارثی خصوصیات کے ساتھ اس کے اس ماحول کا بھی بڑا ہاتھ ہے جہاں اس نے پرورش پائی ہے۔

فرانس گیلٹن ۱۸۲۲ء میں برمنگھم کے قریب ایک شہر میں ایک متول خاندان



میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا گھرانہ تعلیم یافتہ کہلاتا تھا اور خاص طور پر سائنس سے دلچسپی رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس کے خیالات میں بھی سائنس سے متعلق خیالات گردش کرتے رہتے تھے۔ اس کا اپنے بارے میں خیال تھا کہ سائنس اور فلسفہ کی جانب رجحان کسی حد تک ارثی خصوصیات کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کے ذہن پر اُس ماحول کے اثرات زیادہ ہیں، جس ماحول میں اس نے تربیت حاصل کی ہے۔ وہ ابتداء سے ہی یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ سائنس کے میدان میں وہ کوئی اہم کارنامہ انجام دینے والا ہے۔ اس کا یہ خیال اس وقت سے اس کے ذہن میں ابھر کر آیا تھا، جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔

فرانس نے بائیس سال کی عمر میں کیمرج سے گریجویشن مکمل کر لیا۔ اسی سال اس کے والد کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ شاید اب وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیمرج میں تعلیم کے دوران اس نے جغرافیہ میں کافی دلچسپی لی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ وہ جغرافیہ سے متعلق مہمات میں حصہ لے کر نئے افق تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ جغرافیہ کو سائنس سے مربوط کر دے اور سائنٹفک اصولوں کے استعمال سے دُنیا کے سامنے نئے تصورات پیش کرے۔

فرانس کے چچا زاد بھائی ڈگلس گیلٹن نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ رائل جغرافیکل سوسائٹی میں داخل ہو کر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ فرانس نے اس مشورہ کو فوراً تسلیم کر لیا اور لندن میں اس سوسائٹی میں داخل ہو گیا۔ سوسائٹی میں اس نے غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور تقریباً تمام مہمات میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے سوسائٹی کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ افریقہ کے ایک ایسے علاقہ میں، جہاں انسانی قدم اُس وقت تک نہیں پہنچ پائے تھے، ایک مہم کا منصوبہ بنایا جائے۔ بظاہر یہ ایک بہت ہی مشکل مہم تھی اور اس کو انجام دینا..... یعنی خطرات کو دعوت دینا تھا۔ لیکن فرانس نے اس سلسلہ میں بے انتہا ہمت اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا اور سوسائٹی کو اس منصوبہ کی منظوری پر راضی کر لیا۔ فرانس دو سال تک اس مہم میں مصروف رہا اور اس



عرصہ وہ دُنیا سے بالکل لاتعلقی سا رہا۔ اتنے طویل عرصہ تک اس کی کوئی خبر نہ ملنے سے سوسائٹی اس مہم میں حصہ لینے والوں کی زندگی سے مایوس ہو گئی لیکن اچانک فرانس کا پیغام ملا اور اس نے سوسائٹی کو اپنی کامیابی سے باخبر کیا۔ دو سال بعد ۱۸۵۲ء میں جب وہ اس مہم سے لوٹا تو اس علاقہ کے بارے میں ایسی معلومات ساتھ لایا جس نے دُنیا میں دھوم مچا دی۔ اس نے افریقہ کے اس علاقہ کے بارے میں ایسی معلومات فراہم پہنچائیں جو اس وقت تک دُنیا کی نظر سے پوشیدہ تھیں۔ اس مہم کی کامیابی سے فرانس نے جغرافیہ میں بھی اپنی شخصیت کی ایک پہچان قائم کر لی اور سائنس کے حلقوں میں بھی وہ ایک مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کو رائل جغرافیکل سوسائٹی کی فیلوشپ سے نوازا گیا اور برطانیہ کی حکومت نے اس کو ”سر“ کا خطاب عطا کیا۔

سرفرانس نے اپنی سکونت مستقل طور پر لندن میں ہی اختیار کر لی۔ اس نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی بلکہ اس نے رائل جغرافیکل سوسائٹی کے علاوہ Royal Society , Anthropological Institute اور Association of Advancement of Science جیسے اداروں سے متعلق منصوبوں سے اپنے آپ کو جوڑے رکھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ میری وجہ سے ان اداروں کو کیا فائدہ ہوا، یہ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن ان اداروں کی وجہ سے مجھے بہت فائدہ ہوا کہ دُنیا کے مشہور اور برگزیدہ سائنسدانوں سے رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا اور اس طرح وہ اپنی مہمات کے نتائج کے بارے میں ان کے خیالات سے مستفید ہوتا رہا۔

فرانس گیلٹن نظریاتی بحث کا قائل نہیں تھا بلکہ وہ تجربات کے نتائج اور کمیتی شہادتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ ”جہاں تک ہو، پیمائش اور شمار کرو“۔ مثال کے طور پر دُنیا کا موسمی نقشہ تیار کرنے کے لئے اس نے ایک سوالنامہ مرتب کیا، جس کے ذریعہ اس کا مقصد تھا کہ مخصوص تاریخوں میں جو موسمی تبدیلیاں ہوتی ہیں، ان کی معلومات حاصل کی جاسکے۔ اس نے یہ سوالنامہ موسمی حالات کا پتہ لگانے والے یورپ کے تمام اداروں کو اور موسم سے متعلق تحقیق میں مشغول تمام تجربہ گاہوں کو روانہ کر دیا۔



۱۸۶۳ء میں جب اس کو تمام اداروں سے یہ معلومات حاصل ہوئیں تو ان کی بنیاد پر پورے یورپ کے موسم کے تعلق سے ایک نقشہ تیار کیا گیا۔ دُنیا میں اپنے طرز کی یہ پہلی کوشش تھی جو بعد میں جغرافیہ دانوں کے لئے رہنما ثابت ہوئی۔ اس نقشہ کے سبب بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور کئی راز آشکار ہوئے اور جدید نظریات کی بنیاد پڑی۔ جغرافیہ کے موضوع پر سرفرائس کی کوششوں کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔ اس نے ۱۸۶۴ء میں Anticyclone کی دریافت کی۔ ۱۸۷۵ء میں پہلی مرتبہ ملک کے اخبارات میں موسم سے متعلق معلومات اور آنے والے موسم کے حالات شائع کرنے کی ابتدا کی جو آج تک دُنیا بھر میں رائج ہے۔

فرانس گیلٹن Anthropology Institute سے بھی متعلق تھا اور اس موضوع پر بھی اس کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ Anthropology کے لئے اُردو میں علم بشریات (یا بعض کے مطابق علم انسانیات) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس نے اس علم کو سائنس کے ایک شعبہ کی حیثیت دی۔ آج بھی یہ ایک سائنس ہے، جس کے ذریعہ نسل انسانی کے ابتدائی حالات کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں چار زاویوں سے تحقیقات کی جاتی ہیں، علم ارضیات کے ذریعہ حاصل کی گئی آثار قدیمہ کی معلومات کی بنیاد پر، سماجی اور ثقافتی لحاظ سے جو مختلف ادوار میں فرق پایا جاتا ہے، اس کے اسباب اور اثرات پر بحث کرنا..... تیسرے، حیاتیاتی زاویہ سے ماضی کی نسل اور موجودہ نسلوں میں اگر کوئی فرق ہے تو اس کی وجوہات معلوم کرنا..... اور چوتھے، انسانی زاویہ سے مختلف اداروں کی تحقیقات کو بنیاد بنا کر اور ان کی مدد لے کر ماضی میں موجود نسلوں کا جائزہ لینا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ فرانس گیلٹن اکثر سوچا کرتا تھا کہ ہر فرد جسمانی ساخت کی بنا پر ہی نہیں، اور بہت سی باتوں میں دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنے مزاج اور نفسیاتی خصوصیات کی بنا پر بھی دو افراد میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ ذہنی طور پر بھی دو افراد میں نمایں فرق ہوتا ہے۔ کسی ایک بات کا اثر دو افراد پر



یکساں ہو، یہ کوئی ضروری نہیں۔ یا پھر کسی ایک شے کے بارے میں مختلف لوگوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں۔ فرانس نے اپنا بہت سا وقت اس کوشش میں صرف کیا کہ وہ اس تفریق کے اسباب کا پتہ لگا سکے۔ پھر اس نے سوچا کہ دو افراد کے مختلف اعضاء میں جو فرق پایا جاتا ہے، اس کا اس کی شخصیت سے کوئی واسطہ ہونا چاہیے۔ اس لئے اس نے کوشش کی مختلف اعضاء کی پیمائش کے بعد اس راز سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔ اس خیال کو ذہن میں رکھ کر اس نے تحقیقات کا ایک طویل سفر طے کیا۔ اس نے نباتات اور حیوانات پر بھی بے شمار تجربات کئے، برسہا برس تک کئی جڑواں بچوں پر تحقیق کرتا رہا اور ان کو مستقل اپنے مشاہدہ میں رکھا۔

اس سلسلہ میں مزید تحقیقات کرنے کی غرض سے اس نے ایک اور سائنسی شعبہ کی بنیاد رکھی جس کو اس نے Anthropometry کا نام دیا۔ فرانس گیلٹن کا خیال تھا کہ انسان کے جسم کے مختلف حصوں کی پیمائش کے ذریعہ اس موضوع پر کوئی اصول وضع کیا جاسکتا ہے۔ اس خیال کو ذہن میں رکھ کر اس نے ۱۸۸۴ء میں لندن میں ایک تجربہ گاہ قائم کی، جس میں وہ لوگوں کے جسم کے مختلف اعضاء کی پیمائش کیا کرتا تھا۔ وہاں آنے والوں کی قوتِ باصرہ اور دیکھنے کی صلاحیت، قوتِ سامعہ کی پیمائش، رنگوں کے احساس، کھینچنے اور گرفت کی صلاحیت کی پیمائش، انسانی جسم کی اونچائی، جب وہ کھڑا ہو، اُس وقت بھی اور جب وہ بیٹھا ہو، اُس حالت میں بھی، مختلف اعضاء کی موٹائی وغیرہ معلوم کرنا۔ اس نے اپنی تجربہ گاہ میں ایک ایسا آلہ تیار کیا تھا جس کے ذریعہ ان تمام پہلوؤں سے پیمائش مکمل ہو جاتی تھی۔ مارگن اور کنگ نے اپنی کتاب Introduction to Psychology میں ایک پوسٹر کی فوٹو کاپی شائع کی ہے، جس میں فرانس گیلٹن نے عام لوگوں کو دعوت دی تھی کہ وہ Anthropometry کے ذریعہ اپنے جسم کے مختلف حصوں کی پیمائش کرائیں۔ اس سے اُس کا مقصد تھا کہ اس طرح جو معلومات حاصل ہوں گی، اُن کی بنیاد پر تحقیقات کو آگے بڑھایا جائے گا۔ لیکن مسلسل چھ سال تک اس منصوبہ پر کام کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی محنت رائیگاں جا رہی ہے



کیونکہ اس کے نتائج سے کوئی خاص اصول وضع نہیں کیا جاسکا۔ اس نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ انسان کے جسمانی اعضاء کی پیمائش کے ذریعہ انسان کی ذہنی صلاحیت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ فرانس اپنی کوشش میں ناکام ہوا، لیکن ماہرین انفسیات اس بات سے متفق ہیں کہ فرانس کی اس کوشش سے ذہانت کی پیمائش کا ایک تصور سامنے آیا اور انسان کی ذہانت کی پیمائش کی ضرورت محسوس کی جانے لگی، کیونکہ اس نے اپنی ان کوششوں کے درمیان ایک بات کا پتہ لگایا تھا کہ جو لوگ ابطائے ذہنی کا شکار تھے، ان میں کچھ پیمائشیں یکساں تھیں۔ اس بات سے اس نے خیال ظاہر کیا کہ اگر مزید تحقیقات کی جائیں تو فرد کی ذہانت کے معیار کی پیمائش بھی کی جاسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں تحقیقات کے دوران ایک اور بہت ہی اہم بات معلوم ہوئی، جس کا استعمال آج بھی دنیا بھر میں کیا جاتا ہے۔ اس نے پتہ لگایا کہ ہر فرد کی انگلیوں کے نشان مختلف ہوتے ہیں اور ان میں کوئی یکسانیت نہیں ہوتی۔ اس کی یہ دریافت ابتدا میں تو نظر انداز کر دی گئی، لیکن سائنس نے ترقی کی اور جرائم سے متعلق امور پر اور زیادہ زور دیا جانے لگا، تو معلوم ہوا کہ جرم شناسی کے لئے گیلٹن کی یہ دریافت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سلسلہ میں تحقیقات کے دوران اس نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے فرد اپنے والدین سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے۔ چونکہ سائنس کے اس شعبہ سے متعلق اس کے پاس معلومات کا خزانہ جمع ہو گیا تھا اور اس نے یہ کوشش کی کہ اپنی ان معلومات اور علم ریاضی کی مدد سے اس سلسلہ میں کوئی تعلق معلوم کرنا چاہئے۔ ابتدا میں تو اسے کوئی کامیابی نہیں ملی، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور اس نے ۱۸۸۸ء میں Correlation coefficient یعنی ہم رشتگی کی شرح کا تصور پیش کیا۔ رایل سوسائٹی نہ صرف اس کے ہم رشتگی کی شرح کے نظریہ کو تسلیم کیا بلکہ اس کو فیلوشپ سے بھی نوازا۔ کیونکہ اس وقت سائنس میں یہ ایک اہم دریافت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ تکنیک اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی اور اس کو سنوارنے اور نکھارنے کا کام بعد میں آنے والے ماہرین نے کیا۔ آج بھی فرانس گیلٹن نے سائنس اور فلسفہ میں جو اہم



کام انجام دئے، اُن میں سب سے زیادہ اہمیت Correlation coefficient کی دریافت کو ہی دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں میڈیکل سائنس میں جو پیش رفت ہوئی اور اُس کے نتیجہ میں جینیٹکس سائنس کا شعبہ وجود میں آیا تو اس کی بنیاد دراصل فرانسیسی کیلٹن کا یہی نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے متاثر ہو کر فرانس کیلٹن یہ سوچا کرتا تھا کہ فرد اپنے آبا و اجداد سے ارث میں کیا حاصل کرتا ہے اور اس میں کیا کچھ حیوانی خصائص بھی موجود ہوتے ہیں یا موجود ہوا کرتے تھے جو آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ چارلس ڈارون کے نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان میں جو خصائص اس کو نسلی طور پر ارث میں ملتے ہیں، ان میں ماحول کے تعلق سے تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ اس نکتہ پر غور و خوص کے بعد اس نے ۱۸۸۳ء میں ایک نیا نظریہ پیش کیا کہ نسل انسانی میں قدیم زمانے سے آبا و اجداد کی جو خامیاں منتقل ہوتی آرہی ہیں، اُن کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اس نے اس کو بھی ایک سائنٹیفک تحقیق کا نام دیا اور اس کو Eugenics کی اصطلاح دی اور اس کا مفہوم اس کی نظر میں یہ تھا کہ..... ”سائنس کا ایک شعبہ جو اصلاح نسل کے تعلق سے مختلف موضوعات پر بحث کرتا ہے۔“ اُردو میں اسے ”علم اصلاح نسل انسانی“ کہا جاسکتا ہے۔ فرانسیسی کیلٹن نے اس نظریہ کی تشہیر کے لئے لندن میں ایک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا نام Eugenics Education Society رکھا تھا، تاکہ اس سلسلہ میں تحقیقات کو آگے بڑھایا جائے۔ اس سلسلہ میں فرانس کے کام نے اس سوسائٹی کو ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے میں مدد کی اور مختصر سی مدت میں اس کی یہ تحریک نہ صرف برطانیہ بلکہ یورپ کے دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ امریکہ میں بھی مقبول ہونے لگی۔ اس تحریک کے ذریعہ کیلٹن نے دُنیا میں پہلی بار خاندانی منصوبہ بندی کے رجحان کو عام کیا۔

اس زمانے میں ٹی۔ بی، سوزاک، آتشک وغیرہ متعدی امراض لا علاج سمجھے جاتے تھے اور ایسے مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے مختلف ممالک میں بے چینی



پھیلی ہوئی تھی۔ فرانس نے لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا کہ یہ امراض موروثی شکل اختیار کر رہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ جو لوگ ان امراض میں مبتلا ہیں وہ جب تک مکمل صحتمند نہ ہو جائیں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کریں۔ اس تحریک کا مقصد ابتدا میں صرف ایسے لوگوں میں بیداری پیدا کرنا تھا جو ایسے خطرناک متعدی امراض میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس تحریک کو تقویت پہنچانے کے لئے امریکہ ایک قدم آگے بڑھا اور وہاں اس مقصد سے قانون بنا دیا گیا اور ایسے امراض میں مبتلا افراد کی نس بندی کے ذریعہ لازمی طور پر افزائش نسل کو روک دیا گیا۔ لیکن اس تحریک کا منفی اثر یہ ہوا کہ متعدی امراض میں مبتلا افراد کے ساتھ ساتھ نفسیاتی امراض کا شکار مریضوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس سلسلہ میں اتنی سختی کی گئی کہ اس تحریک کی مخالفت ہونے لگی اور انسانیت نواز اداروں نے اس تحریک کو غیر انسانی ہونے کا الزام عائد کر دیا۔ اسی تحریک نے ہٹلر کے دور میں جرمنی میں کافی تقویت حاصل کی، جب اُس نے اس تحریک کا سہارا لے کر لاکھوں یہودیوں اور خانہ بدوش قوموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہٹلر کی اس انسانیت سوز حرکت کی وجہ سے اس تحریک کو بہت نقصان پہنچا اور عوامی مخالفت کا سامنا کرنے میں ناکام ہو کر ۱۹۴۰ء میں اس نے دم توڑ دیا۔ اس تحریک کے ناکام ہونے کے اسباب اگر ایک طرف اس کے منفی اثرات تھے تو دوسری جانب سائنس کی بڑھتی ہوئی ترقی اور جینیٹکس کے بارے میں جدید تحقیقات بھی تھیں۔ ان تحقیقات سے جو نتائج سامنے آئے، اُن کی روشنی میں یو جنکس سوسائٹی کو اپنے اغراض و مقاصد کے بارے میں دوبارہ غور کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

یہ سوسائٹی فرانس گیلٹن نے ۱۹۰۷ء میں قائم کی تھی۔ اس وقت اس کا نام Eugenics Education Society تھا۔ ۱۹۲۶ء میں اس کا نام بدل کر Eugenics Society رکھ دیا گیا۔ ساتھ ہی امریکہ میں بھی اس کی ایک شاخ قائم کر دی گئی۔ اس کے علاوہ دوسرے مغربی ممالک میں بھی اس پر تحقیقات کام شروع ہوا۔ لیکن سرفرانس گیلٹن کی توقعات کے بموجب اس کام میں پیش رفت نہ ہو سکی۔



۱۹۷۱ء میں امریکہ میں اس سوسائٹی کا نام بدل کر Society for the Study of Biology کر دیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں جہاں جہاں اس کی شاخیں قائم تھیں، وہاں وہاں اس کا نام بدل کر Galton Institute ہو گیا اور اس نام سے یہ آج بھی قائم ہے۔ اب یہ سوسائٹی گیلٹن انسٹی ٹیوٹ کے نام سے صرف امریکہ اور برطانیہ میں قائم ہے۔ اب اس سوسائٹی کا دائرہ عمل حیاتیاتی اور جینیٹیکس تحقیقات اور سماجی و ثقافتی مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی افزائش نسل اور صحت عامہ سے جڑے ہوئے مسائل پر بحث اور اس سلسلہ میں لیکچر اور سمپوزیم وغیرہ کے انعقاد اور اس سے متعلق اشاعتی کاموں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

۰۰



# ولہیم وونٹ

Wilhelm Wundt ( 1832- 1920)

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نفسیات کو سائنسی علم کی حیثیت دلانے میں مشہور مفکر ڈیکارٹ کا بڑا ہاتھ ہے اور اس کو ہی سائنسی نفسیات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ڈیکارٹ کا دور ۱۶۵۰ء تک رہا اور اس کے بعد نفسیات میں کسی اہم کام کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقریباً دو سو سال تک نفسیات پر ایک جمود طاری رہا اور ڈیکارٹ کے نظریہ پر آگے کوئی کام نہیں ہوا اور علم انفس فلسفہ کا ہی ایک حصہ رہا۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فلسفہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یہ خیال اس لئے کیا جاتا ہے کیونکہ اس زمانہ میں بہت کم مشاہیر کے تذکرے ملتے ہیں۔ اُنیسویں صدی شروع ہوتے ہی فلسفہ سے دلچسپی بڑھنا شروع ہوئی اور پھر دن بہ دن اس میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔ ڈیکارٹ کے بعد اگر کوشش کی جاتی تو نفسیات کو سائنسی علم کا درجہ بہت پہلے مل جاتا۔ بعض مفکرین نے اس کو سائنسی علم تسلیم کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کیونکہ اس کے نظریات کو سائنٹیفک دلائل اور تجربات کی مدد سے صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا، اور اس وقت تک نفسیات میں تجربات کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں نفسیات کو فروغ دینے اور ترقی کی راہ پر لے کر چلنے والے دانشوروں نے اس زاویہ سے بھی غور کرنا شروع کیا۔ یہ کوشش اس وقت کامیاب ہوئی جب لائپزگ یونیورسٹی میں ۱۸۷۹ء میں پہلی بار نفسیاتی تجربہ گاہ قائم کی گئی اور اس کے



ذریعہ باقاعدہ تجربات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس طرح Experimental Psychology کی ابتدا ہوئی۔

یہ تجربہ گاہ ولہیم وونٹ نے قائم کی تھی اور اسی تعلق سے اس کا نام ہمیشہ کے لئے تجرباتی نفسیات سے منسوب ہو گیا ہے۔ آج بھی ولہیم وونٹ کو ہی نفسیات کے اس شعبہ کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو میں اس شعبہ کے لئے اختیاری نفسیات کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس کو تجرباتی نفسیات بھی کہتے ہیں۔ یہ سوچنا صحیح نہیں ہے کہ ولہیم وونٹ کا نام صرف اس لئے مشہور ہوا کیونکہ اس نے نفسیات میں پہلی بار تجربہ گاہ قائم کی۔ دراصل اس کا نام نفسیات میں خاص طور سے Structuralism کے معمار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ نفسیات کا یہ شعبہ جرمنی میں وجود میں آیا تھا اور اس کے بانیوں میں سب سے پہلا نام وونٹ کا ہی ہے۔ مفکرین کا خیال ہے کہ Structuralism (یعنی ساختیات) کے تصور کے ساتھ ہی نفسیات کا رشتہ حیاتیات اور علم الاعضاء قائم ہو جاتا ہے اور اس طرح علم انفس خود بخود سائنس سے مربوط ہو جاتا ہے۔

وونٹ کے مطابق اس جدید شعبہ کی اہمیت تین طریقوں سے واضح کی جاتی تھی۔ اول یہ کہ وونٹ نے نفسیات کو اپنے جدید نظریہ ساختیات کے ذریعہ سائنٹیفک طریقہ پر پیش کیا اور پہلی بار وونٹ نے ہی اس کو فلسفہ سے الگ کر کے سائنس کی فیکلٹی کے تحت لانے کی کوشش کی۔ دوسرے یہ کہ نظریہ ساختیات کے تحت وونٹ نے قدیم طریقہ مشاہدہ باطن کو پھر تقویت پہنچائی اور اس طریقہ کو ہی نفسیات کے مطالعہ کا ایک لازمی طریقہ قرار دیا۔ تیسرے یہ کہ اس نظریہ کے تحت شعور کو بہت اہمیت دی گئی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ مشاہدہ باطن کے ذریعہ ہم شعور کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور اس کے عناصر کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ وونٹ کا یہ بھی خیال تھا کہ مشاہدہ باطن کے ذریعہ ہی ہم کو تجربہ حاصل ہوتا ہے اور پھر ان تجربات سے ہم استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بیسویں صدی کے ابتدائی حصہ تک مشاہدہ باطن کو بہت اہمیت حاصل



تھی اور اس طریقہ کو ہی نفسیات کے مطالعہ کا ایک اہم طریقہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ ساختیات پر مزید اظہار خیال سے بہتر ہے کہ ولہیم وونٹ کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

ولہیم وونٹ Wilhelm Maximilian Wundt ۱۸۳۲ء میں جرمنی میں Neekarau نام کے ایک چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھی۔ اس کے والدین کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وونٹ ایک سال کا ہی تھا کہ اس پر ملیریا کا زبردست حملہ ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب ملیریا کو ایک خطرناک، متعدی اور جان لیوا بیماری سمجھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے کہ مقامی لوگ اُس کو وہاں سے دور چلے جانے کو کہیں، وونٹ کے والدین نے خود وہ علاقہ چھوڑ دیا اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا کر سکونت اختیار کر لی۔ وہاں کے لوگوں کا عام پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ وونٹ نے اپنے بارے میں لکھا تھا کہ وہ بچپن سے ہی خیالی پلاؤ پکایا کرتا تھا اور ہمیشہ سنہرے خواب دیکھنے میں لگن رہتا تھا۔ وہ خواب بیداری کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اس کی یہ عادت تعلیم میں حائل ہو رہی تھی۔ جب وہ ۱۳ برس کی عمر میں ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیا گیا تو اپنی اس عادت کی وجہ سے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکا اور پہلے ہی سال ناکام ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی نے اپنے ایک دوست کی مدد سے اس کی کمزوریوں کی طرف توجہ دی اور اس کو خواب بیداری کی عادت سے چھٹکارہ دلانے کی بے حد کوشش کی۔ دونوں کی محنت کامیاب ہوئی اور پھر وونٹ نے تعلیم کی جانب توجہ دینی شروع کی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسکول میں کچھ ایسے دوست مل گئے جو اپنی تعلیم کے معاملہ میں بہت سنجیدہ تھے۔ ان دوستوں کے ساتھ رہ کر اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اگر اب وہ فیل ہوا تو ان لوگوں کا ساتھ چھوٹ جائے گا، اس لئے اُس نے اُن سب کے ساتھ مل کر اپنی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اس کا نتیجہ..... ظاہر ہے..... مثبت ہی نکلتا تھا اور وونٹ ہائی اسکول کے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ (برنگمین Bringmann نے اپنی ایک کتاب میں وونٹ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ یونیورسٹی کے اخراجات برداشت کر پاتا۔ اس لئے وہ



میڈیکل اسکول میں داخل ہو گیا۔ (اُس کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میڈیکل اسکول کے اخراجات کم ہوتے تھے۔) اس کے بعد اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہانڈل برگ اور پھر برلن میں داخلہ لے لیا۔ اس کی دلچسپی ایک ڈاکٹر بن کر روزی کمانے میں نہیں تھی بلکہ وہ سائنٹیفک نقطہ نظر سے کچھ نیا کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کو ہانڈل برگ میں ہی لیکچرر کی جگہ کی پیش کش کی گئی، لیکن اس شرط پر کہ اس کو کچھ دنوں تک نہایت قلیل تنخواہ پر کام کرنا پڑے گا۔ حالانکہ اس وقت وہ مالی دشواریوں سے دوچار تھا، لیکن اپنی خواہش پوری ہوتے دیکھ کر اس نے یہ پیش کش منظور کر لی۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ اس کو مشہور ماہر علم الاعضاء Hermann Helmholtz کے تحت کام کرنا تھا اور یہ بات بذات خود اہمیت کی حامل تھی۔ اس نے فوراً اس پیشکش کو قبول کر لیا اور وہاں اس نے ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۳ء تک علم الاعضاء کے انسٹرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ وونٹ کا خود کہنا ہے کہ ہانڈل میں تنخواہ کی کمی اس طرح پوری ہوئی کہ اُس کے پسندیدہ شعبہ میں اُس کو تحقیق و تجربات کے کافی مواقع ملے۔ اپنی اس ملازمت کے دوران اس کو تپ دق کا عارضہ لاحق ہو گیا اور اس کو مجبوراً اسکول سے طویل مدت کے لئے رخصت لینا پڑی۔ اپنی اس رخصت کا اُس نے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچا اور ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا جو اُس نے صحت یاب ہونے کے بعد مکمل کی۔ اس بارے میں وونٹ نے لکھا تھا کہ..... ”میری مصیبت میرے لئے رحمت بن کر آئی۔“ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی یہ کتاب کافی مقبول ہوئی اور وہ بحیثیت ایک مصنف پہچانا جانے لگا۔ اس کے بعد اس نے کئی معرکتہ آرا کتابیں تخلیق کیں اور وہ بھی اتنی تیز رفتاری سے کہ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ کیونکہ اس کی ایک آنکھ کی بصارت ختم ہو چکی تھی اور دوسری آنکھ کی بصارت میں بھی کمی آنے لگی تھی۔ اس طرح قلیل تنخواہ ہونے کے باوجود اس کو کتابوں سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔

۱۸۶۳ء میں اس کو ہانڈل برگ میں ہی اسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت مل گئی اور وہاں اس نے تین سال بعد ہی ایک نئے کورس کی بنیاد ڈالی اور اس کو عضویاتی نفسیات



(Physiological Psychology) کا نام دیا۔ اس نے نفسیات اور علم الاعضاء کے اصولوں کا باہم استعمال کر کے احساسات اور ردِ عمل کے تعلق پر روشنی ڈالی۔ اُس نے اس نئے شعبہ پر جو لیکچر دئے، اُن کا مجموعہ Principles of Physiological Psychology کے نام سے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔ اُس زمانے میں بھی مشہور مفکر Spinoza کا نفسی طبعی متوازنیت کے بارے میں نظریہ زیرِ بحث تھا۔ حالانکہ بہت سے مفکرین اس نظریہ کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے، لیکن وونٹ نے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا کیونکہ یہ نظریہ وونٹ کے خیال کو تقویت پہنچاتا تھا۔ اس نظریہ کے تحت یہ خیال کیا گیا تھا کہ ہر جسمانی طبعی وقوع کا ذہنی زاویہ ہوتا ہے اور ہر ذہنی واقعہ جسمانی طبعی زاویہ رکھتا ہے۔ اس نے فشنر کے اس خیال کو بھی تسلیم کر لیا کہ تہیج اور ردِ عمل کی پیمائش کے ذریعہ جسمانی طبعی وقوعات کو تجربات کے طریقہ سے مزید قابلِ فہم بنایا جاسکتا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں اس نے عضویاتی نفسیات میں ہی ایک اور نظریہ پیش کیا تھا جس کو Tridimensional Theory of Feeling کا نام دیا۔ اس نظریہ کے تحت تحسیس کی کیفیت کی درجہ بندی کی گئی اور اس کو تین شکلوں میں تقسیم کیا گیا، یعنی احساس خوشگوار ہوتا ہے یا ناخوشگوار، تناؤ سے بھرا ہوا یا استرخائی حالت کا موجب، ہیجان انگیز یا تسکین بخش ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں وونٹ نے جو طریقہ اپنایا، اُس کو ایک قسم کا تجرباتی مشاہدہ باطن (اندرونِ مبنی) کہا جاسکتا تھا۔ اس کے تحت تحقیق کے دوران کسی بھی ایسے واقعہ کو منتخب کیا جاتا تھا جس کی کیفیت، شدت اور مدت عمل کی پیمائش کی جا سکے۔ اس کے اس خیال پر غور و خوض کی ضرورت پر زور دیا گیا اور آہستہ آہستہ ماہرین اُس کے ہم خیال ہوتے گئے۔

اُس وقت تک وونٹ کو معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ اپنے آپ کو اب خود کفیل سمجھنے لگا تھا۔ اس لئے اس نے ۴۰ برس کی عمر میں ۱۸۷۲ء میں شادی کر لی۔ اسی سال اس کو سونز لینڈ میں زیورک یونیورسٹی میں ایک چیئر کی پیش کش کی گئی جو اُس نے بخوشی قبول کر لی۔ لیکن وہاں جا کر اُس کو احساس ہوا کہ سونز لینڈ کی زندگی اس کو اس نہیں



آئے گی، کیونکہ اُس کی جولانی طبیعت کے لئے وہ جگہ محدود تھی۔ وونٹ کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو لائپزگ یونیورسٹی میں ۱۸۷۴ء میں استقرائی فلسفہ پڑھانے کے لئے اسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت مل گئی اور ایک سال بعد ہی اس کو فلسفہ کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ وونٹ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے، کیونکہ اس نے اپنے آنے والے ۴۵ برس وہیں گزار دیئے۔ اس مدت میں اُس نے نہ صرف لائپزگ یونیورسٹی میں اپنا ایک مقام بنا لیا بلکہ فلسفہ اور علم النفس پر مسلسل تحقیق کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے وہ اپنے دور کے مشہور مفکرین کی فہرست میں بھی شامل ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ وہ نفسیات میں تجربات کا سلسلہ شروع کرنے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا، اور اس سلسلہ میں اُس نے نہ صرف اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بھی بنا لیا تھا بلکہ منصوبے کا مکمل خاکہ بھی تیار کر لیا تھا۔ اب اس کو اپنے خوابوں کی تعبیر ملتی دکھائی دی۔ اس نے یونیورسٹی کے انتظامیہ کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا اور کوشش کی کہ دنیا کی پہلی نفسیاتی تجربہ گاہ لائپزگ میں قائم ہو۔ وہ کامیاب ہوا اور انتظامیہ نے اس کو اپنے منصوبہ پر عمل کرنے کی اجازت دے دی اور اس مقصد کے تحت اُس کو ایک مناسب جگہ اور ضروری آلات فراہم کر دیے گئے۔ اس طرح ۱۸۷۵ء میں دنیا میں پہلی نفسیاتی تجربہ گاہ قائم کر دی گئی اور نفسیات کی ایک اور شاخ ”اختیاری نفسیات“ (تجرباتی نفسیات) کی شکل میں وجود میں آ گئی۔

(نوٹ:- اس سلسلہ میں مفکرین کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کئی جگہ یہ بیان ہے کہ وونٹ نے یہ تجربہ گاہ ۱۸۹۶ء میں قائم کی تھی، جبکہ کچھ مصنفین نے لکھا ہے کہ وونٹ نے یہ تجربہ گاہ ۱۸۷۵ء میں قائم کی تھی اور اسی سال امریکہ میں عضویاتی نفسیات کے تحت ہی ایک لیبارٹری ہاورڈ یونیورسٹی میں ولیم جیمس نے بھی قائم کی تھی۔)

وونٹ کی تجربہ گاہ کو ایک طرح سے دماغی کیمیائی عناصر سے متعلق تجربہ گاہ کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ اُس زمانے میں کیمسٹری میں نئی نئی دریافتوں سے مفکرین حیرت زدہ تھے۔ اسی زمانے میں مینڈلیف نے عناصر کو جوہری اوزان کی صعودی



ترتیب میں رکھ کر اُن کی درجہ بندی کی۔ اس نے دریافت کیا کہ عناصر کے خواص ان کے جوہری اوزان کے دوری تفاعل ہوتے ہیں۔ اس دریافت کو ”مینڈیلیف کا دوری کلیہ“ (Mendeleev's Law of Periodicity) کہتے ہیں۔ اس قانون کے تحت ”مینڈیلیف نے عناصر کا دوری جدول“ (Periodic Table of Elements) بھی تیار کیا تھا۔ یہ ۱۸۶۹ء کی بات ہے۔ اُس نے دو سال بعد ہی اپنے اس جدول پر نظر ثانی کی اور کچھ تبدیلیاں پیش کیں، ساتھ ہی اُس نے تین ایسے عناصر کی پیش گوئی کی جن کی دریافت اس وقت تک نہیں ہو پائی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دُنیا بھر میں سائنسی علوم سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی اور کیمسٹری بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سائنس میں اس ترقی کے رجحان سے ایک انقلاب کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وونٹ نے ان حالات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہی یہ تجربہ گاہ قائم کی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ وہ کیمیائی دریافتوں کا اطلاق کسی طرح نفسیات پر کرے۔ حالانکہ اُس نے اعتراف کیا تھا کہ کیمسٹری اور نفسیات دو الگ الگ راستے ہیں جو کبھی نہیں ملتے۔ لیکن اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ جس طرح کیمسٹری میں عناصر کی ترتیب سے اُن کی خاصیت کا پتہ لگایا جاسکتا ہے، اُسی طرح ذہنی عناصر کی ترتیب بھی نئے نظریات کے وجود کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس طرح اس کے ذہن میں Mental Chemis تصور آیا اور یہی تصور اس کو نفسیاتی تجربہ گاہ قائم کرنے کا باعث بنا۔ وونٹ کے اس خیال کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے پیروکار اور شاگردوں نے بھی اُس کا ساتھ دیا اور وہ سب مل کر نفسیات میں اس نئے خیال کو لے کر آگے بڑھے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے ولیم وونٹ کو ساختیات کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے اور اُس نے اس شعبہ کی ترقی کے لئے کافی محنت کی تھی۔ ساختیات کا اہم مقصد ذہن کے اُن عناصر کی تلاش تھا جو شعور کی تشکیل کرتے ہیں۔ وونٹ اور اُس کے شاگردوں کا خیال تھا کہ ذہن کا مطالعہ کرنے کے لئے کیمیائی اصولوں کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی بنیادی کائیوں یعنی کیمس، تصور، جذبہ اور ادراک کا گہرائی



سے مطالعہ کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ساختیات کے شعبہ پر کام کرنے والے ماہرین نفسیات نے اپنے تجربات کی ابتدا بنیادی تحسیس کی اصلیت جاننے کے لئے کی۔ اُن کا خیال تھا کہ تحسیس کی بنیادی معلومات حاصل ہونے کے بعد ہی ہم ذہن کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لئے مشاہدہ باطن (درون بینی) کو ایک اہم ذریعہ قرار دیا۔

نظریہ ساختیات کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور وہ علم النفس میں اپنی سالمیت کے ساتھ اب باقی نہیں ہے۔ البتہ اس کے کچھ عناصر کا استعمال اب بھی ہوتا ہے۔ اس نظریہ کو مقبولیت نہ ملنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہ ایک مکمل نظام کی حیثیت نہیں رکھتا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکا۔ حالانکہ وونٹ نے اپنی پوری توجہ اس شعبہ کی ترقی اور اشاعت کی جانب مبذول کر دی تھی، لیکن اس کے بعد اس سلسلہ میں مزید پیش رفت نہ ہو سکی۔ لاپیزگ یونیورسٹی میں وونٹ کا ہونہار شاگرد ٹچر بھی تھا جس نے دو سال تک اس نظریہ پر کام کیا اور وونٹ کے شانہ بہ شانہ چل کر اس نظریہ کی ترقی میں اُس کا ہاتھ بٹایا۔ ٹچر جب امریکہ ہجرت کر گیا تو وونٹ اکیلا رہ گیا۔ لیکن ٹچر کے ذریعہ یہ نظریہ امریکہ پہنچا اور وہاں اس کے چرچے ہونے لگے۔ ٹچر کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جس نظریہ کی بنیاد جرمنی میں ڈالی گئی اُس کو پھلنے پھولنے کے مواقع امریکہ کی کارنیل یونیورسٹی میں نصیب ہوئے۔ آج بھی امریکہ میں ساختیات نظریہ کا بانی ٹچر کو ہی سمجھا جاتا ہے۔

اگر وونٹ کے فلسفہ کا ذکر کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نہ روحیت کا قائل تھا اور نہ مادہ پرست تھا۔ بلکہ اس نے اپنے مضامین میں Spritualistic خیال کی کھل کر مخالفت بھی کی تھی اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس طرح ہم ذہنی تجربہ جیسے سائنٹیفک موضوع کو محض خیالات کی بنیاد پر ایک فکری عنصر سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح اُس نے اپنے ایک مضمون میں مادہ پرستی پر بھی اسی تعلق سے تبصرہ کیا تھا۔ اس کے خیال میں ذہن سے متعلق سائنسی عناصر پر محض کیمیائی اصولوں کے اطلاق سے بحث نہیں کی جا



سکتی۔ اس طرح دونوں خیالات کو یکجا کر کے اُس نے کہا تھا کہ..... ”ذہن کا مطالعہ تجرباتی سائنس کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے“ اور اُس کے اس خیال کی وجہ سے اس کو نظریہ مظہریت کا حامی قرار دے دیا گیا۔

کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ وونٹ کی تجرباتی نفسیات کی تحریک کی وجہ سے علم النفس فلسفہ سے زیادہ فطری سائنس سے قریب تر ہوتا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے نفسیات اور عضویات میں ایک پرشتہ قائم کر دیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ نفسیات کے تحت جو تجربات آزمائے جائیں، اُن کی بنیاد عضویہ کے وظائف پر ہونی لازمی ہے اور اس عمل کے لئے اُس نے ”نفسی عضویاتی ترکیب“ استعمال کی۔ اس نے ذہن کو ایک مادہ کی حیثیت نہیں بلکہ ایک کارکردگی کی حیثیت دی اور ذہن کی بنیادی عملیت کو اس نے Apperception کی اصطلاح دی۔ اُس کے خیال میں عضویاتی نفسیات کے تحت ہیجان کے عمل کی تشریح کی جاسکتی ہے اور اس طرح حسی اعصاب کے ذریعہ حسی اعضاء کے نتیجے اور اخذات کے عمل کے ذریعہ ردِ عمل کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس نے اس عمل کو ذہنی عمل کے متوازی عمل کی حیثیت دی ہے اور اس مقام پر مشاہدہ باطن کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وونٹ کے مطابق تجرباتی نفسیات کی بنیاد ہی مشاہدہ باطن پر رکھی جانی چاہئے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں جرمن فلسفہ کے تحت کسمیس ایک ذہنی کیفیت تسلیم کی جاتی تھی، اس لئے اس کو ذہن کے اندر کی ایک کیفیت سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ کسمیس دراصل ایک عصبی کیفیت ہے اور اس کو ذہن کے اعمال سے باہر تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے تجرباتی دور میں مشاہدہ باطن کو Introspection کا نام دیا جس کے لئے اُردو میں ”درون بینی“ کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔

وونٹ اور اس کے شاگردوں نے مشاہدہ باطن کو بنیاد بنا کر تجرباتی طریقوں کا استعمال کیا اور پہلا تجربہ ادراک کے تعلق سے گہرائی سے مشاہدہ پر مشتمل تھا۔ اس نے اپنے اس طریقہ کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے کچھ اصول مرتب کئے تھے۔ مثلاً.....



الف۔ تجربہ کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس بات کا تعین کرے کہ تجربہ کی ابتدا کب ہوتی ہے اور اس کا اختتام کس مرحلہ پر ہوتا ہے۔

ب۔ تجربہ کار ہمیشہ اپنی توجہ تجربہ کے عمل پر مرکوز رکھے۔

ج۔ جن مظاہر کا اس کو سامنا ہو، اُن کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ ان کا وجود دہرا یا جاسکے۔

د۔ مظاہرات میں قابل تجربہ ہونے کی صلاحیت ہونا چاہیے، عمل تحسیس سے متعلق تجربات کے دوران اُس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہمیں بھوک اور پیاس کا بھی احساس ہوتا ہے اور تکلیف و درد کا بھی۔ اس لئے حواس کی تعداد پانچ نہیں بلکہ سات ہونی چاہئے۔

وونٹ کے بارے میں اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ خاموش طبیعت، نرم مزاج اور اپنے شاگردوں سے ہمدردی رکھنے والا ٹیچر تھا۔ اس کے کئی شاگرد ایسے تھے جو فلسفہ اور نفسیات میں مہارت رکھتے تھے اور ان سب نے اس بات کی تائید کی۔ وونٹ کے شاگرد اس کی قدر کرتے تھے۔ جن لوگوں نے وونٹ کے تحت تعلیم حاصل کی، اُن میں Oswald Kulpe اور Hugo Minsterberg خاص طور پر مشہور ہوئے۔

وونٹ کے خیال میں ہم بنیادی طور پر جذباتی تخلیق کا ایک نمونہ ہیں۔ ہمارے جذبات اور ذہنی اعمال میں ایک تعلق ہے اور جذبات سے وقوفی حالت پیدا ہوتی ہے۔ اس نے کئی اصطلاحات کے مفہوم میں ترمیم کی سفارش کی۔ مثلاً Feeling کے بارے میں اُس کا خیال تھا کہ اس سے یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ یہ ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے جس کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ جبکہ Mood کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ بنیادی تجربات کی مدت میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ موڈ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ Emotion کے بارے میں اُس نے لکھا کہ یہ بھی پیچیدہ تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ تحریک جذبات میں دباؤ پیدا کرنے والی شکل ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں کردار تشکیل پاتا ہے۔ وونٹ نے جیمس لانگ کے نظریہ جذبات کو تسلیم نہیں کیا، کیونکہ اس نظریہ کے تحت



یہ خیال کیا گیا تھا کہ ہم پہلے وقوع کا سامنا کرتے ہیں، پھر جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ وونٹ کا خیال تھا کہ مشاہدہ باطن سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جذبہ کی تخلیق پہلے ہوتی ہے اور اس کے بعد عضویاتی رد عمل وجود میں آتا ہے جو کردار کہلاتا ہے۔ وونٹ کے خیال میں قوت ارادی کی بہت اہمیت ہے اور انسان کے فیصلے کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے اور قوت ارادی ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قوت ارادی کے تحت انجام دیا گیا عمل ہی تحریکی کردار ہے۔ کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ وونٹ کی لیباریٹری میں قوت ارادی کے تعلق سے جو تجربات کئے اور ان کے نتیجہ میں جو تحقیقات ہوئیں، اُن کی بنیاد پر بلجیم کے مشہور مفکر البرٹ کو متاثر کیا۔ البرٹ کے فلسفہ سے متاثر ہونے والوں میں ہانڈر، کرٹ لیون اور فیسنگر کا نام بھی شامل ہے جنہوں نے بعد میں سماجی نفسیات میں اہم کام انجام دیے۔

دراصل وونٹ نے بھی اپنی زندگی کے آخر دنوں میں سماجی نفسیات کی جانب توجہ دی تھی اور اس کے بارے میں اس نے ایک بار لکھا تھا کہ معاشرتی نفسیات سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، اس کے ذریعہ ہم معاشرہ میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نفسیات میں تحسیس سے متعلق تجربات ہی سب کچھ ہیں اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ تو صرف سطح ہے اور اس سے گزر کر گہرائی میں جانا ہے جہاں بہت کچھ ہے۔ کیونکہ نفسیات کے بہت سے ایسے موضوع ہیں جنہیں تجربات کی ضرورت نہیں۔ اس نے ایک بار یہ بھی لکھا تھا کہ ہم کو معاشرتی مسائل کا سہارا لے کر معاشرتی نفسیات کی جانب بڑھنا چاہئے کیونکہ معاشرتی جو کچھ حاصل ہوتا ہے، اس کے ذریعہ ہی ہم معاشرہ میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس نے جرمنی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام Volker psychologie تھا، جس میں اُس نے ابتدائی زمانے سے موجودہ زمانے تک ثقافتی نش و نما پر روشنی ڈالی تھی۔ اس کتاب کی پہلی دو جلدوں میں اس نے ایک اہم موضوع پر اظہار خیال کیا تھا اور اس کو اس نے Psycholinguistics کا نام دیا تھا۔ اس میں



اُس نے لکھا تھا کہ زبان کی بنیادی اکائی جملہ ہے، نہ کہ لفظ یا اُس لفظ کی صوتی خصوصیات۔ اس کے خیال میں جملہ، الفاظ کا با ترتیب مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس جملہ کا تعلق ایک ذہنی خصوصیت سے ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان الفاظ کے مجموعہ کو ایک معنی دئے جاتے ہیں۔ اگر چند الفاظ کا مجموعہ کوئی ذہنی کیفیت پیدا نہ کر سکے تو وہ زبان کا حصہ نہیں ہو سکتا۔

تعب کی بات ہے کہ سماجی نفسیات کے تعلق سے وونٹ کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے اور سماجی نفسیات کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بھی کبھی کبھی وونٹ کا یا اُس کی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر جارج بویری کے مطابق دس جلدوں پر مشتمل یہ کتاب اس نے بیس سالوں میں مکمل کی تھی اور معاشرتی نفسیات میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اس کتاب میں معاشرتی اور ثقافتی نشو و نما کے بارے میں ابتدائی زمانے سے شروع کرتے ہوئے ہر دور سے گزرتے ہوئے موجودہ دور تک ارتقائی منازل کا ذکر کیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جبکہ ایک فرد کے لئے سب کچھ اس کا عقیدہ ہوا کرتا تھا اور اُن کے اس عقیدہ کے مطابق ہی ان کے دیوی دیوتا سماج کی توجہ کا مرکز ہوا کرتے تھے۔ پھر ایک ایسا دور بھی آیا جب سماج کے جنگجو، جو اُن کی حفاظت کیا کرتے تھے، اُن کی توجہ کا مرکز بن گئے اور پھر معاشرہ میں اہم کارکردگی نبھانے والے، سماج کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہوئے اپنی زندگی گزارنے والی اہم شخصیات کو سماج میں ایک اہم مقام دیا جانے لگا۔ پھر سائنس کا دور آیا جب ہر موضوع کو استدلال اور تجربات کے ذریعہ پرکھا جانے لگا۔ اس طرح وونٹ نے مختلف معاشروں کا ان کی زبان، رسم و رواج اور طرز زندگی اور فنی و تہذیبی خصوصیات کی روشنی میں نشو و نما کا ذکر کیا ہے۔ چاس نے جرمنی زبان میں Erlebtes and Erkanntes ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے اپنی زندگی کے حالات لکھے تھے اور اس کو مکمل کرنے کے کچھ ہفتوں بعد ہی ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء کو یہ عظیم مفکر اور ماہر نفسیات انتقال کر گیا۔



# ولیم جیمس

William James ( 1842- 1910 )

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سگمنڈ فرائڈ کے بعد جس نفسیات داں نے زیادہ شہرت پائی، وہ ولیم جیمس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی دُنیا کے بہت سے ممالک میں اس کی کتاب Principles of Psychology ایک نصابی کتاب کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے اور جہاں یہ نصاب میں شامل نہیں، وہاں کے طالب علم اسی کتاب کی تلاش میں رہتے ہیں، اور جن کو یہ مل جاتی ہے وہ اس سے بہت زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ دراصل آج بھی بہت سے امریکی نفسیات داں ولیم جیمس کو سگمنڈ فرائڈ پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کو امریکہ میں ”بابائے نفسیات“ کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ ولیم جیمس نہ صرف ایک نفسیات داں تھا بلکہ وہ ایک عظیم مفکر اور دانشور کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جس مصنف اور نفسیات داں کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اُس نے کبھی نفسیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس کے باوجود اس نے نفسیات کو اپنے اچھوتے خیالات سے نئی راہیں دکھائیں اور اس کے خیالات سے نہ صرف طالب علم، بلکہ اس کے بعد آنے والے کئی ماہرینِ نفسیات اور مفکرین نے استفادہ کیا۔ اس کا اعتراف خود امریکہ اور یورپ کے کئی دانشوروں نے کیا ہے جن میں برٹرانڈ رسل اور جان ڈیوی جیسے عظیم مفکر بھی شامل ہیں۔

ولیم جیمس کی ابتدائی زندگی کے حالات عجیب و غریب ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بھی



غلط نہ ہوگا کہ اس کی شخصیت کی تعمیر میں ان حالات کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ جس خاندان میں وہ پیدا ہوا، وہ اپنے زمانے کا مالدار ترین گھرانہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ ولیم جیمس کے دادا نے جب دنیا چھوڑی تو اپنے پیچھے تیس لاکھ امریکی ڈالر کی جائداد بھی چھوڑی۔ انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اس رقم کی کیا اہمیت ہوگی، اس کا اندازہ خود قارئین لگا سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ولیم جیمس کے والد ہنری جیمس نے آمدنی کی غرض سے کبھی کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ویسے بھی وہ ایک حادثہ میں اپنی ایک ٹانگ گنوا چکا تھا اور کسی مشقت والے کام کے قابل نہیں تھا۔

ولیم جیمس ۱۸۴۲ء میں نیویارک شہر میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ دوسرا لڑکا ہینری ایک سال بعد پیدا ہوا۔ پہلے تو ولیم جیمس کو گھر پر ہی تعلیم دلائی گئی اور کچھ دن بعد اُس کا چھوٹا بھائی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جب ولیم سات سال کا ہوا تو اس کو مقامی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہ بارہ سال کا ہی تھا کہ اس کے والدین یورپ منتقل ہو گئے اور وہاں جینوا میں سکونت اختیار کر لی۔ پتہ نہیں کیوں ولیم کے والد کو یہ خبط تھا کہ وہ سال دو سال کے بعد اپنی سکونت تبدیل کیا کرتا تھا۔ امریکہ کے بعد وہ کبھی سوئٹزر لینڈ میں رہا تو کبھی جرمنی میں اور کبھی فرانس میں۔ اس کے اس عجیب و غریب شوق کی وجہ سے نہ صرف بچوں کی تعلیم متاثر ہوئی بلکہ بچوں کی شخصیت پر بھی اس کے اثرات کا نمایاں اثر پڑا۔

ولیم جیمس کو جینوا اسکول میں داخل کرایا گیا تو وہاں اس کو مصوری کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک ساتھ ولیم ہنٹ کے ساتھ ایک پینٹنگ کا اس میں داخلہ لے لیا۔ لیکن تقریباً دو سال بعد ہی یعنی ۱۸۵۸ء میں اس کا خاندان نیو پورٹ منتقل ہو گیا، اس لئے پینٹنگ سیکھنے کے شوق کو بالائے طاق رکھنا پڑا۔ لیکن کچھ ہی مہینوں کے بعد وہ لوگ پھر جینوا آ گئے جہاں ولیم کو جینوا اکادمی میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کر دیا گیا۔ لیکن وہاں اُس کا دل نہیں لگا اور وہ پھر جینوا پینٹنگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ لیکن بہت جلد اُس کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور وہ پھر ایک بار سائنس کی طرف متوجہ



ہوا اور ۱۸۶۱ء میں وہ پھر سائنس اسکول میں داخل ہو گیا۔ یہ لوگ پھر امریکہ چلے گئے اور ۱۸۶۳ء میں وہ ہارورڈ کے اسکول آف میڈیسن میں داخل ہو گیا۔ لیکن وہاں بھی وہ اپنی کمزور قوت ارادی کا شکار ہوا اور اس نے اپنی توجہ حیاتیاتی اور نباتاتی نمونے جمع کرنے کی جانب مبذول کر دی اور ۱۸۶۵ء میں اپنے ٹیچر کے ساتھ امیزن کی مہم پر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس مہم کا مقصد ہی امیزن کی وادی میں ملنے والے حیاتیاتی اور نباتاتی نمونوں کو جمع کرنا تھا تا کہ ہارورڈ میں اس قسم کا ایک میوزم قائم کیا جاسکے۔ اس مہم کے دوران اس پر چیچک کا حملہ بھی ہوا، لیکن اس نے مہم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جیسے جیسے وہ اس مہم کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، اُس کا شوق ایک جنون کی شکل اختیار کرتا گیا اور وہ ہر قیمت پر ایک ایسے میوزم کی تشکیل کرنا چاہتا تھا جہاں امیزن وادی ہی نہیں، دُنیا کے ہر علاقے میں پائے جانے والے حیاتیاتی اور نباتاتی نمونے موجود ہوں۔ اس دوران وہ کئی بار بیمار بھی ہوا، لیکن وہ مہم کے ساتھ ساتھ ہی چلتا رہا۔ لیکن وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی صحت کا بار بار خراب ہونا اس کے ٹیچر کے لئے فکر کا باعث ہوا اور اس نے سوچا کہ جب تک یہ مہم جاری رہے گی، ولیم اس کے ساتھ رہے گا۔ اس لئے اس نے مہم کو درمیان میں ہی منقطع کرنے کا اعلان کر دیا۔

ولیم پھر ایک بار ۱۸۶۶ء میں ہارورڈ اسکول آف میڈیسن میں آ گیا۔ لیکن وہاں اس کی صحت خراب رہنے لگی، یا یوں کہنا چاہیے کہ وہاں وہ نفسیاتی مریض ہو گیا۔ کبھی وہ اپنی آنکھوں کی خرابی کی شکایت کرتا تو کبھی کمر میں سخت درد کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس دوران اُس پر شدید ڈپریشن کا بھی حملہ ہوا اور یہ ڈپریشن اتنا سخت تھا کہ اس نے ایک بار خودکشی کی کوشش بھی کی۔ جب اُس کے والد کو اس کیفیت کا علم ہوا تو اس نے ولیم کو یورپ کے دورے پر جانے کا مشورہ دیا اور یہ مشورہ واقعی مفید ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف ڈپریشن سے چھٹکارہ پالیا بلکہ اپنی زندگی کی راہیں بھی مطعین کر لیں۔ اس نے برلن میں پھر میڈیسن میں داخلہ لے لیا اور وہیں اس نے علم الاعضاء کی تعلیم حاصل کی اور وہیں اس کو فلسفہ سے شوق پیدا ہوا اور ساتھ ہی اس کو نفسیات کا مطالعہ کرنے کا موقع



بھی ملا، جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ وہاں اس کو ڈیکارٹ، ہیوم، وونٹ اور کانٹ جیسے فلسفیوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ۱۸۶۹ء میں اس نے ایم۔ ڈی کی ڈگری لے کر ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی۔ لیکن اس نے کبھی ڈاکٹری کا پیشہ اختیار نہیں کیا نہ اس کو اپنی روزی کا ذریعہ بنایا، کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو ایک مریض سمجھتا تھا اور وہ خود لکھتا ہے کہ ڈگری مل جانے کے بعد بھی اسے کبھی اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوا۔

اپنے کچھ دوستوں اور ہارورڈ اسکول کے کچھ ٹیچروں کے مشورے کو مان کر اس نے ۱۸۷۳ء میں ہارورڈ اسکول میں ہی علم الاعضاء کے جزوقتی ٹیچر کی حیثیت سے تقرری کو قبول کر لیا اور پھر وہیں اگلے سال کل وقتی اناٹومی کے پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کی پیش کش کو بھی قبول کر لیا۔ لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا اور اپنے اندر ایک بے چینی اور ایک کسک سی محسوس کیا کرتا تھا۔ شاید اس کے اندر پوشیدہ ایک نفسیات داں جلد سے جلد باہر آنے کے لیے اس کے ذہن کے پردوں پر دستک دیتا تھا۔۔۔ اور پھر اس کو موقع مل ہی گیا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس نفسیات سے متعلق کوئی ڈگری نہیں تھی، پھر بھی ہارورڈ کے انتظامیہ نے اس کو نفسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا اور برلن کے قیام کے دوران اس کو نفسیات کے مطالعہ کا جو موقع ملا، اس نے اس کو استعمال کرنے کی غرض سے ہارورڈ اسکول میں ہی نفسیات کی تعلیم دینے کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں تھی کہ سائنس کے مختلف شعبوں میں زور آزمائی کے بعد وہ نفسیات کی جانب رجوع ہوا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہی اس کی منزل تھی جس کو وہ تلاش نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ منزل خود اس کی منتظر تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اس نے کہا تھا کہ..... ”میں خانہ بدوشی کی زندگی سے نکل کر ایک مرکزیت کی جانب لوٹ آیا ہوں۔“ اور اس میدان میں جو کام اس نے کئے، اُن کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ واقعی یہی وہ میدان تھا جو اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

ولیم جیمس نے ایک بار لکھا تھا..... ”میں جب کسی کام یا مقصد میں ناکام ہوتا تھا تو اسے ناکامی سے تعبیر کرنے کے بجائے اپنی زندگی کا ایک خوشگوار تجربہ کہا کرتا تھا اور



ایسے ہی تجربات کی وجہ سے میری زندگی میں ایک ٹھہراؤ آیا۔ پہلے پینٹنگ، پھر حیاتیاتی اور نباتاتی نمونوں کو جمع کرنے کا خیال، اس کے بعد میکاکی اور کیمیائی قوانین کی معلومات حاصل کرنے کا منصوبہ، پھر مذہب کی جانب رخ کر کے بعض مذہبی اور پُراسرار حقیقتوں کی کھوج لگانے کی کوشش کرنا اور آخر میں مابعد الطبیعات میں تجربات کرنا اور اس طرح نفسیات کی جانب متوجہ ہو جانا۔ مشاہدہ باطن پر مختلف تجربات کے بعد اس نے محسوس کیا کہ یہی وہ میدان تھا جو اس کا منتظر تھا۔ ایک اور جگہ وہ اپنی ہمہ دانی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے.....

”مجھے مختلف علوم کا ماہر ہونا چاہئے لیکن میں اپنے آپ کو کسی شعبہ میں مکمل نہیں سمجھتا۔ سائنس کے مختلف شعبوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بعد میں نے خود بنی کی طرف توجہ کی اور اس طرح انسانی برتاؤ اور دنیاوی معاملات میں اس برتاؤ کا ہوشمندانہ اطلاق پر غور کرنا شروع کیا تو میں نفسیات کی گود میں جا بیٹھا اور اب میں نے نفسیات کو ہی اپنی منزل مقصود سمجھ لیا ہے۔“

ولیم جیمس اور اس کا چھوٹا بھائی ہینری دونوں ہی بہت ذہین بلکہ فطین تھے۔ ولیم حالانکہ بہت لا اُبابی قسم کی طبیعت رکھتا تھا، لیکن اس کے برخلاف ہینری بہت مستقل مزاج اور پر اعتماد تھا۔ ہینری ناول نگار تھا اور ولیم اس کو مشورے دیتا تھا کہ کس طرح ناول کے پلاٹ کو اُٹھایا جائے۔ وہ کہتا تھا کہ میں ہنری کو ناول لکھنے کے بارے میں مشورے دیتا تھا لیکن خود لکھتے وقت ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا تھا۔ ولیم کے کچھ ہم عصر مفکرین کا یہ خیال ہے کہ ہنری ناول اس طرح لکھتا تھا جیسے کوئی ماہر نفسیات ہو اور ولیم نفسیاتی مضامین اس طرح لکھتا تھا جیسے کوئی ناول نگار ہو۔ ولیم کا سب سے اہم کارنامہ چودہ سو صفحات پر مشتمل اس کی کتاب Principles of Psychology ہے۔ یہ اُس زمانے میں بھی ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف مانی جاتی تھی اور آج بھی وہ نفسیات کے طلباء میں اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے۔ ولیم نے جب یہ کتاب لکھنا شروع



کی تو اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میں نے جب اس کتاب کی ابتدا کی تو مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے اندر اس شخص کو تلاش کر رہا ہوں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کو فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی اور فلسفہ کے مطالعہ سے اس پر نفسیاتی اصولوں کے گہرے راز افشاں ہونا شروع ہوئے۔ اور آخر کار اپنی عمر کی ۴۸ ویں سیڑھی پر پہنچنے کے بعد اس کو اپنی منزل ملی جس کو وہ نفسیات کہتا تھا۔

نفسیات پر اس کا قابل ذکر مضمون ”جرنل“ میں ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا تھا اور پھر دوسرا مضمون چار سال بعد یعنی ۱۸۸۲ء میں Sentiment of reality کے نام سے شائع ہوا اور ان دونوں مضامین سے اس نے بحیثیت ایک نفسیات داں اپنی پہچان بنالی۔ لیکن وہ ایک بار پھر ڈپریشن کا شکار ہو گیا اور وہ پھر یورپ کے دورے پر نکل گیا۔ یہ سفر اُس کے لئے مبارک ثابت ہوا کیونکہ اس سفر کے دوران اس نے مشہور مفکرین، فلسفہ اور دوسرے علوم کے ماہرین سے ملاقاتیں کیں۔ نفسیات کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے خاص طور پر Wilhelm Wundt سے مل کر اور ان سے تبادلہ خیالات کے بعد نفسیات سے اس کا شوق مستحکم ہو گیا۔ وہ ۱۸۹۲ء تک ہارورڈ میں نفسیات کا پروفیسر رہا۔ اس دوران وہ نفسیات سے متعلق تحقیقات میں بھی مشغول رہا۔ چونکہ اس کی پہلی کتاب شائع ہو چکی تھی، جس نے اس کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ کتاب کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ اس کی اشاعت کے فوراً بعد ہی کتاب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر دی گئی۔ حالانکہ اس کتاب میں نفسیات کا کوئی نظریہ یا کوئی نیا اصول پیش نہیں کیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود نفسیاتی اصولوں کو جامع طریقہ پر مرتب کر کے پیش کیا گیا تھا۔ اس نے یہ کتاب بارہ سال کی محنت کے بعد مکمل کی اور اس بارے میں وہ خود کہتا ہے کہ اس کتاب کی تخلیق کی بنیاد مشاہدہ باطن پر مبنی ہے اور اس کا خیال تھا کہ مشاہدہ باطن کے ذریعہ ہم خود اپنے ذہن میں جھانک کر دیکھتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ بیرونی دنیا پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی روزانہ



زندگی میں جن جن تجربات سے دوچار ہوا، اُن کا اس نے خود تجزیہ کیا اور پھر اپنے احساسات کو دنیا کے سامنے رکھا۔ اس کے ہمعصر مفکرین کا خیال ہے کہ نفسیات میں اس کتاب کو پہلی مکمل اور جامع کتاب کی حیثیت مل گئی اور ولیم جیمس نے ایک مقبول ماہر نفسیات کی حیثیت سے اپنی پہچان بنالی۔ یہ کتاب عرصہ تک ہمارے ملک میں بھی جامعہ عثمانیہ میں درسی کتاب کی حیثیت سے نصاب میں شامل رہی، اور آج جبکہ نفسیات میں نئے نئے اصول وضع ہو گئے ہیں، پہر بھی اکثر ممالک میں ولیم جیمس کی اس کتاب کی اہمیت باقی ہے اور نفسیات کے طلباء اس کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ولیم جیمس کے حالات جان لینے کے بعد اور اس کی شخصیت کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ نفسیاتی تجربات میں اتنا محو ہو کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس نے نہ صرف اپنے تجربات سے فائدہ اٹھایا بلکہ دوسرے ماہرین کے تجربات کو اپنی مشق کا موضوع بنا کر ان کی تصدیق بھی کی اور ان کو ایک تنظیم کی شکل میں مرتب کر کے پیش کیا اور یہی خصوصیات اس کے ہم عصر مفکرین کے لئے باعث حیرت تھیں کہ نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کیے بغیر وہ نفسیات پر ایسے نقوش چھوڑ رہا ہے جو مستقبل میں بھی دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

مثلاً اُس کا خیال تھا کہ.....

۱۔ ہر فرد کو یہ جان لینا چاہیے کہ اس کے ذہن میں جو خیالات مچل رہے ہیں، اُن کے پس پشت ضرور کوئی راز پوشیدہ ہے جو افشاں ہونے کے لئے بے چین ہے اور اس کو لفظوں میں ادا کرنے کا کام خود فرد کا ہے۔

۲۔ ہمارے ماں باپ سے یا ہماری اولاد سے ہمارا گوشت پوست کا رشتہ ہے۔ ان میں سے جو کوئی ہمیں چھوڑ کر انتقال کر جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایک ایک حصہ ہم سے جدا ہو گیا۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اس کا بھی اثر ہم پر ہوتا ہے اور جب ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جگہ ہم کھڑے ہیں اور وہ تکلیف ہم کو پہنچ رہی ہے۔



۳۔ غم انگیز لمحات کے پیچھے بھی خوشیوں اور مسرتوں کا احساس کیا جاسکتا ہے اور یہ احساس اس شخص کو ہوتا ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ ایک نوک دار ہتھیار سے زخمی ہو جانے کے بعد بھی ایک نامعلوم سی مسرت کو محسوس کرتا رہے۔

۴۔ ہماری زندگی میں ہر وقت ایک سوال سامنے رہتا ہے کہ ہمیں کیا چاہئے اور کیا نہیں۔ ہماری یہ چاہت ایک معمولی سی بھی ہو سکتی ہے اور غیر معمولی بھی، خیالی بھی ہو سکتی ہے اور عملی بھی، حقیقی بھی اور غیر حقیقی بھی۔ ہم اکثر اس سوال کا جواب الفاظ میں نہیں دیتے بلکہ محض اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے اظہار کے ذریعہ دیتے ہیں اور منطقی طور پر ہماری یہ مرضی ہی فطرت کے ساتھ ایک تعلق بنائے رکھتی ہے۔

ولیم جیمس نے اپنے اس چوتھے قول میں ایک فلسفیانہ مسئلہ کو نفسیاتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے دامن بچا گیا کہ..... ”کیا فطرت سے تعلق بنائے رکھنے میں ہمارے عضویات ایک واسطہ کا کام انجام دیتے ہیں؟“ لیکن اپنی دوسری کتاب میں اُس نے لکھا ہے کہ اس سوال کا جواب ”ہاں“ میں دینا چاہئے۔ اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ہمارے عضو یہ جب ماحول سے مطابقت کر لیتے ہیں تو ہم اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی کتاب کے ایک بہت ہی اہم باب ”The stream of Thoughts“ میں ولیم جیمس نے اپنے تجربات کی اہمیت کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ رشتوں کا احساس، فرد کا اپنا میلان طبع اور سوچنے کا انداز، یہ سب اس کے تجربات کی بنیاد پر انحصار کرتے ہیں۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں اس کیفیت کو Radical Empiricism کا نام دیا ہے اور نئے نئے خیالات کے سلسلہ کو اس نے ایک بہتے ہوئے چشمے سے تشبیہ دی ہے۔ پانی بہتے وقت جس مقام سے گزرتا ہے، اپنے آپ کو اسی ماحول میں ڈھال لیتا ہے اور اپنے بہاؤ کے درمیان آنے والے ہر مقام پر الگ نظر آتا ہے۔

ولیم جیمس کو نفسیات میں نظریہ وظیفیت Functionalism کا بانی کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے نظریہ کو ایک علیحدہ مکتب فکر کی شکل میں پیش کرنے کی کبھی کوشش



نہیں کی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وظیفی نفسیات کی بنیاد امریکی فلسفی جان ڈیوی نے ڈالی تھی۔ وہ شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمارے لئے سب سے اہم موضوع یہ ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ شعور سے ہم کیا کیا کام لیتے ہیں اور اسی مسئلہ پر ماہرین کو اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے، ساتھ ہی شعور اور ماحول کس طرح ایک دوسرے سے تعاون کر کے اپنے اپنے وظائف انجام دیتے ہیں، یہ بھی توجہ کا موضوع ہونا چاہئے۔ جان ڈیوی کا خیال تھا کہ ماحول سے ہمارا تعلق ہمیں مہیجیات کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان کا علم شعور کے ذریعہ اس طرح وظیفی نفسیات نے ذہن اور جسم کی بحث کو بڑی حد تک ختم کر دیا اور اس سلسلہ میں ولیم جیمس کی کوششوں نے جان ڈیوی کو بہت تقویت پہنچائی۔

ولیم جیمس اپنی کتاب Principles of Psychology میں لکھتا ہے کہ ہم اپنے شعور کو اپنے خیالات کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں جو اس کو گھیرے رہتے ہیں۔ فرد کی دلچسپیوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ہمارے شوق کی وجہ سے ہماری توجہ عمل کرتی ہے۔ کسی ایک شے پر توجہ مرکوز کرنے کا سبب ہماری صلاحیت ہے جو عملی زندگی کی نشانی ہے اور جو ہمارے شعور کا ایک جز ہے۔ ہر وہ چیز جو ہمارے جذبات اور عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، وہ حقیقی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جیمس کا یہی خیال اس کے نظریات کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ ایک مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب ہم کسی شے کا تصور کرتے ہیں تو اس کی چند خصوصیات کی بنا پر اس شے کو ہم ایک نام دے دیتے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ولیم جیمس نے شعور کو ایک وسیع معنی دئے ہیں۔ اس کے خیال میں شعور کا مفہوم صرف کسی شے کا علم ہونے تک ہی محدود نہیں ہے اور اس طرح اس نے ساختیت Structuralism اور وظیفیت Functionalism کے فرق کو واضح کر دیا ہے۔ ولیم جیمس نفسیات میں شعور کی خصوصیات اس طرح بیان کرتا ہے کہ شعور ایک ذاتی شے ہے اور اس حد تک انفرادی ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب شعور کا ذکر ہو تو ایک فرد کی حد تک ہو۔ شعور ہمیشہ تغیر پذیر ہے۔ حس کے لئے اس نے خاص طور پر



ایک فقرہ استعمال کیا ہے Stream of consciousness یعنی اس کے خیال میں شعور کی خاصیت حسی طور پر تسلسل پذیر ہے۔ شعور انتخاب پسند ہے (یعنی ہماری توجہ اس کو تعلق اور استقلال فراہم کرتی ہے۔ یہ محدود بھی ہے اور بنیادی بھی) (یعنی اپنے وجود کا اظہار کرنے والا)۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو جیمس نے شعور کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، وہ شعور کی ایک صاف اور واضح تصویر پیش کرتی ہیں، ساتھ ہی اس کے مفہوم کی لچک کو بھی باقی رکھتی ہیں۔ اس کے خیال میں محدود شعوری عمل صاف طور سے نظر نہیں آتا۔ حالانکہ یہ محدود شعوری اعمال بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، لیکن ان پر توجہ کم جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے وجود کو ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جبکہ یہ نئے نئے خیالات کی صورت میں ہماری زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

جیمس کے فلسفہ میں اخلاقیات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اپنی کتاب کے ایک مضمون The moral philosophy and the moral life میں جیمس نے لکھا تھا کہ اخلاقیات اور حساسیت کا گہرا تعلق ہے۔ جب تک انسان میں ادراک بالحواس کی صلاحیت نہیں ہوگی، اس وقت تک وہ اخلاقیات کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کرے گا۔ حالانکہ اس بات سے متفق نہیں کہ اخلاقیات کا کوئی اصول وضع نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفہ اخلاقیات میں کچھ رہنمائی کے اصول ہیں اور ہم اپنے تجربات کی بنا پر اور دوسرے افراد کی آسودگی اور مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اصول وضع کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد جیمس نے شعور کے مقصد کی جانب بھی توجہ دی ہے اور پہلی بار اس نے یہ خیال پیش کیا کہ شعور کا مقصد جب تک واضح نہ ہو، وہ باقی نہیں رہتا۔ اس طرح اُس نے بے مقصد شعور کے وجود سے ہی انکار کر دیا۔ اس کے خیال میں شعور کا اہم فعل یہ ہے کہ وہ انسان کو ایک بہتر تطابقی حیوان کی شکل میں پیش کرے تاکہ انسان میں انتخاب کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ شعوری انتخاب کو اس نے ذات کی ضد سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں ہماری عادات غیر ارادی اور غیر شعوری شکل اختیار کر لیتی



ہیں۔ جیمس کے خیال میں نفسیات کا مطلب ہی شعوری کیفیات کا مطالعہ کرنا ہے، کیونکہ شعوری کیفیات کے بغیر نفسیات کا مطالعہ نامکمل ہے۔ اس نے یہ بھی اظہار کیا کہ شعور حالانکہ غیر مادی شے ہے، لیکن اس کو جسم سے الگ رکھ کر سوچنا صحیح نہیں ہے۔ اس نے اپنی اس کتاب میں جسم اور روح کے تعلق پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نفسیات میں جسم اور روح کے تعلق پر بحث عام تھی اور اس سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں جب جیمس کا بیان آیا تو اس سے کئی مفکرین کے نظریات کی تردید بھی ہوتی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ شعور اور اعصابی نظام کا بہت گہرا تعلق ہے اور دونوں کی ہم عملی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارا شعور ہمارے اعصابی نظام کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ اس پر مکمل طور پر قابو رکھتا ہے اور یہ کام ہم عملی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں اس نے شعور کو وسیع معنوں میں استعما کرتے ہوئے ذہن کے مفہوم کے مساوی کر دیا ہے۔

ولیم جیمس نے تصورِ حرکی (Ideo motor) کے بارے میں جو خیال ظاہر کئے ہیں، اُن سے اس کے اس نظریہ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حسی عمل اپنے آپ کو حرکی عمل کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اظہارِ بستگی کے بغیر ممکن نہیں، لہذا اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گو یہ عمل بھی حرکی عمل کا باعث ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کو کسی دوسرے تخیل کی جانب سے بندش کا سامنا نہ ہو۔ اپنے اس فرضیہ کی قدر و قیمت کو ظاہر کرنے کے لئے ولیم جیمس نے ایک مثال دی کہ اگر کوئی فرد صبح بستر سے اٹھنے میں کوئی تکلیف محسوس کرتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے ذہن کو تخیلات سے آزاد کر دے اور جیسے ہی وہ اس عمل میں کامیاب ہوگا، وہ اپنے آپ کو چاق و چوبند حالت میں زمین پر کھڑا ہوا پائے گا۔

جب ہم جیمس کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی سائنس دان کو پڑھ رہے ہیں کیونکہ وہ اپنے خیالات کو سائنٹیفک طریقہ پر دلیلوں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ولیم جیمس کو بحیثیت ایک نقاد اگر دیکھا جائے تو اس نے اپنے بعض ایسے ہم



عصر دانشوروں کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جن کو متفقہ طور پر ایک خاص مکتب فکر کا بانی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مثلاً وونٹ کو کئی جگہ اس نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنی کتاب میں Will کے عنوان کے تحت ایک باب میں وہ وونٹ کے عصبی تحریک سے متعلق نظریہ کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وونٹ کا یہ خیال صحیح نہیں۔ عصبی تحریک کا احساس ہر ارادی فعل میں ہوتا ہے کیونکہ ہمارے کچھ افعال میں عصبی توانائی کا استعمال ہوتا ہے اور کچھ میں نہیں۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ اس نے وونٹ کے نظریات کی مخالفت کی، بلکہ ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ وونٹ کی نفسیات میں وسعت نہیں ہے اور وہ حقیقت سے دور ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ وونٹ اپنے نقطہ نظر سے کہیں کہیں خود بھٹک جاتا ہے۔ ولیم جیمس کا یہی بیان بعد میں نظریہ وظیفیت کے حامی دانشوروں نے وونٹ کے نظریات کی تردید میں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ کچھ برسوں سے جرمنی میں ایک نیا مکتب فکر وجود میں آ رہا ہے جس کو خود بنی نفسیات (مشاہدہ باطن) کا نام دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس مکتب فکر سے متعلق مفکرین نے نفسیاتی تجربات پر زور دیا ہے اور ان تجربات کی بنیاد معروض کے جوابات پر منحصر ہوتی ہے جبکہ ان جوابات کا انحصار خود معروض کے مشاہدہ باطن پر ہوتا ہے۔ اس طرح جوابات کی صحت کو بغیر شماریاتی تصدیق کے نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جیمس کے ذہن میں نفسیات کے لئے ایک مثبت نظریہ تھا۔ حالانکہ وہ خود کبھی تجرباتی طریقہ کے لئے تیار نہیں ہوا لیکن اس نے اس طریقہ کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس کو ضروری بھی قرار دیا۔ وہ صاف طور پر نظریہ عملیت (Pragmatism) کا حامی تھا اور اس نے اس نظریہ کی وکالت بھی کی۔ اردو میں اس نظریہ کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ”کسی شے کا معیار حقیقت صرف یہ ہے کہ اس شے کا انسانی اغراض اور انسانی مفادات سے تعلق ہو۔“ اس طرح اس کا خیال تھا کہ نفسیات کے تحت حاصل ہونے والی معلومات کا مقصد فرد کی فلاح و بہبود ہونا لازمی ہے اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب نفسیات کے تحت انسانی کردار کا



مطالعہ کرتے وقت شعور کی اہمیت کو بھی مد نظر رکھا جائے، ساتھ ہی اس کردار کی وجہ تسمیہ تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے خیال میں جذبات اور ہیجانوں اور اندرونی تحریکات کی روشنی میں فرد کی خردمندی اور فہم و فراست کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔

ولیم جیمس نے پہلی بار نظریہ عملیت (Pragmatism) پر اُس وقت اظہار خیال کیا جب وہ برکے میں فلسفیانہ نظریات پر لیکچر دے رہا تھا۔ اس کے بعد اُس نے اس موضوع پر کئی جامعات میں لیکچر دیئے اور پھر ان سب کو مرتب کر کے Pragmatism کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کتاب میں اس نے نظریہ عملیت کو نظریہ انسانیت کے تناظر میں دیکھ کر بحث کی ہے۔ نظریہ عملیت کا مفہوم اگر اردو میں بیان کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں..... ”ایک نظریہ جس کے تحت یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تمام اصولوں یا نظریاتی مسائل پر عملی پہلو سے غور کرنا ضروری ہے۔“ اس نظریہ کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ ہمارے عقائد اگر عملی ہیں، تب ہی انہیں صداقت پر مبنی سمجھنا چاہئے۔ ولیم جیمس کے مطابق نظریہ عملیت کی وضاحت پانچ مختلف صورتوں میں کی جا سکتی ہے۔ پہلی صورت فلسفیانہ مزاج، دوسری حقیقت کا تصور، تیسری معنی کی وضاحت، چوتھی فجائی نظریہ اور پانچویں شکل فلسفیانہ مسائل کو حل کرنے کا طریقہ۔

ولیم جیمس کی اس کتاب میں نظریہ عملیت سے متعلق صداقت پر زیادہ بحث کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح انسان کا رشتہ اس کی صحت اور تندرستی سے ہے، اسی طرح ہر چیز کا رشتہ صداقت سے ہے یعنی ہر شے کا وجود ہی اس کی صداقت پر منحصر ہے۔ کتاب کے آخری باب میں اس نے نظریہ عملیت اور مذہبی عقائد پر بحث کی ہے۔ اس نے مورائی مطلقیت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان اصولوں پر چلتے ہوئے خدا تک رسائی ممکن نہیں۔ وہ کثرتی اور اخلاقی اقدار پر مشتمل ان اصولوں کی حمایت کرتا ہے جو انسان کے اپنے تجربات کی بنیاد پر ہوں۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر خدا کے تصور کو وسیعی معنوں میں ظاہر کرنے کے لئے اگر کوئی لفظ ہے تو وہ صداقت یعنی Truth ہے۔

ولیم جیمس کی ایک اور اہم تصنیف The Will to Believe & Other



Essays in Popular Philosophy ہے جو اُس نے ۱۸۹۷ء میں مکمل کی۔ اس کتاب میں اس کے کئی اہم مقالات شامل ہیں جو اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ جیمس نے نفسیات کے موضوعات پر بڑی حد تک عبور حاصل کر لیا تھا۔ اس کا مشہور مقالہ Is Life Worth Living? بھی شامل ہے۔ اسی مقالہ کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ اس مقالے میں میں نے اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اس کے خیال میں اس کتاب کا نام The Right to Believe ہونا چاہئے تھا۔ اس بات کو اُس نے ایک مثال کے ساتھ بیان کیا ہے.....

”اگر میں کسی پہاڑ کو سر کرنے کی مہم پر ہوں اور میرے راستے میں برف کا ایک تودہ آ جاتا ہے اور آگے بڑھنے کے لئے اُس کو پار کرنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس تودہ کو پار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا یا نہیں۔ دوسری صورت میں میں یقین کر لوں کہ میں اس تودہ کو پار کر جاؤں گا اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ جاؤں۔ یہ زندگی کا ایک اہم سوال ہے۔ اگر میں غلط ثابت ہوا تو موت کے منہ میں چلا جاؤں گا اور اگر میرا یقین، میرا اپنے اوپر اعتماد صحیح نکلا تو مجھے فتح ہوگی۔“

وہ کہتا ہے کہ مجھے اپنے اوپر یقین کرنے کا یا اپنے اوپر اعتماد کرنے کا پورا حق ہے کیونکہ یہی یقین میری کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس کا ایک اہم قول ہے کہ.....

”حقیقی معنوں میں ہمیں کامیابی حاصل ہو ہی نہیں سکتی جب تک ہمیں اپنے اوپر کامیاب ہونے کا یقین نہ ہو۔“

جیمس نے اپنے اس اصول کا مذہبی اصولوں پر بھی اطلاق کیا۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے خدا کے سامنے جھکتے ہیں کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ خدا کا وجود ہے، جبکہ ہمارے پاس ہمارے یقین کے علاوہ اس کے وجود کا کوئی اور ثبوت موجود نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی سماجی ادارہ ہو، کوئی فوج ہو، کوئی تجارتی ادارہ یا تعلیمی ادارہ..... اُس کا ہر فرد اس کا ایک جز ہے اور وہ اپنے فرائض اس لئے ادا کرتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہے کہ اس ادارہ



کا ہر فرد اپنے فرائض ادا کرے گا۔ اس لیے ادارہ کامیابی سے اپنا کام کر سکتا ہے۔ اگر اس سے متعلق ہر فرد کو یہ یقین نہ ہو تو اس ادارہ یا تنظیم سے متعلق کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا بلکہ حصول مقصد کی کوشش بھی نہیں ہوگی۔

اسی تعلق سے ایک جگہ اس نے لکھا تھا کہ ہمارا یقین ہی ہماری کامیابی کی ضمانت ہے، ہماری طاقت ہے اور ہماری توانائی ہے اور جب ہم اپنے یقین، اپنے اعتماد کا سہارا لیتے ہیں تو ہمارے عقیدے کے راز خود بخود ہم پر افشاں ہونے لگتے ہیں۔ اس کا ایک اور قول مشہور ہے کہ.....

”حقیقت اس وقت تک ہمارے سامنے نہیں آتی جب تک ہمیں یقین نہ ہو کہ حقیقت ضرور آشکارہ ہوگی۔“

اسی کتاب کے ایک اور مقالہ Reflex Action and Theism میں اس نے سائنس اور مذہب کا تعلق بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان ہی نہیں بعض حیوان بھی اپنی حس اور عمل کے درمیان تخیل کا استعمال کرتے ہیں اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جب وہ ایک ایسی طاقت کو تسلیم کر لیتے ہیں جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے وجود پر یقین اور اس کا تصور ہی فطرت کے وجود کا جواب ہے۔ اسی کتاب میں اخلاقیات پر بھی ایک مقالہ شامل ہے۔ اس کے خیال میں ضابطہ اخلاق کبھی مستقل نہیں رہتا، یہ وقت کے ساتھ تغیر پذیر ہوتا ہے۔ کسی ایک اصول کو زندگی بھر ہم اپنے اوپر لادے نہیں پھر سکتے۔ معاشرہ کے مطالبات اور مفادات کے مد نظر ان میں تبدیلی آنا ضروری ہے۔

ولیم جیمس کی ایک اور اہم تصنیف The Varieties of Religious Experience جو اس نے ۱۹۰۲ء میں مکمل کی تھی۔ اس کتاب کا زیادہ حصہ اس کے مذہبی خیالات کے اظہار پر مشتمل ہے۔ حالانکہ وہ لکھتا ہے کہ یہ کتاب انسانی فطرت کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کرنے کے بعد لکھی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے اس کتاب میں انسانی فطرت کو مذہبی تجربات سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔



اس کتاب میں اس نے مابعد الطبیات اور ماوراء نفسیات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ہر جگہ اس کے خیالات عیسائیت کی وکالت کرتے ہیں اور غالباً یہی اس کا مقصد تھا۔

ولیم جیمس اپنے زمانہ کا ایک مشہور اور قابل نفسیات داں تھا۔ اس کے نظریات کو نفسیات میں وہ مقام حاصل ہوا کہ ان کی تردید نہیں کی جاسکی اور اس کے نظریات آج بھی نفسیات میں تسلیم کئے جاتے ہیں، بلکہ نفسیات کا ایک حصہ ہیں اور یہ بھی کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ولیم جیمس نے نفسیات میں اپنی قدر و منزلت بہت جلد حاصل کر لی جبکہ وہ بنیادی طور پر ایک نفسیات داں تھا ہی نہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بنیادی طور پر اپنے کیریئر کے تعلق سے بالکل بے پرواہ ہوتے ہوئے بھی اور اپنے ابتدائی سالوں میں نفسیات جیسے عمیق موضوع سے کوئی واسطہ نہ رکھتے ہوئے بھی بہت تھوڑی سی مدت میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ماہر نفسیات اپنی اہمیت کو منوالیا۔ یہ وہ دور تھا جب بہت سے ماہرین نفسیات موجود تھے لیکن کسی نے اس کے نظریات کی تردید نہیں کی۔ اتنا ہی نہیں، اُس کی کتاب نفسیات کے موضوع پر اُس وقت کی تمام نصابی کتابوں کی اہمیت کو کم کر کے اُن پر حاوی ہو گئی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی یہ کتاب ہندوستان میں بھی مقبول ہو گئی اور کئی یونیورسٹی میں اس نے نصابی کتاب کی حیثیت حاصل کر لی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہوا اور ایم۔ اے کے کورس کے لئے نصاب میں شامل کیا گیا۔ ولیم جیمس کی نفسیات میں مہارت کو تسلیم کیا گیا اور اس کے زمانے میں کسی ماہر نفسیات یا فلسفی کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس کے نظریات کی تردید کرتا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں ایک جگہ عورت اور مرد کے تقابل کا ذکر کرتے ہوئے عورت کو مرد کے مقابلہ میں کمزور اور کئی تعلق سے کمتر ظاہر کیا ہے، لیکن اس کے اس بیان کی مخالفت کسی کو نے سے نہیں ہوئی۔ حالانکہ موجودہ دور میں اس کا یہ بیان تسلیم نہیں کیا جاسکتا لیکن اس زمانہ میں یعنی ۱۸۹۰ء میں تو تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس سے یہ ثابت ہوتا



ہے کہ ولیم جیمس کی شخصیت اپنے ہم عصر ماہرین نفسیات میں ایک اہم مقام رکھتی تھی۔ ولیم جیمس کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ خاص طور پر اس کے وہ مقالات بہت اہمیت رکھتے ہیں جو مختلف جرنل میں شائع ہوئے اور وہ لیکچر جو اس نے مختلف جامعات میں دئے۔ اُس نے نفسیات کے بہت سے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُن سب پر اس مضمون میں روشنی ڈالنا تو مشکل ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ولیم جیمس کی تصانیف نفسیات میں آج بھی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ قدیم نفسیات کے بعض اصولوں پر نظر ثانی کی گئی ہے اور کچھ نظریات کی اب تردید کر دی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ولیم جیمس کی نفسیات کو آج بھی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کو نفسیات کا ایک ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔



(نوٹ: اس مضمون میں ایک جگہ لفظ ساختیت استعمال ہوا ہے۔ اس نفسیاتی اصطلاح سے مطلب اس مکتب فکر سے ہے جس کی بنیاد جرمنی میں ڈالی گئی تھی اور اس مکتب فکر کے بانیوں کے مطابق ماہر نفسیات کو کسی بھی چیز کی مکمل ساخت یا مکمل شکل کا مطالعہ کرنا چاہئے اور بعد میں اس کے اجزاء کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور لفظ وظیفیت استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی نفسیات کا ایک مکتب فکر ہے جس کی بنیاد نظریہ ثنویت پر تھی اور اس کے مطابق نفسیات کے تحت سب سے پہلے انسانی استعداد اور صلاحیتوں کی چھان بین کرنی چاہئے۔)



# ایوان بیولوف

Ivan Pavlov (1849-1936)

رُوس کا مشہور ترین دانشور اور ماہر علم الاعضاء اوّان بیولوف دُنیا بھر میں اس لئے مشہور ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں علم الاعضاء میں قابل قدر تحقیقات کی ہیں اور اسی موضوع پر اس کو نوبل انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ علم الاعضاء کی تحقیق میں مصروف بیولوف نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس نے نفسیات میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا اور اس لئے اس کی خدمات علم النفس کے ساتھ قیامت تک زندہ رہیں گی۔ نفسیات میں کلاسیکی مشروطیت Classical Conditioning کا نظریہ اسی روسی ماہر بیولوف کے تجربات کا نتیجہ تھا جو ۱۸۹۰ء میں پیش کیا گیا تھا اور اس کے بعد اس نظریہ پر مزید پیش رفت ہوتی رہی اور اس کے تحت کئی بنیادی اصول وضع کئے گئے جن پر آموزش کے تعلق سے بہت سے تجربات کئے گئے۔

کلاسیکی مشروطیت کے بارے میں اگر کچھ کہا جائے تو اس کی تشریح خود بیولوف کے تجربہ کے ساتھ ہی کی جاسکتی ہے۔ بیولوف نے مختلف غدود کے وظائف اور ان سے خارج ہونے والی رطوبت کے بارے میں کافی تجربات کئے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ کتے کے منہ میں تیار ہونے والے لعاب کی مقدار کی جانچ کی جائے اور یہ پتہ لگایا جائے کہ اس رطوبت کا اس کے نظام ہضم پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس نے کچھ دنوں تک یہ کیا کہ کتے کو غذا دینے سے پہلے وہ ایک گھنٹی بجا دیتا تھا اور اس کے کچھ دیر بعد وہ اس کو



کھانے کو دیتا تھا۔ اس طرح اس نے تقریباً بیس دن تک یہ معمول رکھا۔ اس نے اکیسویں دن گھنٹی بجائی تو کتے کے منہ سے لعاب ٹپکنا شروع ہو گیا۔ حالانکہ اس کی غذا اس کے سامنے نہیں لائی گئی تھی۔ اس نے مسلسل تجربات کے بعد کتے کے منہ سے نکلنے والے لعاب کی پیمائش کی۔ حالانکہ اس کا یہ تجربہ علم الاعضاء سے متعلق تھا اور وہ نظام انہضام پر تحقیق کر رہا تھا، لیکن اس تجربہ سے نفسیات کو ایک نیا موضوع ملا اور اسی تجربہ کی وجہ سے مشروطیت کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اس سلسلہ میں اس نظریہ کی تفصیل سے وضاحت کرنے کے لئے خاکسار اپنی کتاب ”اصطلاحات نفسیات: تشریح اور تفہیم“ دی گئی تشریح نقل کر رہا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ..... ”جب کوئی فعل کسی غیر فطری مہیج سے وابستہ ہو جاتا ہے تو اس کو مشروطیت کہتے ہیں۔“ بیولووف کے تجربہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کتے کے منہ سے لعاب خارج ہونے کا عمل گھنٹی کی آواز سے وابستہ ہو گیا تھا جبکہ گھنٹی کی آواز اس فعل کے لئے غیر فطری مہیج ہے۔ اس طرح اس نے مشروطیت کو ثابت کیا اور اس کے کچھ اصول بنائے۔ مثلاً.....

۱۔ غیر فطری مہیج فطری عمل سے وابستہ ہونے کے بعد ہی مشروطیت کو قائم رکھ سکتا ہے اور جب ان میں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو مشروطیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

۲۔ اگر مشروط اور غیر مشروط مہیج کے ساتھ تکرار کی جائے تو ان میں مضبوط تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

۳۔ مشروطیت میں جن مہیجات کا استعمال کیا جاتا ہے، اگر اس کے علاوہ کوئی نیا مہیج وہاں موجود ہو تو مشروطی جوابی فعل پر اثر پڑتا ہے۔

ہم موجودہ ترقی یافتہ علوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر علم قدم بہ قدم ترقی کرتا ہوا اس منزل تک پہنچا ہے۔ اسی طرح نفسیات کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ آج جس مقام پر ہے، اس تک پہنچنے میں اس کو صدیاں لگی ہیں۔ اس کی ترقی اور نشوونما کی کوششوں میں نہ جانے کتنے مفکرین کا ہاتھ ہے۔ ان میں ایک اہم نام بیولووف کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی ماہرین نفسیات کو بیولووف کے تجربہ کے



بارے میں معلوم ہوا، وہ اس کو آزمانے اور مزید پیش رفت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جب ہر جگہ سے اس کے وہی نتائج برآمد ہوئے تو اس کو نفسیات میں شامل کر لیا گیا۔ حالانکہ اس تجربہ سے نفسیات کو تو فائدہ ہوا ہی، لیکن علم الاعضا کو اس تجربہ سے بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ بیولووف نے اس دریافت کے بعد یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا انسان میں بھی غدد کے عمل کو مشروطیت کے تحت لایا جاسکتا ہے۔ اس خیال کو لے کر اس نے عصبی نظام کے تعلق سے بھی کئی تجربات کئے اور اس نظام کے وظائف پر اصول وضع کئے۔

چونکہ اس کی تحقیقات کی بنیادوں پر نفسیات میں کئی نظریات پیش کئے گئے، اس لئے یہ انصاف نہ ہوگا اگر اس کتاب میں ہم بیولووف کو دوسرے ماہرین نفسیات کی فہرست میں شامل نہ کریں اور اس کے حالات زندگی نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے قارئین سے پوشیدہ رکھیں۔ اسی خیال سے بیولووف کو بھی ماہرین نفسیات کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے اور اس کا تذکرہ بھی اس کتاب کے ایک حصہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں قارئین کی دلچسپی کے لئے ایک اور تجربہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ تجربہ بھی ماہرین نفسیات نے مشروطیت کے اصولوں کو سامنے رکھ کر کیا۔ ایک بچہ کو بستر پر پیشاب کرنے کی عادت تھی۔ حالانکہ وہ صبح اٹھ کر بہت شرمندہ ہوتا تھا، لیکن اس کو اس عادت سے چھٹکارہ نہیں مل پاتا تھا۔ اس کی عمر تقریباً دس سال تھی اور اس کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ اگر عمر کے بڑھتے یہ عادت نہیں چھوٹی تو اس کی شرمندگی بڑھ جائے گی۔ اس کو ایک ماہر نفسیات کے پاس لے جایا گیا۔ ماہر نفسیات اس ٹیم کا ممبر تھا جو بیولووف کے تجربہ پر مزید تحقیقات کر رہی تھی۔ اس ماہر نفسیات نے اس بچہ پر ایک تجربہ کیا۔ اس کے بستر کے نیچے ایک ایسا برقی آلہ نصب کر دیا گیا جو گیلیا ہوتے ہی اپنا کام کرنے لگتا تھا۔ اس نے اس آلہ میں ایک ایسا عنصر لگایا تھا جو اگر گیلیا ہو جائے تو اس میں سے برقی رو گزر سکتی تھی اور اس طرح اس لڑکے کے سراہنے رکھی ہوئی گھنٹی بجنے



لگتی تھی، جس کی وجہ سے اُس لڑکے کی نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ اس کی ماں نے ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق اس کو ہدایت کردی تھی کہ اگر اس کی نیند اس طرح ٹوٹ جاتی ہے تو وہ اپنے بستر کی چادر خود تبدیل کرے گا اور جس دن وہ بستر پر پیشاب نہیں کرے گا اُس دن اس کو انعام کی صورت میں دو روپے دیے جائیں گے۔ لیکن یہ رقم اُس کو ہر ماہ کے آخر میں دی جائے گی۔ اس طرح بچے نے یہ کوشش کی کہ وہ پیشاب کی خواہش ہوتے ہی جاگ جائے۔ اس طرح اُس کو بستر بدلنے سے بھی راحت مل جائے اور دو روپے بھی انعام ملیں۔ اس طرح وہ بچہ ایک مہینے تک اس ڈاکٹر کے زیر علاج رہا۔ اس دوران معلوم ہوا کہ پہلے دس دن تک اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، دوسرے دس دن میں اُس نے دو بار بستر گھسیا اور تیسرے عشرہ میں اس نے صرف ایک بار بستر پر پیشاب کیا۔ ڈاکٹر نے اس کو مزید ایک ماہ تک اس تجربہ سے گزارہ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرا مہینہ ختم ہونے تک اس کی بستر پر پیشاب کرنے کی عادت ختم ہو گئی۔ اس تجربہ میں ماہر نفسیات نے مشروط اضطرار یہ کے اصول کا استعمال کیا۔

دراصل بیولوف کا نفسیات سے کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ اس نے پوری زندگی عضویات سے متعلق تجربات میں گزاری۔ لیکن کتوں پر تجربات کے دوران مشروط اضطرار یہ کی دریافت کے بعد اس کا نام نفسیات میں بھی مشہور ہو گیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بیولوف نے اتفاقاً ایک ایسی دریافت کی جو نفسیات میں ایک نئے موڑ کا موجب بنی اور جس کی وجہ سے نفسیات کا رخ بدل گیا۔ اتفاقاً اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ بیولوف کا نفسیات میں کوئی اختراع کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ نظام ہضم پر تحقیقات میں مصروف تھا اور اس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا، جس کے ذریعہ ایک کتے کے منہ میں موجود غدود سے لعاب کے اخراج کی پیمائش کی جاسکتی تھی۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ مختلف حالات میں ان غدود سے جو رطوبت خارج ہوتی ہے، اس کی مقدار کی پیمائش کی جاسکے۔ اس نے کتے کو مختلف طریقوں سے خوراک دی اور ہر بار لعاب کی مقدار کی پیمائش کی۔ اس آلہ میں اس بات کا خاص طور پر دھیان رکھا گیا تھا کہ رطوبت کی



پیدائش پر ماحول کا کوئی اثر نہ ہو سکے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بیولوف سے پہلے ایک اور روسی ماہر علم الاعضاء نے *Reflexes of Brain* نام کی ایک کتاب ۱۸۶۳ء میں شائع کی تھی، جس میں اس نے بنیادی اضطرابیہ کے تحت کردار کی توضیح کی تھی اور اسی خیال کو لے کر بیولوف نے اس میں پیش رفت کی، کیونکہ اس کتاب میں دئے گئے خیال کو کسی نے اہمیت نہیں دی تھی اور اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن بیولوف نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بنیادی خیال اسی کتاب سے لیا گیا تھا اور اسی کی بنیاد پر تحقیقات کا کام شروع کیا گیا۔ حالانکہ بیولوف کی تحقیقات علم الاعضاء کے تحت عمل میں لائی گئی تھیں۔ لیکن چونکہ یہ تحقیقات دماغ کے عمل سے بھی تعلق رکھتی تھیں، اس لئے نفسیات کا موضوع بن جاتی ہیں اور نفسیات پر بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ بیولوف زندگی بھر عضویات پر تحقیقات کرتا رہا اور ان تحقیقات کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ ۱۹۰۴ء میں اس کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔

بیولوف مرکزی روس میں ریازان شہر میں ۱۴ ستمبر ۱۸۴۹ء کو ایک مذہبی رہنما کے گھر پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم اسی گاؤں کے چرچ میں ہوئی اور ثانوی تعلیم کے لئے وہ شہر کی ایک مذہبی درسگاہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روس کے ادبی حلقہ میں D. I. Pisarve کا کافی اثر تھا اور اس کو روسی زبان کے ادب کا ایک اہم ستون تسلیم کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی داکٹر سیشناف علم الاعضاء میں کافی مشہور ہو چکا تھا اور اس کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ پورے روس میں اس کو علم الاعضاء کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں ماہرین سے بیولوف بہت متاثر تھا اور اس نے ان کو اپنا رول ماڈل بنا کر کچھ کر گزرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے مذہبی تعلیم کو منقطع کر کے اپنی زندگی کو سائنس کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۸۷۰ء میں وہ سائنس کے شعبہ میں طبیعیات اور ریاضی مضامین کے ساتھ کالج میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصد طے کر لیا کہ وہ علم الاعضاء میں مہارت حاصل کرے گا۔ وہ اپنے مقصد کے حصول



میں اس قدر محو رہتا تھا کہ اس کو کسی اور بات کا شوق ہی نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ زندگی بھر Physiology سے متعلق تحقیقات کرتا رہے گا اور اسی علم کے مطالعہ میں اپنا تمام وقت صرف کرے گا۔ اس کی یہ کوشش رنگ لائی اور اس نے کالج کی تعلیم کے دوران ہی لبلبہ کے اعصاب پر ایک بہت ہی جامع اور معلومات سے بھرپور مقالہ Afanasyev کے عنوان سے تحریر کیا، جس نے نہ صرف کالج میں بلکہ علم الاعضاء سے متعلق پورے حلقہ میں ایک دھوم مچا دی اور اس کو سنہری تمغہ سے نوازا گیا۔ وہ اپنے اس مقالہ کی وجہ سے اس قدر مشہور ہو گیا کہ دوسرے علاقوں سے نہ صرف علم الاعضاء کے طالب علم بلکہ ڈاکٹر بھی اس سے ملنے کے لئے آنے لگے، تاکہ وہ اس معاملہ میں اس سے تبادلہ خیالات کر سکیں۔

۱۸۷۵ء میں بیولووف نے کالج کی تعلیم مکمل کی اور امتیازی شان سے نیچرل سائنس میں ڈگری حاصل کی۔ اس کی اس کامیابی سے اس کو تقویت ملی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پریکٹس کرنے کے بجائے اپنی تعلیم جاری رکھے گا۔ اس لئے اس نے اعلیٰ تعلیم کے لئے Academy of Medical Surgery میں داخلہ لے لیا۔ اس نے ۱۸۷۹ء میں تیسرے مرحلہ کا کورس بھی امتیازی پوزیشن سے مکمل کیا اور ایک بار پھر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ کچھ دن بعد ایک مسابقتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس نے اس اکادمی کی فیلوشپ بھی حاصل کر لی، ساتھ ہی اس کو روس کی شہرہ آفاق کلینک S.P. Botki میں Physiological Laboratories کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا اور شاید یہی اس کی منزل تھی۔ کیونکہ یہاں اس کو مسلسل تحقیق و تجربات کے مواقع نصیب ہوئے اور وہاں سے ایک اہم مقالہ The centrifugal nerves of the heart پر ۱۸۸۳ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ یہ مقالہ عصبیات پر ایک مدلل بحث اور تحقیق کے بعد تحریر کیا گیا تھا جس میں نہ صرف دل کے اعصاب پر تحقیق کے نتائج تھے بلکہ نظام عصبی پر بھی تفصیل سے روشنی دالی گئی تھی۔

۱۸۹۰ء میں بیولووف کو روس کے مشہور انسٹی ٹیوٹ Institute of



Experimental Medicines کا ڈائریکٹر بنانے کے ساتھ ہی اس ادارہ کو نئے سرے سے منظم کرنے کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔ وہ ۴۵ برس تک اس ادارہ سے جڑا رہا۔ یہ اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یہ انسٹی ٹیوٹ روس میں علم الاعضاء پر تحقیقات کا سب سے اہم مرکز کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ اس نے ۱۹۰۰ء تک اس انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق کے کام کا خود معائنہ کیا اور اپنی تمام تر توجہ نظام انہضام پر مرکوز رکھی۔ اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقات کی پیش رفت سے ہی اس نے جانوروں پر تجربات کا سلسلہ شروع کیا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے غدد اور اعصابی نظام کے تعلق کا پتہ لگایا اور اس طرح نفسیات میں ایک اہم نظریہ وضع کیا۔

۱۹۰۳ء میں جب ۱۴ ویں International Medical Congress جو Madrid میں منعقد ہوئی تھی، اس میں اس نے اپنا شہرہ آفاق مقالہ The Experimental Psychology and Psychopathology of Animals کے عنوان سے پیش کیا جس میں اس نے مشروطیت سے متعلق مختلف مفروضات کا تفصیل سے ذکر کیا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ مشروط اضطراب یہ ایک بہت ہی اہم نکتہ ہے جس کے ذریعہ ہم حیوانات اور انسانوں میں اس بات کا مطالعہ کر سکتے ہیں کہ ان میں ایک مکمل طور پر نشوونما پانے والا جوابی فعل ان کے ماحول کے ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس ردِ عمل کی نفسیاتی اہمیت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ بیولوگ نے عضویات پر بے شمار تجربات کئے اور اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ساختہ اضطراب یہ دراصل Cerebral Cortex میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں بیولوگ کوکمبرج یونیورسٹی نے بھی اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا اور اس کی تحقیقات کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں پیرس کی میڈیکل اکادمی کی سفارش پر فرانس کا سب سے بڑا انعام دیا گیا۔

انقلاب روس کے بعد بھی بیولوگ کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور ملک کے سیاسی حالات میں غیر معمولی تبدیلیوں کے باوجود وہ اپنے کام میں مصروف رہا اور اس



کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کو لینن کے دستخط کے ساتھ اس کو ایک توصیفی سند عطا کی گئی، جس میں یہ اعتراف کیا گیا کہ..... ”سائنس میں بیولووف کی غیر معمولی خدمات پوری دنیا کے عوام کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔“ اور بیولووف کی شہرت روس کی حدود سے نکل کر دنیا کے کونے کونے میں پہنچنے لگی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اکیلا ایسا فرد تھا جس کی کوششوں کی وجہ سے اور اس علم میں تحقیقات کا سلسلہ شروع کرنے کی وجہ سے سوویت یونین سائنٹیفک تحقیقات کا مرکز سمجھا جانے لگا۔ بیولووف نے اپنی تمام تر توانائی سائنسی تحقیقات میں لگا دی اور ساتھ ہی سائنسی اصطلاحات کی جانب بھی توجہ دیتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے تحت کام کرنے والی اور سائنسی تحقیقات میں مصروف ہر تنظیم دنیا کی عظیم ترین انسٹی ٹیوٹ تسلیم کی جاتی تھی اور دنیا بھر میں یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ بیولووف ایک عظیم ترین ماہر علم الاعضاء ہے۔ اس کی درسگاہ سے نکلنے والا ہر طالب علم فخر محسوس کرتا تھا کہ اس نے بیولووف جیسے ماہر کے تحت علم حاصل کیا ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ پندرہویں International Physiological Congress اگست ۱۹۳۵ء میں ماسکو اور لینن گراڈ میں منعقد کی گئی اور دنیا نے یہ تسلیم کیا کہ سوویت روس کو یہ اعزاز صرف بیولووف کی خدمات کی وجہ سے ملا ہے۔

۲۷ فروری ۱۹۳۶ء کو یہ عظیم سائنسداں اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک، ماہر علم الاعضاء دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت کا غم صرف لینن گراڈ میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک روس میں منایا گیا، ساتھ ہی پوری دنیا نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک عظیم ہستی سے محروم ہو گئی جس کی کمی کو کبھی دُور نہیں کیا جاسکتا۔



# سگمنڈ فرائڈ

Sigmund Freud ( 1856-1939)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فرائڈ کا نام سنتے ہی ذہن میں ایک ایسی شخصیت کا تصور ابھر کر آ جاتا ہے جو زندگی بھر اپنے معاصرین کی تنقید کا نشانہ بنا رہا، اس کے نظریات کو (بغیر سوچے سمجھے) مسترد کر دیا گیا اور اس کے مفروضات کا مذاق اڑایا گیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج سگمنڈ فرائڈ کو جدید نفسیات کا بانی اور ایک عہد ساز مفکر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کے نظریات جو اس کے زمانہ میں تسلیم نہیں کئے گئے تھے وہی آج نفسیات کا اہم حصہ ہیں اور ان کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اگر ان کو آج مسترد کر دیا جائے تو علم النفس بالکل بے جان ہو کر رہ جائے گا۔ یہ اس کی بد نصیبی تھی کہ اس کے خیالات کو ایک عام آدمی ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے دانشوروں نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ لیکن آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرائڈ کے جن نظریات کی مخالفت کی گئی اور ان کو مسترد کر دیا گیا، وہی نظریات جدید نفسیات کا اہم حصہ ہیں۔ اب فرائڈ کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس کو نہ صرف جدید نفسیات کا بانی بلکہ اپنے دور کا ایک عظیم دانشور اور عہد ساز مفکر مانا جاتا ہے۔ آج فرائڈ کا تعارف تقریباً ہر زبان میں ان ہی الفاظ میں کیا جاتا ہے اور یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ صرف تحلیل نفسی کا موجد ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کا ایک قابل معالج، ایک ماہر علم الاعضاء، اور محقق ہی نہیں بلکہ نفسیات کے تعلق سے ایک مقتدر ہستی اور با اثر مفکر تھا۔ وہ یقینی طور پر ایک عظیم اور قابل احترام



شخصیت کا مالک تھا جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مریضوں کی بہبودی کے لئے صرف کیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانے میں نفسیاتی مریضوں کی حالت قابلِ رحم تھی اور ان کو پاگل اور دیوانہ سمجھ کر ان کو جسمانی اذیتیں دی جاتی تھیں اور شہر سے دور ایسے پاگل خانوں میں رکھا جاتا تھا جہاں کے ماحول کا حال سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

فرائڈ جیسی متنازعہ شخصیت کے لئے اس طرح مدح سرائی شاید کچھ قارئین کو پسند نہ آئے کیونکہ ان کے ذہنوں میں اب بھی فرائڈ کی شخصیت کے تعلق سے وہی نقوش باقی ہیں جو اُس کے ناقدین نے پیدا کئے تھے۔ لیکن آج نفسیات کی ترقی یافتہ شکل میں فرائڈ کے ان نظریات اور مفروضات پر اگر غور کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زمانے میں اس پر جو اعتراضات کئے گئے، وہ غیر واجب تھے اور اس کی مخالفت کرنے والے صحیح نہیں تھے۔ آج نفسیات میں فرائڈ کے نظریات کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ اُن پر ہی جدید نفسیات کے بنیادیں کھڑی ہیں اور آج جدید نفسیات سے ان نظریات کو خارج کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ان حالات میں کیا یہ ضروری نہیں کہ فرائڈ کے متعلق جو خیالات ہمارے ذہنوں میں گھر کر چکے ہیں، اُب اُن میں تبدیلی لائیں؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فرائڈ پر جو اعتراضات کیے وہ صحیح تھے تو پھر اس کے پیش کیے گئے نظریات کی نفسیات میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے، اور اگر مان لیا جاتا ہے کہ فرائڈ کے نظریات اور مفروضات کے بغیر جدید نفسیات کو مکمل سمجھا ہی نہیں جاسکتا، تو پھر اس کی شخصیت کے متعلق اپنے ذہنوں کو بھی صاف کر لینا چاہیے۔ خاص طور پر نئی نسل کو جدید تقاضوں کے پیش نظر علم النفس کے لئے اس کی خدمات کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

جہاں تک فرائڈ کے ان نظریات کا تعلق ہے جو جنس سے متعلق تھے، خاص طور پر طفلانہ جنسیت، تو ان کی مخالفت کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں جنس کے تعلق سے عوام کے ذہنوں پر قدامت پسندی کا سایہ تھا اور ان موضوعات پر بحث کرنا ہی



معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت فرائڈ کے وہ نظریات تنازعہ کا باعث بنے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی فرائڈ کے بہت سے ایسے مفروضات تھے جن کا تعلق براہ راست جنس سے نہیں تھا، اور وہ تحلیل نفسی کے تحت پیش کیے گئے تھے۔ اُن کو بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر تحلیل نفسی کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں شعور و لاشعور کے فلسفہ کو اچھی طرح سمجھنا لازمی ہے۔ اس کے بغیر ہم تحلیل نفسی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اسی طرح انا کے تعلق سے فرائڈ کے نظریہ کی کس طرح تردید کی جاسکتی ہے؟ اس زمانے میں ایڈ، انا اور فوق الانا کا مفہوم عجیب و غریب معلوم ہوتا ہو، لیکن آج ہم اس نظریہ کو تسلیم کیے بغیر نفسیات میں پیش رفت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کے مخالفین میں اس زمانے کے کئی مشہور مفکرین بھی شامل تھے اور ان کے بیانات عام لوگوں کے خیالات بدلنے کے لئے کافی تھے۔ نظریات کی یہ مخالفت ایک معاصرانہ تعصب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اگر کسی مفکر کا ایک مفروضہ ناقابل یقین ہے تو اس کے تمام مفروضات قابل تردید ہوں گے، یہ کوئی ضروری نہیں۔ جبکہ فرائڈ کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کے چند نظریات کی مخالفت کے بعد اس کی شخصیت تنازعات سے گھر گئی اور اس کی ہر بات پر اعتراض ہونے لگا۔ معاصرانہ تعصب کی ایک مثال یہ ہے کہ اس زمانے کے ایک مشہور ماہر نفسیات جان مارگن John Morgan جو اس وقت Northwestern University میں نفسیات کا پروفیسر تھا، اس نے Psychology کے نام سے ایک کتاب لکھی جو پہلی بار ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور اتنی مقبول ہوئی کہ دُنیا بھر میں کئی جامعات میں اس کو نصابی کتاب کی شکل میں منتخب کر لیا گیا۔ یہ کتاب آج بھی نفسیات کے طلباء میں مقبول ہے۔ سگمنڈ فرائڈ ۱۹۳۹ء میں انتقال کر گیا تھا اور اپنی زندگی کے آخر تقریباً چالیس برس تک اپنے مخالفین کا سامنا کرتا رہا اور مارگن بھی اس کے مخالفین میں شامل تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں کہیں ایک جگہ بھی فرائڈ کے کسی ایک نظریہ کا ذکر نہیں کیا۔ اتنا ہی نہیں، اُس نے بہت سے ایسے مفروضات کو بھی نظر انداز کر دیا جن کے بغیر آج نفسیات کے



مطالعہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر اس ضخیم کتاب میں شعور و لاشعور کا کہیں ذکر ہی نہیں۔ قارئین خود اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا ہم شعور و لاشعور کے وجود سے انکار کر کے نفسیات کو صحیح طریقہ پر سمجھ سکتے ہیں؟ اس کتاب کے آخر میں ماہرین نفسیات کی ایک فہرست دی گئی ہے، جس میں تقریباً ۳۲۰ نام شامل ہیں۔ لیکن اُس فہرست میں نہ فرائڈ کا نام شامل ہے اور نہ اُن کے اُن ساتھیوں کا، جنہوں نے نفسیات میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ نفسیات کی ایسی کتاب میں، جو نفسیات کے طلباء کو اس علم کے اصولوں سے واقف کراتی ہے، ایسے ماہرین نفسیات کے خیالات کو شامل نہ کرنا جنہوں نے نفسیات کو حیات نو بخشی اور جن کی وجہ سے نفسیات عوام میں مقبول ہوئی، معاصرانہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟

ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فرائڈ کے چند نظریات آج بھی پہلی نظر میں آسانی سے تسلیم نہیں کیے جاسکتے، جب تک اُن کی گہرائی میں جا کر اُن کا مفہوم نہ سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے وہ نظریات اُنیسویں صدی میں عوام میں کس طرح تسلیم کیے جاسکتے تھے؟ یہاں سوال عام لوگوں کا نہیں، سوال اُن ماہرین اور مفکرین کا ہے جو اس علم کے علمبردار سمجھے جاتے تھے اور جو نفسیات کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر فرائڈ کے ہر نظریہ کی مخالفت ہوتی تھی؟ اس معاملہ میں کیا فرائڈ کی شخصیت کے منفی خصائص اور اس کا مزاج ذمہ دار تھا؟ یہ اُس زمانے کے تہذیبی اور اخلاقی اقدار، اگر غور کریں تو یہ دونوں ہی وجوہات تھیں۔ فرائڈ کی عامرانہ طبیعت، اپنی رائے پر اٹل رہنے کا رجحان اور اپنے سامنے دوسروں کی رائے کو اہمیت نہ دینے کی عادت کی وجہ سے اُس کے دوست بھی نالاں تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس زمانے کے میں جو اخلاقی اقدار کا پاس تھا، وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ فرائڈ کے وہ نظریات تسلیم کر لیے جائیں جو جنس سے متعلق تھے اور ان پر کھل کر بحث نہیں ہو سکتی تھی۔

مثال کے طور پر فرائڈ ایک ماہر عصبیات کی حیثیت سے عصبی بیماریوں کا علاج کیا



کرتا تھا۔ وہ اپنے مریضوں کے حالات کا گہرائی سے مطالعہ کرتا تھا تا کہ مرض کے اسباب کا پتہ لگا سکے۔ اس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک کامیاب معالج تو تھا ہی، لیکن وہ اپنے اس پیشہ کو تحقیق و تجربات کے لئے بھی استعمال کرتا تھا اور ظاہر ہے اس کے پس پشت اس کا مقصد مریضوں سے ہمدردی اور ان کے علاج کے بہتر طریقوں کی تلاش ہی تھا۔

سگمنڈ فرائڈ کی خواہش تھی کہ وہ ایک سائنس داں بنے اور حیاتیات اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ ابتدا سے یہ سوچتا تھا کہ وہ سائنس میں کسی نئی دریافت سے دنیا کو روشناس کرائے۔ ویانا یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد اُس نے اپنی تمام تر توجہ حیاتیات پر دی اور پھر نہ جانے کیوں وہ علم الاعضاء کی جانب متوجہ ہو گیا۔ غالباً اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں ویانا یونیورسٹی کا یہ شعبہ ایک عظیم جرمن سائنسداں Ernst Brucke کے ماتحت تھا، جس کا نام دنیا بھر میں مشہور تھا اور وہی Physiological Laboratory کا ڈائریکٹر تھا۔ فرائڈ نے اپنے آپ کو چھ سال کے لئے اس تجربہ گاہ سے منسلک کر دیا تا کہ وہ اس عظیم سائنسداں کے ماتحت کام کر کے کچھ حاصل کر سکے۔ ۱۸۸۱ء میں اس کو ڈاکٹری کی ڈگری مل گئی۔ کچھ عرصہ تک ویانا کے جنرل اسپتال میں کام کرنے کے بعد اس نے اپنا خود کا کلینک قائم کیا۔ وہ ایک ماہر عصبیات بھی تھا، اس لئے وہ دماغی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کے علاج میں مصروف ہو گیا۔

ویانا یونیورسٹی میں بروک کے ماتحت چھ سال تک کام کرنے کی وجہ سے اُس میں تحقیق کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ صرف ایک معالج ہی نہیں، بلکہ محقق بھی تھا وہ ہر مریض کے حالات کا مکمل جائزہ لیتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ وہ مرض کے اسباب کا پتہ لگا سکے۔ اس نے سینکڑوں مریضوں کا علاج کیا جو ہیسٹریا اور دوسرے دماغی امراض کا شکار تھے۔ اس کا پرانا دوست جوزف برانز بھی اس کی اس تحقیق میں ساتھ دیتا تھا کیونکہ وہ بھی اسی قسم کے مریضوں کا علاج کیا کرتا تھا۔



دونوں نے مل کر ہسٹیریا کے بارے میں کافی تحقیقات کیں اور ایک کتاب Studies in Hysteria کے نام سے تصنیف کی جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی۔ فرائڈ نے یہ محسوس کیا جو خواتین ہسٹیریا کا شکار ہوتی ہیں، وہ عام طور پر اپنے ماضی کے تجربات سے کافی پریشان اور خوفزدہ رہتی ہیں۔ جب وہ گہرائی میں گیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان میں سے بہت سی ایسی مریض ہوتی ہیں جن کو بچپن میں ہی جنسی تجربات سے واسطہ پڑ گیا ہو اور کمسن ہوتے ہوئے وہ اپنے رشتہ داروں کی حوس کا شکار ہو گئی ہوں اور ان کے یہ تجربات زندگی بھر ان کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں اور یہی کشمکش اور ذہنی تلامطم کی کیفیت اس مرض کا اصلی سبب ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنے اس خیال کو جو سف برائر کے سامنے رکھا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ بات ویانا کے عوام کے سامنے لائی جائے، تاکہ وہ اپنی کمسن لڑکیوں کی حفاظت کی طرف توجہ دیں۔ لیکن برائر اس کے اس خیال سے متفق نہیں تھا اور اس نے فرائڈ کو خبردار کیا کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اس کے لیے مصیبت کا باعث بنے۔ کیونکہ اس زمانے میں فضا یہودیوں کے موافق نہیں تھی اور اس نازک مسئلہ پر اظہار خیال سے ایک وبال کھڑا ہو سکتا تھا۔

اس زمانے میں پیرس میں Dr. Jean Charcot کا نام بہت مشہور تھا اور وہ ہسٹیریا کے مریضوں کا علاج ”عمل تنویم“ کے ذریعہ کیا کرتا تھا۔ فرائڈ نے پیرس جا کر ڈاکٹر شارکو سے عمل تنویم کے ذریعہ علاج کی تربیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ تقریباً ۹ ماہ پیرس میں مقیم رہا اور ڈاکٹر شارکو کے ساتھ کام کیا۔

جب وہ پیرس سے واپس آیا تو ہسٹیریا کے بارے میں اس کے پاس کافی مواد تھا۔ اس نے اس موضوع پر ایک رپورٹ تیار کی اور اس میں اس بات کا اظہار کیا کہ ہسٹیریا عضویاتی مرض نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک اعصابی اور ذہنی مرض ہے، جس کے اسباب مریض کے ذہن میں اس کے ماضی کے تجربات کی شکل میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ دوسرے اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ بقراط کے زمانے سے یہ خیال کیا جاتا رہا تھا کہ یہ مرض صرف عورتوں کو ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ مرض مردوں کو بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی



علامات کچھ مختلف ہو سکتی ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ اس کی اس دریافت کی قدر کی جائے گی۔ اس لیے اُس نے یہ رپورٹ ویانا کی میڈیکل سوسائٹی کو پیش کی۔ لیکن فرائڈ کا خیال غلط نکلا۔ میڈیکل سوسائٹی نے اس کی اس رپورٹ کو مسترد کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، میڈیکل سوسائٹی کے حلقہ میں اس کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ یہ اس کی زندگی میں پہلی شکست تھی۔ لیکن اپنی اس شکست سے وہ حراساں نہیں ہوا اور اپنا کام جاری رکھا۔

عہدِ طفلی میں جنسی احساس کے تعلق سے اس کے نظریات سب سے زیادہ تنازعہ کا باعث بنے اور ان ہی نظریات کی وجہ سے فرائڈ کی شخصیت بھی داغدار ہوئی اور ان ہی کی وجہ سے اس کو اپنے معاصر دانشوروں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اتنا ہی نہیں، جب اس کے دوست جوسف برائر نے بھی ان کو تسلیم نہیں کیا تو فرائڈ نے اپنے عزیز دوست کا ساتھ بھی چھوڑنا گوارہ کیا، لیکن اپنی رائے پر اٹل رہا۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فرد جب بالغ ہو جاتا ہے (یعنی جنسی پختگی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے) تو اُس میں جنسی تحریک جاگنے لگتی ہے اور وہ توالد اور تناسل کے فطری مقصد کو پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سن بلوغت سے پہلے فرد میں جنسی احساس پیدا ہونے کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا لیکن فرائڈ کے خیال میں جنسی زندگی کی ابتدائی بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی ہو جاتی ہے اور بچے اس کا اظہار واضح طور پر کرنے لگتے ہیں۔ یہ مظاہر جو بچپن کے آغاز میں رونما ہوتے ہیں، وہ نشوونما کے ایک باقاعدہ نظام کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان مظاہر میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور عمر کے پانچویں سال کے اختتام تک یہ اپنے نقطہ سروج کو پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے نظریہ کے مطابق بچہ اپنے ساتھ ایک حاجت لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس کی یہ حاجت اس وقت پوری ہوتی ہے جب وہ اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔ فرائڈ اس کو جسمانی آسودگی کا نام دیتا ہے۔ فرائڈ کے خیال میں ایک شیرخوار بچہ جب چوسنے کے عمل کے ذریعہ غذا حاصل کرتا ہے تو اس حاجت روائی کے بعد اس کو جسمانی تسکین کا احساس ہوتا ہے اور یہی جسمانی آسودگی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی جنسی آسودگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس آسودگی کو



حاصل کرنے کے لئے بچہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے میکا کی طریقہ پر عمل کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انسان میں پیدا ہونے والی ہر خواہش ایک تناؤ کا سبب ہوتی ہے اور اس تناؤ کا اخراج اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی خواہش کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر حاجت ایک توانائی پیدا کرتی ہے اور اس توانائی کے ذریعہ ہم حاجت روائی کا عمل کرتے ہیں، اور جب اس توانائی کا اخراج ہو جاتا ہے تو ایک قسم کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔

فرائڈ کے مخالفین کا کہنا تھا کہ بچہ جب اپنی ماں کے ذریعہ غذا حاصل کرتا ہے تو یہ اس کا جبلی عمل ہوتا ہے اور اس کی ذات کی بقا کے لیے ضروری ہوتا ہے اور یہ عمل دنیا کے ہر ذی روح کے لئے ضروری ہے اور اس عمل کا جنس سے کوئی تعلق نہیں۔ جبکہ فرائڈ اس کو اصطلاحاً شخصیت کی نشوونما کا ذہنی مرحلہ کہتا ہے۔ اس نے اس سلسلہ میں بار بار کہا ہے کہ اس نے جس آسودگی یا دوسرے معنوں میں تلذذ کا ذکر کیا ہے اس کا شہوت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا اس کی ذات سے تعلق ہے۔ اس کو وہ جنس سے اس لئے جوڑ دیتا ہے کیونکہ اس کو یہ تلذذ ماں کے اس عضو سے حاصل ہوتا ہے جس کا براہ راست جنس سے تعلق ہے۔ لیکن شہوانی تلذذ اور غیر شہوانی تلذذ کے فرق کو کسی دانشور نے تسلیم نہیں کیا۔ اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے اس نے لکھا کہ جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے تناسلی اعضاء میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے کیونکہ ان اعضاء سے بھی اخراج کا عمل ایک قسم کے تناؤ کے استرخا کا باعث ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بچہ اس مرحلہ سے گزرتا ہوا عمر کے اس حصہ میں پہنچتا ہے جب اپنے والدین سے جنسی وابستگی کا احساس کرنے لگتا ہے۔ اور جب یہ احساس بڑھنے لگتا ہے تو پھر ایک الجھاؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لڑکے کا اپنی ماں سے غیر معمولی وابستگی کی کیفیت کو اس نے ایڈیپس الجھاؤ کا نام دیا اور لڑکی کا اپنے باپ سے غیر معمولی لگاؤ ہونے کی صورت میں اس کو الیکٹرا الجھاؤ کہا۔ یہ دونوں نام اس نے یونان کی قدیم کہانیوں کے کرداروں کے ناموں سے اخذ کئے۔



ماہرین نفسیات نے اس کے اس نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کیا بلکہ بعض نے تو اس نظریہ کو ننگ انسانیت کا نام دیا۔ غالباً فرائڈ کا یہی نظریہ تھا جس نے اس کے مخالفین کو اور زیادہ تقویت بخشی کیونکہ اس نظریہ کو کسی نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ ایسے نظریات کو آج بھی آسانی سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، خاص طور پر ایک عام آدمی، جسے نفسیات کی زیادہ معلومات نہ ہو وہ کس طرح یہ مان سکتا ہے کہ ایک بچہ کم عمری میں جنس کے تعلق سے ایسے خیالات رکھ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں ماں کے لئے بے انتہا تقدس کا جذبہ ہے اور ایسے مقدس رشتہ کے بارے میں ایسی بیہودہ باتیں گوارہ نہیں کی جاسکتیں۔

ایک مفکر نے فرائڈ کے ان نظریات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ..... ”فرائڈ نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد شاید چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے متاثر ہو کر یہ سوچ کر رکھی تھی کہ انسان میں آج بھی حیوانی جبلتیں اور حیوانیت کی نشانیاں موجود ہو سکتی ہیں۔ بندروں اور دوسرے مختلف حیوانات کے کردار کا مشاہدہ کے بعد اس کے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حیوانات میں جب اولاد افزائش نسل کے قابل ہو جاتی ہے تو پھر ماں باپ کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور صرف نر اور مادہ کی حیثیت باقی رہتی ہے۔“

ڈاکٹر ایرک برن نے، جو سگمنڈ فرائڈ کا معتقد اور پیروکار تھا، اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ فرائڈ نے بار بار یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ یہ الجھاؤ شعوری نہیں ہوتے بلکہ لاشعوری ہوتے ہیں، اور فرد کو ان کا خود کو احساس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اس کی شہادت نہیں دیتا۔ لیکن یہ الجھاؤ اپنا وجود رکھتے ہیں اور عام طور سے یہ تجربہ میں آتے ہیں۔ خاص طور پر تحلیل نفسی کے دوران ان کے اثرات کا سامنا ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ سگمنڈ فرائڈ نفسیاتی امراض کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور ویانا میں اسی تعلق سے اس کی شہرت تھی۔ مریضوں کے علاج کے ساتھ ساتھ وہ مرض کے بارے میں تحقیق بھی کرتا تھا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ مرض کے



اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ ایک دن اس کے دوست ڈاکٹر جوسف برائر نے اس کو اپنا ایک تجربہ بتایا کہ وہ ہسٹریا کی ایک مریضہ کا علاج کر رہا تھا۔ اس نے علاج کے دوران یہ محسوس کیا کہ جب اس کو مریضہ سے کھل کر بات کرنے کا موقع ملتا تو مریضہ اس سے اپنے ذہن میں پوشیدہ راز افشاں کر دیتی تھی۔ برائر نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے وہ باتیں کرتی تھی، وہ اپنے آپ کو صحتمند محسوس کرتی تھی۔ بظاہر یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ عام طور سے جب کوئی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہے تو خود کو بھی ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن فرائڈ نے اس واقعہ کو ایک عام بات سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا، بلکہ اس پر غور کرنے لگا اور طویل عرصہ تک تجربات کے بعد اس نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور جس کی وجہ سے نفسیاتی دنیا میں ہی نہیں، بلکہ میڈیکل حلقہ میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے ذہن میں ایک حصہ ایسا ہے جہاں ہماری آسودگی کے لیے ترستی ہوئی خواہشات، مختلف قسم کے خیالات اور تجربات پناہ لے لیتے ہیں اور وہاں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ حصہ ہمارے شعور کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ سب خیالات اور تجربات فرد کے اپنے ہوتے ہیں، لیکن ایک خاص نفسیاتی عمل کے ذریعہ یہ شعور سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس نے ”لا شعور“ (Unconscious) کا تصور پیش کیا۔

اس پر تفصیل سے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نظریہ پیش کیا کہ ہمارا لا شعوری مواد ہمارے اپنے تجربات اور خیالات پر ہی مشتمل ہوتا ہے اور یہ سب پہلے ہمارے شعور میں جنم لیتے ہیں اور پھر شعور سے نکل کر تحت شعور Sub-Conscious میں چلے جاتے ہیں۔ تحت شعور سے اس کا مطلب ان تجربات سے تھا جن کو ہم فراموش تو کر دیتے ہیں، لیکن جب چاہیں ان کو یاد کر کے ان کا اعادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ تجربات اگر عرصہ تک یاد نہ کیے جائیں تو پھر ہم ان کو ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ سب خیالات اور تجربات ہمارے لا شعور میں جا کر بس جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری وہ خواہشات بھی ہوتی ہیں جن کو آسودگی نصیب نہ ہو سکی اور ہم ان کی تکمیل کے



لئے ترستے ہی رہے۔ یہ لاشعوری مواد حالانکہ ہمارے ذہن میں ہی ہوتا ہے، لیکن ایسے حصہ میں ہوتا ہے جہاں تک ہمارے شعور کی پہنچ نہیں۔ لیکن ایک خاص تکنیک سے اس لاشعوری مواد کو شعور میں لانا ممکن ہے۔ یہ لاشعوری مواد ہمارے روزانہ کے معمولات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ ہمارے خوابوں میں مختلف شکلیں بدل بدل کر آتا ہے اور کسی حد تک ہمارے کردار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس نے اپنے نظریہ کو پہلے اپنے اوپر آزمایا اور اپنے خوابوں کا ایک با تفصیل ریکارڈ رکھا اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنی دریافت کو ایک کتاب کی شکل میں پیش کر دیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۰ء میں Interpretation of Dreams کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب نے اس کی شہرت کو ویانا سے نکال کر پوری دنیا میں پہنچا دیا اور ایک طرح سے اس کے مخالفین کو بھی خاموش کر دیا۔ پھر بھی اس کے بعض ناقدین نے لاشعور کے مفروضہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے وجود کو سائنٹیفک دلائل سے ثابت کرنا مشکل تھا۔ ایک سال بعد ہی یعنی ۱۹۰۱ء میں اُس نے ایک کتاب Psychology of Everyday Life کے نام سے شائع کی اور اس میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے لاشعور میں جو کچھ موجود ہوتا ہے، وہ ہمارے روزانہ کے معمولات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لاشعور کا تصور سب سے پہلے فرائڈ نے پیش کیا تھا۔ لیکن کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ فرائڈ سے پہلے بھی ذہن کے اس حصہ کے بارے میں اظہار خیال ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں G.W. Leibniz کا نام لیا جاتا ہے جس نے شعوریت کو درجات میں تقسیم کیا تھا اور اس کے خیال کو مزید تقویت پہنچائی John F Herbert نے، جس نے ریاضی کے کچھ اصولوں کا استعمال کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فرد کے ذہن میں اُٹھنے والے نئے نئے خیالات یعنی Ideas پہلے ذہن کے اس حصہ میں تشکیل پاتے ہیں جس کو لاشعور کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ اس نے Unconscious کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس کے کہنے کا مطلب یہی تھا



کہ یہ خیالات لاشعور میں پیدا ہو کر شعور میں آنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ H. Elenberger نے اپنی کتاب The Discovery of Unconscious میں یہ انکشاف کیا تھا کہ Leibniz کا مقصد دراصل اسی مفہوم سے تھا جو لاشعور کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن اس وقت اس کے خیال کو سمجھا ہی نہیں گیا۔ اس کا خیال ہے کہ فرائڈ نے اس کے خیال کو سمجھ کر ہی لاشعور کے بارے میں نظریہ پیش کیا۔ خود فرائڈ نے اپنے ایک مضمون میں یہ اعتراف کیا ہے کہ لاشعور اور احتباس کا خیال Schopenhaur کے ہاں ملتا ہے لیکن اس نے پڑھا نہیں تھا۔

لاشعور کے تصور اور فرد کی روزانہ زندگی پر اس کے اثرات کو موضوع بنا کر اور جوسف برائر کے اس تجربہ کی روشنی میں، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اُس نے ایک اور انقلابی نظریہ پیش کیا، جس کو ”تحلیل نفسی“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تحلیل نفسی دراصل ایک نفسیاتی نظام تھا جو ایک عالمگیر تحریک میں تبدیل ہو گیا اور سگمنڈ فرائڈ کی زندگی میں ہی اس کو دنیا بھر میں مقبولیت مل گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ذہنی اور دماغی بیماریوں کا کامیاب علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ اُس زمانے میں بھی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایسے مریضوں پر بھوت پریت کا سایہ ہوتا ہے اور اس کے اثرات سے چھٹکارہ پانے کے لئے مریضوں کو ناقابل برداشت اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ فرائڈ نے اپنی تحقیقات سے یہ پتا لگایا کہ مریض کے لاشعور میں جو نا آسودہ خواہشات اور خیالات تلاطم برپا کرتے رہتے ہیں وہی اس کے دماغی امراض کا باعث ہوتے ہیں۔ چونکہ فرد ان سے واقف نہیں ہوتا، اس لئے ان کا تدارک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ لاشعوری خیالات کو شعور میں لانے کا کوئی طریقہ تلاش کیا جائے اور فرائڈ اس کوشش میں کامیاب ہو گیا اور اسی عمل کو اس نے تحلیل نفسی یعنی Psychoanalysis کا نام دیا۔

تحلیل نفسی پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان عناصر پر بھی کچھ معلومات حاصل کریں جن پر تحلیل نفسی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ان میں سب سے پہلے ذہن کی ساخت کے بارے میں فرائڈ کے خیالات کا ذکر آتا ہے۔ ذہن کے بارے میں



اُس نے جو خاکہ پیش کیا وہ افلاطون کے خاکہ سے کچھ مختلف نہیں تھا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دو ہزار سال پرانے خیال کو فرائڈ نے نئے انداز میں پیش کیا۔ اس نے ذہن کو ایک آلہ کہا ہے اور اس طرح اس کو سائنس سے ایک تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن ایک غیر مادی آلہ ہے جس کا مقام دماغ ہے جو بذات خود اعصابی نظام کا مرکز ہے، وہ ذہن کو ایک مثلث کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ فرائڈ نے اس سلسلہ میں جو مفروضہ پیش کیا ہے، اس کی بنیادی چیز کو وہ ایڈ (Id) کہتا ہے۔ یہ بھی ایک غیر مادی شے ہے اور فرائڈ کے مطابق اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو فرد وراثت میں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں اس کا مطلب اُن جبلی خصوصیات سے ہے جو انسان کے ساتھ دُنیا میں آتی ہیں۔ اس کے خیال میں ہماری جبلتوں کا اوّلین اظہار ایڈ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہی ہماری خواہشات کا مرکز ہے اور یہ خواہشات ہر حالت میں آسودگی چاہتی ہیں۔ یہ جبلی خواہشات لاشعوری ہوتی ہیں لیکن یہ ایک توانائی کی شکل میں عمل کرتی ہیں۔ دوسرے حصہ کو وہ Ego یعنی 'انا' کہتا ہے۔ اس سے اس کا مطلب فرد کی اپنی ذات سے ہوتا ہے جو ایڈ میں اور فوق الانا (Super Ego) میں مصالحت کا کام کرتی ہے۔ فوق الانا سے مطلب شخصیت کی تیسری شکل ہے۔ اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ فوق الانا ایک حد تک سماجی اقدار اور ضابطہ اخلاق کی پاسبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ انا کے فعل کو قابو میں رکھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو ضمیر کی ایک شکل کہہ سکتے ہیں۔

فرائڈ کے مندرجہ بالا مفروضات ابتدا میں سمجھے ہی نہیں گئے۔ لیکن جیسے جیسے تحلیل نفسی کا عمل عام ہوتا گیا، اُن کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا کیونکہ ان مفروضات کو سمجھے بغیر اور تسلیم کیے بغیر تحلیل نفسی کے عمل کو انجام دیا ہی نہیں جاسکتا۔ اس کے علاوہ اس نے جبلتوں کے تعلق سے جو نظریہ پیش کیا ہے، وہ بھی تحلیل نفسی کے عمل کے لئے ایک لازمی عنصر ہے، کیونکہ اس کے خیال میں ایڈ کی توانائی کے پس پشت جبلتیں کارفرما ہوتی ہیں، اور یہی جبلتیں ہماری ذہنی زندگی پر عائد جسمانی مطالبات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جبلتوں کی ایک غیر معین تعداد فرض کی جاسکتی ہے اور سب کے



بارے میں الگ الگ توضیح نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے اس نے صرف دو بنیادی جہتوں کا وجود فرض کر لیا، ایک کو وہ ”جبلتِ حیات“ اور دوسری کو ”جبلتِ تخریب“ کہتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور اصطلاح، جو فرائڈ نے وضع کی اور اُس کا اکثر ذکر ملتا ہے، وہ Libido لیبیدو ہے۔ فرائڈ کے جنسی نظریہ کے مطابق ہر فرد اپنے ساتھ ایک خاص مقدار میں جنسی توانائی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جب لیبیدو کی توانائی رہا ہو جاتی ہے تو بچہ ایک قسم کی تسکین محسوس کرتا ہے جو اس میں مسرت اور خوشی کے احساس کا باعث ہوتی ہے۔ عام طور سے لیبیدو کو جنسی خواہش سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ فرائڈ نے اس کو خواہشات کا مرکز کہا ہے اور لیبیدو کا تعلق انا سے ہی ہوتا ہے۔ انا میں ہی اس توانائی کی ساری مقدار جمع ہوتی ہے۔ لیکن اس نے ایک بات صاف کر دی ہے کہ.....

”لیبیدو کی ایک اہم خصوصیت اس کی حرکت پذیری ہے جس کی وجہ سے وہ آسانی سے ایک معروض سے دوسرے کی جانب منتقل ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی لیبیدو میں مخصوص معروضات سے وابستگی کی صلاحیت بھی ہوتی ہے جو زندگی بھر قائم رہتی ہے۔“

یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ میڈیکل سائنس نے اس زمانے میں اتنی ترقی نہیں کی تھی اور دماغی و اعصابی امراض کے علاج کے لیے کارگر اور موثر ادویات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے ان امراض کے علاج میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں ایک ایسا طریقہ علاج ایجاد کرنا، جس کے ذریعہ ایسے امراض کا بغیر دواؤں کے علاج ممکن ہو، بظاہر ایک عظیم کارنامہ تصور کیا جانا چاہئے تھا۔ لیکن یہ فرائڈ کی بد نصیبی ہی کہنا چاہئے کہ اس کے ہر خیال کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح جب فرائڈ نے تحلیل نفسی کے ذریعہ ان امراض کے علاج کا طریقہ پیش کیا تو پہلی ہی نظر میں اس کی مخالفت کی گئی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ فرائڈ کی شخصیت بذات خود تنازعات سے گھری ہوئی تھی اور اس کی ہر بات کو اسی تناظر میں دیکھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس طریقہ کو عمل میں لانے کے لئے فرائڈ کے ان نظریات کو تسلیم کرنا



ضروری تھا جن کی زوردار مخالفت کی گئی تھی اور خاص طور پر جو جنس سے متعلق تھے۔ تیسرے یہ کہ ایسے امراض کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں نے فرائڈ کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا اور وہ عام طور سے فرائڈ کے اس طریقہ کار کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے امراض کے اسباب کے بارے میں دونوں کے زاویہ نگاہ میں واضح فرق تھا۔ فرائڈ کے تحلیل نفسی کی بنیاد ان حقائق پر تھی جو اس نے اپنے مریضوں پر کی جانے والی تحقیقات کے بعد حاصل کئے تھے۔

تحلیل نفسی ایک پیچیدہ عمل ہے اور اس مختصر مضمون میں اس کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی مناسب نہیں کہ سگمنڈ فرائڈ پر کسی مضمون میں اس کی سب سے زیادہ اہم خدمت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ فرائڈ کا نظریہ کہ فرد کی نا آسودہ خواہشات اور تمنائیں احتباس کے ذریعہ لاشعور میں چلی جاتی ہیں اور وہاں وہ اپنی آسودگی کے لیے تڑپتی رہتی ہیں، یا یوں کہے کہ ایک ہلچل سی پیدا کرتی رہتی ہیں۔ یہ خواہشات اور تمنائیں فرد کی نہ صرف اس عمر سے تعلق رکھتی ہیں جب اس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا، بلکہ بعض ایسے خیالات اور جذبات بھی ہو سکتے ہیں جو اس کو وراثت کے ذریعہ ملتے ہیں۔ لاشعوری مواد سے فرد ناواقف ہوتا ہے لیکن یہ مواد اس کے برتاؤ اور کردار پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ یہ لاشعوری جذبات، خیالات اور الجھاؤ اس کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کو مختلف بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جدید تحقیق کے نتائج سے یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ ہماری بہت سی عضوی بیماریوں کی جڑیں ہمارے جسم میں نہیں بلکہ ذہن میں ہوتی ہیں۔ تحلیل نفسی کے ذریعہ لاشعور کو کرید کرید کر ان خیالات کو مریض کے شعور میں لانا ہوتا ہے اور جب فرد ان سے واقف ہو جاتا ہے تو بیماری کی علامات بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

تحلیل نفسی تاریخی اعتبار سے پہلا نفسیاتی نظریہ ہے جو غیر طبعی کردار کی تشریح کرتا ہے اور ذہنی بیماریوں کے نفسیاتی محرکات پر روشنی ڈالتا ہے۔ تحلیل نفسی کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کے لیے جناب حزب اللہ (ایم۔ اے) کی تخلیق ”تحلیل نفسی“ اردو میں



ایک مکمل کتاب ہے جو اس عمل کو ہر زاویہ سے جانچنے اور پرکھنے میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس کتاب علاوہ خود سگمنڈ فرائڈ کی تخلیق An Outline of Psychoanalysis کا اردو ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ”تحلیل نفسی کا اجمالی خاکہ“ کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بھی فرائڈ کے اس نظریہ کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اور بھی مضامین لکھے گئے ہیں جو ان کے مصنفین کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ فرائڈ نے زندگی بھر اپنے اس طریقہ علاج کو عام کرنے کی کوشش کی اور یہ کامیاب بھی ہوئی۔ اس نے دنیا کے بہت سے ممالک میں Psychoanalytical Society قائم کی اور وہاں اس تحریک کو روشناس کرایا۔ ہندوستان میں بھی یہ سوسائٹی قائم کی گئی تھی، جس کا سہرا کلکتہ کے ایک پروفیسر کے سر تھا، جس نے فرائڈ سے خط و کتابت کی اور اس کی ایما پر یہ سوسائٹی قائم کی لیکن یہاں اس کو کچھ زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۶ میں اس کا صرف ایک ہی ممبر تھا جو ممبئی میں تحلیل نفسی کے ذریعہ علاج کیا کرتا تھا۔ امریکہ میں اس کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور وہاں اب تک یہ سوسائٹی قائم ہے۔ کیمرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر برنارڈ ہارٹ Dr. Bernard Hart نے ایک کتاب The Psychology of Insanity کے نام سے ۱۹۱۲ء میں شائع کی تھی۔ اس کتاب میں اس نے فرائڈ کا جس انداز میں ذکر کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی فرائڈ کے اس نظریہ کو مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ (اس کتاب کا اردو ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ”نفسیات جنوں“ کے نام سے شائع کیا ہے۔) وہ لکھتا ہے کہ.....

”گزشتہ اٹھارہ برسوں کی تاریخ میں سب سے اہم بات فرائڈ کے کام کا روز افزوں بڑھتا ہوا اثر ہے جو روانتی نظریہ تحلیل نفسی کے حدود سے بہت آگے نکل گیا ہے، اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اب عہد حاضر کے نفسیاتی علم الامراض کے سلسلہ کی تمام تحقیقات کو متاثر کر رہا ہے۔“



..... آگے وہ لکھتا ہے کہ.....

”تحلیل نفسی کے قدیم مکتب خیال نے اپنے بانی فرائڈ کے زیر سایہ اس طریقہ کو تفتیش کا ایک وسیع اور جامع اصول بنایا، جس میں متواتر توسیع ہوتی رہی اور اب تو اس کے دائرہ عمل میں عصبی انتشار کے علاوہ نفسیات، اعتدال، سماجیات، انسانیات اور تعلیمات سب ہی کو کامیابی کے ساتھ شامل کیا جا چکا ہے۔ یہ طریقہ جامع اور مکمل ہے، تصورات کے اعتبار سے کم و بیش خود کفیل ہے اور اپنے طرز پر دوسرے ذرائع کی محتاجی کے بغیر ذہن و زندگی کے مسائل حل کرنا چاہتا ہے“

آج بھی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فرائڈ ایک عہد ساز مفکر تھا۔ لیکن اس کے نظریات کو اس کے عہد میں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اس نے جن لوگوں کو اپنا ساتھی سمجھا تھا اور جن لوگوں کو وہ اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا، وہی اس سے الگ ہو گئے۔ اس کے دوستوں کی تعداد کم تھی اور مخالفین کی زیادہ، اور اس کا سبب اس کی شخصیت میں ہی پوشیدہ تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، یہ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی بات کی نفی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس حد تک ضدی قسم کا آدمی تھا کہ اس کے ساتھی اس کو جابر اور خود پرست کہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مشہور شخصیت کی جو جھلک عوامی زندگی میں نظر آتی ہے، وہ اس کی خانگی زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ فرد جس قسم کی زندگی گزار رہا ہے، اس کے اثرات اس کی شخصیت پر ہر زاویہ سے نمایاں ہوتے رہتے ہیں، چاہے وہ اس کے مزاج کی صورت میں ہوں یا اس کے عادات و اطوار کی شکل میں۔ سگمنڈ فرائڈ بھی ایسی ہی کیفیت کا شکار تھا اور اپنی ذاتی زندگی میں بڑی کشمکش کا شکار رہا تھا اور زندگی میں بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ ہو سکتا کہ اس کے مزاج میں جو سختی اور جبر و استبداد کا مادہ پیدا ہو گیا تھا وہ اس کے ذاتی حالات کی دین ہوں اور اس کی خانگی زندگی کا عکس ہوں۔

مثال کے طور پر چیکو سلواکیا کے ایک شہر میں وہ اپنے والدین کے ساتھ سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن جب وہ چار سال کا تھا تو اس کے والدین ہجرت کر کے ویانا



میں آکر بس گئے کیونکہ وہاں یہودیوں کے لیے ماحول کسی حد تک سازگار تھا۔ لیکن سگمنڈ کو نئے ماحول سے سازگاری پیدا کرنے میں کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ کن حالات کی وجہ سے اس کو ویانا میں آکر بس جانا پڑا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ سگمنڈ فرائڈ کا باپ زیکو سلواکیا میں اپنے آبائی شہر میں تھا تو وہ گرم کپڑے کی تجارت کرتا تھا، لیکن ویانا میں وہ اپنی پرانی تجارت کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلا پایا۔ اس لیے یہ بھی معلوم نہیں کہ فرائڈ کی ابتدائی زندگی کس طرز پر گزری، لیکن اس کے مزاج میں الگ تھلگ رہنے کا رجحان اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ ویانا میں خوشحال نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں اس کے دوستوں کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ اس کے مزاج میں جو تلخی تھی، اُس کی وجہ سے اُس کے دوست اُس سے دور ہی رہتے تھے۔ اس کے ناقدین نے اس کے مزاج کی ان خصوصیات کو بنیاد بنا کر ہی یہ کہا تھا کہ وہ اپنے تمام دوستوں سے تلخ کلامی سے پیش آتا تھا اور اپنی بات منوانے کی سعی کرتا تھا۔ اس کے مخالفین نے اس کی شخصیت کے جن منفی خصائص کا ذکر کیا ہے، اُن میں یہ بھی شامل ہے کہ فرائڈ اپنے اوپر تنقید کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ مثال کے طور پر کارل یونگ جب امریکہ دوبارہ بلایا گیا اور اُس نے وہاں اپنے لیکچر میں کہا کہ تحلیل نفسی کے نظام کو مکمل طور پر تسلیم کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اس میں طفلانہ جنسیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ فرائڈ نے جب یہ بات سنی تو اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ یونگ سے قطع تعلق کر لے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ جس زمانہ میں وہ جی رہا تھا، وہ علمی اعتبار سے سنہرا دور تھا، ہر طرف فلسفہ اور علمیات کے چرچے تھے، دُنیا بھر میں مشہور دانشور ہر شعبہ میں کام کر رہے تھے، لیکن سگمنڈ فرائڈ اکیلا ہی تھا۔

اُس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے بے پنہا محبت کرتا تھا، لیکن ساتھ ہی کچھ حالات ایسے بھی تھے کہ وہ جب اُن کے بارے میں سوچتا تھا تو شرمندہ بھی ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے باپ سے کبھی کبھی نفرت کا اظہار بھی کرتا تھا۔ اپنی اس کیفیت کے لیے اس نے Ambivalence کی اصطلاح اختراع کی تھی۔ اس پیچیدہ



کیفیت کی وجہ یہ تھی کہ سگمنڈ فرائڈ کے باپ کی پہلی بیوی سے دولڑکے تھے، ایمل اور فلیپ۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی کر لی، لیکن اس بیوی سے اس کی نباہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکی اور دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ پھر اس نے تیسری شادی کی، جس سے سگمنڈ پیدا ہوا۔ سگمنڈ کی ماں کی عمر بہت کم تھی اور وہ سگمنڈ فرائڈ کے باپ کے پہلے بیٹے فلیپ سے بھی عمر میں کچھ سال چھوٹی تھی۔ فلیپ کا لڑکا، جس کا نام جان تھا، وہ سگمنڈ کا ہم عمر تھا اور دونوں ایک ساتھ اسکول جاتے تھے اور ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

سگمنڈ نے جب خود اپنا نفسیاتی تجزیہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بھائی فلیپ سے نفرت کرتا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ اس کا سوتیلا بھائی تھا، بلکہ اس لیے کہ فرائڈ نے یہ محسوس کیا کہ فلیپ اس کی ماں کی محبت میں شریک تھا۔ سگمنڈ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس کی ماں اور فلیپ میں ناجائز تعلقات ہیں اور وہ دراصل فلیپ کی ہی اولاد ہے۔ اس طرح وہ اپنے حقیقی (یعنی حیاتیاتی) باپ سے سخت نفرت کرتا تھا تو دوسری طرف وہ اپنی ماں کے شوہر سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ مفکرین کا خیال ہے کہ اوڈیپس الجھاؤ اسی کیفیت کی پیداوار ہے کیونکہ وہ اپنے بھائی فلیپ کو اوڈیپس کی شکل میں دیکھتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی ماں سے بھی بہت محبت کرتا تھا لیکن جب وہ اپنے وجود کے بارے میں سوچتا تو اس کو سخت شرمندگی ہوتی اور اپنی ماں سے نفرت کرنے لگتا کیونکہ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی اس لیے اس کی ماں کے لیے بھی سگمنڈ کے دل میں دورحیت (Ambivalence) کا جذبہ تھا اور بعد میں اس نے اس کیفیت کو اپنے نظریات میں استعمال کیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی زندگی میں اس کی پہلی کتاب *Interpretation of Dreams* بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب اس کی جذباتی کشمکش کی ایک گواہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے خود اپنے خوابوں کا ریکارڈ رکھا تھا اور اپنے حالات اور اپنی جذباتی کیفیت کی روشنی میں ان خوابوں کی تعبیر قائم کی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ خوابوں میں اپنے



باپ کو قتل کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیتا تھا کہ خواب میں اس کا باپ ہوتا تھا، لیکن ذہن میں اس کا حیاتیاتی باپ ہوتا تھا جو اس کا بھائی تھا اور اسی وجہ سے اس نے خواب اور انسانی لاشعور میں ایک واسطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

فرائڈ اپنی اولاد سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ اس کے بیٹوں کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کا پیشہ اختیار نہیں کیا اور وہ شاید اس سے ہم خیال بھی نہیں تھے۔ فرائڈ کی ذاتی زندگی میں جنھوں نے جھانک کر دیکھا ہے، اُن کا کہنا ہے اس کی بیوی بھی اس کی ہم خیال نہیں تھی اور اکثر ان میں اختلاف رائے ہو جاتا تھا۔ ان کی آخری اولاد ایک لڑکی تھی جس کا نام اینا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد فرائڈ کی بیوی نے اس کو اپنا دودھ پلانے سے انکار کر دیا اور اس کو ایک دایہ کے حوالے کر کے خود اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ اس زمانہ میں فرائڈ کی مصروفیات عروج پر تھیں اور وہ خود بھی اکثر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس لیے اُس کی بیوی کا یہ قدم اُس کے لیے باعث پریشانی ہوا۔ فرائڈ جب اپنی اس بیٹی کی کیفیت پر غور کرتا تو اُسے بہت دکھ ہوتا۔ فرائڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکی کی پرورش اپنی طرز سے کرے گا۔ یہ لڑکی، جس کا نام اینا فرائڈ تھا، اس نے اپنے باپ کے کام کو آگے بڑھایا اور تحلیل نفسی کے نظام کی نشر و اشاعت سگمنڈ کی موت کے بعد بھی جاری رکھی۔ اینا فرائڈ کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس نے سگمنڈ فرائڈ کی شخصیت اور اس کے کام کو ۲۴ جلدوں میں قلمبند کیا اور یہ کتاب دُنیا بھر میں آج بھی مقبول ہے۔ (اینّا فرائڈ کے حالات زندگی اسی کتاب میں شامل ہیں۔)

حالانکہ آج بھی ایک عام آدمی فرائڈ کے مفروضات کو آسانی سے تسلیم نہیں کر سکتا، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے تمام نظریات اور مفروضات تجربات کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سگمنڈ فرائڈ اپنے زمانے کا ایک عظیم اور عہد ساز مفکر اور بلند پایہ ماہر نفسیات تھا۔



# جان ڈیوی

JOHN DEWEY ( 1859-1952)

نصف اُنیسویں صدی گزرنے کے بعد ایک ایسا دور شروع ہوا جب مختلف علوم سے تعلق رکھنے والے مفکرین نے امریکہ کا رخ کرنا شروع کیا، جس کی وجہ سے امریکہ کو مختلف علوم کا مرکز تصور کیا جانے لگا۔ یورپ کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے ان مفکرین کو امریکہ کا ماحول سازگار معلوم ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی وہاں اُن کو اپنے اپنے علوم کو فروغ دینے کے زیادہ ذرائع میسر تھے، ساتھ ہی وہاں مختلف جامعات میں ایسے ماحول پیدا ہو گئے تھے جہاں مفکرین کے فکری تقاضوں کو پورا کرنے کے مناسب مواقع موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف علوم کے ماہرین اور دانشور امریکہ کا رخ کرنے لگے۔ اُنیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے علمِ انفس بھی بہت سے دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور بہت سے مفکرین فلسفہ میں اپنا نام روشن کرنے کے ساتھ ہی نفسیات کی جانب بھی متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک نفسیات فلسفہ کا ایک شعبہ تصور کیا جاتا تھا۔

اگر ہم علمِ انفس کی تاریخ پر غور کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ امریکہ میں اُنیسویں صدی کے نصف کے بعد کئی مکتب فکر کی بنیادیں پڑ گئیں جنہوں نے نفسیات پر علمی بحث کا ذریعہ پیدا کیا، اور اس طرح نفسیات کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو ترقی کرتے ہوئے عالمی پیمانے پر مقبول ہوئے اور کچھ ایسے بھی تھے جو امریکہ میں



ہی بحث کا موضوع بنے رہے اور وہاں سے باہر انہیں مقبولیت نہ مل سکی۔ اس لیے وہ وہیں ختم ہو گئے اور نفسیات کی تاریخ کا ایک حصہ ہو کر رہ گئے۔

ایسا ہی ایک مکتب فکر نظریہ وظیفیت کے نام سے ابھرا جو بعد میں نفسیات کے ایک اہم شعبہ کی شکل اختیار کر گیا، جس کو ”وظیفی نفسیات“ یعنی Functional Psychology کا نام دیا گیا۔ وظیفی نفسیات بھی ایک ایسے رجحان کی پیداوار ہے جو ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے پیش ہونے کے بعد تمام فلسفیانہ اور سائنٹفک علوم میں ایک انقلاب رونما ہونے سے پیدا ہوا تھا اور مختلف حیاتیاتی علوم کی سوچ اور طرز فکر میں ایک نمایاں تبدیلی لانے کا باعث ہوا تھا۔

ولیم جیمس پر اس کتاب میں جو مضمون شامل ہے، اس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ولیم جیمس نے ہی سب سے پہلے مشاہدہ باطن کے طریقہ کار پر اعتراض کیا تھا اور دوسرے مفکرین کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ نفسیات کے تحت انسانی استعداد اور صلاحیتوں کی چھان بین کرنا ضروری ہے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نظریہ وظیفیت Functionalism پیش کیا گیا جو بعد میں ایک مکتبہ فکر کی شکل اختیار کر کے نفسیات کے ایک شعبہ وظیفی نفسیات (Functional Psychology) میں تبدیل ہو گیا۔ اس شعبہ کی بنیاد امریکہ کے مشہور فلسفی اور ماہر نفسیات جان ڈیوی (JOHN DEWEY- 1859-1952) نے ڈالی تھی۔ نفسیات کے اس شعبہ کی بنیاد ”نظریہ ثنویت“ (Dualism) پر تھی۔ اس مکتب فکر کا اہم موضوع بحث یہ تھا کہ شعور سے ہم کیا کام لیتے ہیں؟ اس کی گہری چھان بین کی جانی چاہئے۔ اس مکتب فکر کے ماننے والوں کی تمام تر توجہ انسانی صلاحیتوں کی کھوج لگانے پر مرکوز تھی۔ اس شعبہ سے متعلق تمام مفکرین کے سامنے جو سوال تھے وہ یہ تھے کہ ہم کن حالات میں اور کس طرح ماحول سے مطابقت پیدا کرتے ہیں، شعور اور ماحول کس طرح ایک دوسرے کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور افعال اور اعمال کے مطالعہ میں شعور اور ماحول کا عمل اور رد عمل کیا ہوتا ہے؟



وظیفی نفسیات کے عروج سے حیوانی نفسیات کو بہت تقویت ملی اور ساتھ ہی نفسیات کے تحت ذہانتی آزمائشوں کے لئے بھی راہیں ہموار ہو گئیں۔ اس مکتب فکر کا سب سے اہم نظریہ تھا کہ ہمارا ماحول سے تعلق مہیجیات کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان کا علم شعور کے ذریعہ۔ نفسیات کے اس شعبہ کی ترقی کے ساتھ ذہن اور جسم میں ایک تعلق پیدا کرنے کی کوششیں تیز ہو گئیں اور ساتھ ہی روح اور جسم کی بحث بھی بڑی حد تک ختم ہو گئی۔

وظیفی نفسیات کی بنیاد کا اگر ذکر کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۹۴ء میں جان ڈیوی اور جیمس آرنلڈ انجیل (James A. Angell) ایک ساتھ شکاگو یونیورسٹی میں نفسیات کی تعلیم دینے کے لئے مقرر کئے گئے۔ یہ دونوں اس سے پہلے بھی مشی گن میں ایک ساتھ رہ چکے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر یہ دونوں مشی گن میں ہی سکونت اختیار کر لیتے تو اس شعبہ کی بنیاد کافی عرصہ پہلے ہی وہیں پڑ چکی ہوتی۔ لیکن ہونا یہی تھا کہ کافی عرصہ تک الگ الگ رہنے کے بعد یہ دونوں دانشور پھر ایک مقام پر آ گئے اور دونوں کی سوچ اور طرز فکر میں یکسانیت ہونے کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکا کہ دونوں ایک نئے ماحول اور نئی جگہ ہونے کے باوجود جدید نظریات پر غور و فکر کر سکیں۔ جیمس انجیل جان ڈیوی سے دس سال چھوٹا تھا اور مشی گن میں کچھ عرصہ تک وہ جان ڈیوی کے زیر تعلیم بھی رہ چکا تھا، جب جان ڈیوی ان دنوں اسی اسکول میں تعلیم دے رہا تھا۔

جان ڈیوی ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو برٹلن میں Vermont کے مقام پر ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اپنے ماں باپ کے چار بیٹوں میں یہ تیسرا تھا۔ پہلا لڑکا بچپن میں ہی انتقال کر گیا تھا، اس لئے یہی بچوں میں سب سے بڑا ہوا۔ معاشی حالات کچھ اچھے نہ ہونے کے سبب یہ تینوں بھائی ایک مقامی پبلک اسکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد جان ڈیوی اپنے شہر کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا اور وہیں سے ۱۸۷۹ء میں گریجویشن مکمل کیا اور اسی سال اس کے اپنے ہی اسکول میں بحیثیت مدرس تقرر ہو گیا، جہاں اُس نے دو سال تک تعلیم دی۔

یونیورسٹی میں جان ڈیوی کو چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا نہ صرف تفصیل سے



مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر ہونے والی بحث میں حصہ لینے کا بھی موقع ملا۔ اسی یونیورسٹی میں کچھ عرصہ تک اس زمانے کے مشہور دانشور اور فلسفی H.A.P. Torry کے تحت تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔ جان ڈیوی اس کو اپنی خوش قسمتی سے تعبیر کرتا ہے کہ اس کو ٹوری جیسے عظیم فلسفی اور کامیاب معلم سے فلسفہ سیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ ٹوری کا فلسفہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ بذات خود فلسفہ سے غیر معمولی لگاؤ رکھتا تھا اور فلسفہ کو ہی اپنی منزل مقصود سمجھتا تھا۔ اس کے اس والہانہ لگاؤ کی وجہ سے جان ڈیوی بہت متاثر ہوا۔ اس نے ایک بیان میں خود تسلیم کیا تھا کہ فلسفہ سے دلچسپی پیدا کرنے اور اس موضوع کو اپنا مقصد حیات بنانے کے فیصلے کے پیچھے اس کے معلم ٹوری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

جان ڈیوی نے اپنے اسکول کی ملازمت کو اپنا مقصد نہیں بنایا تھا، بلکہ اس کے اندر فلسفہ سے متعلق کچھ کر گزرنے کا ایک جنون سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ تحقیقات کے بعد کوئی نیا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اسی کوشش میں وہ اپنے مطالعہ کو وسعت دینے میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ اس نے فلسفہ کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ کر W.T. Harris کو روانہ کیا جو اُس زمانہ میں ایک مشہور اور مستند جرنل کا ایڈیٹر تھا۔ یہ جرنل فلسفہ کی ترویج و ترقی کے لئے اپنی کوششوں کی بناء پر بہت مشہور تھا۔ Harris نے مقالہ پڑھا تو اس کو تعجب ہوا، کیونکہ اس نے جان ڈیوی کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ اُس نے نہ صرف وہ مقالہ اپنے جرنل میں نمایاں پوزیشن میں شائع کیا، بلکہ اُس کی پذیرائی میں بھی ایک نوٹ لکھا۔ جان ڈیوی نے سوچا کہ اس کے مقالہ کو اگر ہارس پسند کرتا ہے تو پھر وہ ایک فلسفی بن سکتا ہے اور بقول خود ڈیوی کے، اس کے بعد تو اس کے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہو گئی اور اس نے فلسفہ پر اپنے کام میں اور تیزی پیدا کر دی۔ اس نے اس کامیابی کو ہی اپنی منزل کی پہلی سیڑھی تصور کر لیا اور اپنی ملازمت کو خیر باد کہہ کر وہ بالٹی مور پہنچا اور جان ہاپکنس یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ فیصلہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا۔ وہاں اس کو اپنے زمانے کے مشہور ماہرین فلسفہ George S. Morris جو ایک جرمن پروفیسر تھا اور



G.Stanely Hall جیسے عظیم دانشور کے زیرِ سایہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا، اور اُن دونوں مفکرین کے خیالات کا اثر جان ڈیوی کی پوری زندگی پر محسوس کیا گیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اُن دونوں مفکرین نے میرے اندر ایک نئی جان ڈال دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جان ڈیوی نے کوشش شروع کر دی کہ سائنٹیفک طریقہ کار کو انسانی زندگی کے روزانہ معمولات پر اطلاق کر کے فلسفہ کو عوامی بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

۱۸۸۴ء میں اُس نے اُن دونوں دانشوروں کے ماتحت رہ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد مشی گن یونیورسٹی نے اس کو فلسفہ کے پروفیسر کی ملازمت کی پیش کش کی، جسے ڈیوی نے بخوشی قبول کر لیا۔ مشی گن میں رہتے ہوئے ڈیوی نے اپنی پہلی تخلیق ۱۸۸۷ء میں Psychology کے نام سے مکمل کی اور اگلے ہی سال ایک اور اہم تصنیف Leibniz's New Essays Concerning the Human Understanding کے نام سے مکمل کر کے شائع کی۔ ان دونوں کتابوں میں اُس نے ہیگل کے نقطہ نظر کی حمایت کی اور اس کے نظریات کو اپنا موقف قرار دیا، خاص طور پر اس کی کتاب Psychology میں اس نے کوشش کی کہ ہیگل کے نظریات کو بنیاد بنا کر وہ تجرباتی طریقہ کار پر عمل کرے اور اس طرح اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکے۔

مشی گن میں ہی اس کی ملاقات جیمس ہیڈن ٹفس James Hayden سے ہوئی جو فلسفہ میں کافی شہرت پا چکا تھا۔ اس کے ساتھ مل کر جان ڈیوی نے آگے چل کر یعنی ۱۹۰۸ء میں Ethics نام سے اپنی مشہور تصنیف مکمل کی تھی اور اس کتاب کا ایک بیان بہت مشہور ہوا تھا۔ لکھا تھا کہ.....

”ریاست کے قوانین کے ذریعہ عوام کو صحیح اور غلط میں فرق سکھایا جاتا ہے، اپنے فرائض اور انصاف کا درس دیا جاتا ہے، جبکہ یہ احساسات انسان میں خود بخود پیدا ہو سکتے ہیں اگر وہ اپنی ذات کے بارے میں غور کرے اور اپنے لئے ایک معیار طے کر لے اور اس معیار کو ہی قانون سمجھ لے۔ اس طرح انسان خود مدعی اور مدعلیہ ہو سکتا ہے، وہ خود ایک منصف کا کردار ادا



کر سکتا ہے، حالات کی روشنی میں وہ فیصلہ سنا سکتا ہے اور اس پر عمل کروا سکتا ہے۔ اس طرح انسان کی ذات پیچیدہ اور ابھری ہوئی ہوتی ہے۔“  
... کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی یہ عبارت اتنی مقبول ہوئی کہ کئی اداروں نے اس کو اپنے دفاتر میں لگانا مناسب سمجھا۔

۱۸۹۴ء میں جیمس ڈیوی اور ہیڈن، دونوں شکاگو یونیورسٹی چلے گئے جو اُس وقت نئی قائم کی گئی تھی۔ شکاگو جانے کے بعد جان ڈیوی کے نقطہ نظر میں تبدیلی آ گئی۔ اس نے تجرباتی طریقہ پر اپنے نظریات کو ڈھالنا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جان ڈیوی کے طرز فکر پر امریکہ میں نشوونما پانے والے نظریہ عملیت یعنی Pragmatism کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ اس کے طرز فکر میں یہ تبدیلی خوش کن ثابت ہوئی، کیونکہ اس موضوع پر اُس نے چار مقالات لکھے جو کافی پسند کئے گئے، اور ان کی مقبولیت کے بعد اس نے اُن چاروں مقالات کو اپنی کتاب Thought and its Subject Matter میں شامل کیا۔ اس کتاب میں دوسرے مقالات بھی پسند کئے گئے۔ اس نے اسی کتاب کو دوبارہ مرتب کر کے Studies in Logic Theories کے نام سے ۱۹۰۳ء میں شائع کیا۔ ڈیوی نے شکاگو یونیورسٹی میں ایک تجربہ گاہ بھی قائم کی اور اس کا ڈائریکٹر ہونے کی وجہ سے اُس کو اپنے تخیلات اور تصورات کے موضوع پر تجربات کے لئے استعمال کیا، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے تجربات کے ذریعہ تعلیمی طریقہ کار کی تصدیق کی۔ اس تجربہ گاہ میں کئے گئے تجربات سے شکاگو یونیورسٹی میں موجود کئی مفکرین نے فائدہ اٹھایا اور اس کی وجہ سے شکاگو یونیورسٹی کو شہرت ملی۔ خود ڈیوی نے تسلیم کیا کہ اس طرح کے تجربات سے اس نے بہت استفادہ کیا اور اپنی اگلی کتاب The School and Society کے لئے مواد حاصل کیا۔ یہ کتاب تعلیم کے موضوع پر اس کا ایک بہت ہی اہم کام سمجھا جاتا ہے۔

انتظامیہ سے اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے ڈیوی نے تجربہ گاہ سے ۱۹۰۴ء میں ہی علیحدگی اختیار کر لی۔ اس زمانے میں اپنی تخلیقات کی وجہ سے جان ڈیوی نے کافی نام



کمالیہ تھا اور اس کے چرچے نہ صرف امریکہ بلکہ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی ہونے لگے تھے، اور فلسفہ میں اس کی قابلیت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کولمبیا یونیورسٹی نے اس کو شعبہ فلسفہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے تقرری کی پیشکش کی جو ڈیوی نے قبول کر لی۔ ڈیوی کے لئے یہ ایک سنہرا موقع تھا، کیونکہ اس وقت کولمبیا یونیورسٹی کا فلسفہ کا شعبہ کافی مشہور ہو چکا تھا اور وہاں کافی برگزیدہ اور مشہور دانشور اور ماہرین موجود تھے، اور ان سب کی وجہ سے ڈیوی کے خیالات کو تقویت ملی۔ یہ اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جان ڈیوی کی معرکتہ الآراء تصانیف کولمبیا میں تقرری کے بعد ہی آنا شروع ہو گئیں۔

وہ کہتا ہے کہ کولمبیا یونیورسٹی کا ماحول اپنے زمانے کے قابل ذکر دانشوروں اور مفکرین سے بھرا ہوا تھا اور ایسے ماحول میں سانس لینا ہی ایک تقویت کے احساس جیسا تھا۔ اس ماحول کا اثر جان ڈیوی کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ کا باعث ہوا۔ کولمبیا یونیورسٹی میں تقرری کے بعد آنے والے دس سالوں میں اس نے بہت سے فکرائیگز مقالات لکھے، جن کے موضوعات نظریہ وقوفیت، مابعد الطبعیات اور جمالیات وغیرہ سے متعلق تھے۔ اُن میں سے بہت سے مقالات اس کی دو تخلیقات The Influence of Darwin on Philosophy and Other Essays in Contemporary Thoughts جو اس نے ۱۹۱۰ء میں شائع کی اور Essays in Experimental Logic جو ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔

اس دوران ڈیوی نے تعلیم کے موضوع پر اپنی دلچسپی کو قائم رکھا اور اس پر بھی لکھتا رہا۔ اس کی ایک اہم کتاب How We Think اسی موضوع پر تھی جس نے کافی شہرت پائی اور ہر کونے سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ہمت بڑھی اور وہ سوچنے لگا کہ اس موضوع پر اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ اس موضوع پر جو کچھ لکھتا تھا، اس کو قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا اور اس کی ہمت افزائی ہوتی تھی۔ اپنے فلسفی ساتھیوں کے ساتھ اس موضوع پر بحث مباحثہ کے بعد نئے نئے



خیالات اس کے ذہن میں ابھرتے تھے۔ اس کے مقالات پابندی کے ساتھ جرنل میں شائع ہوتے تھے۔

اسی زمانے میں اس نے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر کئی نئے مسائل پر بحث کا آغاز کیا۔ جیسے، خواتین کی قابل رحم حالت اور معلمین کو ایک مقصد کے تحت متحد کرنا۔ چونکہ یہ مسائل اس زمانے میں اہمیت رکھتے تھے، اس لئے ان پر بحث کی شروعات ہوئی تو ڈیوی کو مختلف اداروں سے لیکچر دینے کے لئے دعوت آنے لگی۔ یہ ادارے تعلیمی بھی تھے اور سماجی بھی۔ اس طرح جان ڈیوی اپنے زمانے میں ایک مصلح اور مفکر کی شکل میں بھی پہچانا جانے لگا۔ اس زمانے کی اس کی تخلیقات میں Reconstruction in

Human Nature and Conduct (1922), Philosophy (1920)

Experience and Nature (1925), The Public and its

Problems (1927), The Quest for Certainty

کافی شہرت رکھتی ہیں اور یہ سب اس زمانے کے لیکچر پر ہی مبنی تھیں۔ یہ چاروں کتابیں کافی عرصہ تک مقبول رہیں اور ان کی مانگ میں اضافہ ہوتا رہا۔ جان ڈیوی ۱۹۳۰ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے سبکدوش ہو گیا، لیکن اس نے تخلیقی مشق کو جاری رکھا اور اپنے آپ کو معاشرتی امور میں بھی مصروف رکھا۔ اس طرح عوامی زندگی میں مشغول رہنے کی وجہ سے نہ صرف اس کے تجربات میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی شہرت بھی عروج کو پہنچ گئی۔ قارئین کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ جان ڈیوی اس انکوائری کمیشن کا بھی ایک رکن تھا جو ماسکو میں ٹالسٹائی پر لگائے گئے الزامات کی تحقیقات کے لیے قائم کی گئی تھی۔

جان ڈیوی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد فلسفہ میں بھی نئے جوش کے ساتھ مصروف رہا اور اپنے وسیع مطالعہ اور تحقیق کی لگن کے ساتھ کچھ نیا کرنے کی جانب رجوع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں اس کے کچھ اہم کام اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے اہم کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے منطق سے متعلق اصول وضع کئے اور اپنی مشہور کتاب Theory of Inquiry میں ان کو پیش کیا۔ یہ کتاب ۱۹۳۸ء



میں شائع ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے ۱۹۳۴ میں Art as Experience اور A Common Faith نام سے دو کتابیں بازار میں آچکی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں اس نے دو اور اہم تخلیقات Freedom and Culture اور Theory of Valuation پیش کیں۔ اپنی عمر کے آخری دور میں اپنی آخری اور یادگار تخلیق ۱۹۵۰ء میں Knowing and the knowledge شائع کی۔ اس کی یہ آخری کتاب اس کی بیماری میں مکمل ہوئی اور اس کام میں اس کے دوست Arthur F. Bently نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ جان ڈیوی اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ اپنی بیش قیمت کتابوں کی شکل میں چھوڑ کر ۲۷ جون ۱۹۵۲ کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

جان ڈیوی کے ابتدائی مقالات، جیسے Is Logic a Dualistic Science? اور Present Position of Logical Theory جو اس نے ۱۸۹۱ء میں تصنیف کئے، اُن میں اُس نے ہیگل کے نظریات یا اس کی طرزِ فکر کو تسلیم کر لیا تھا اور مان لیا تھا کہ تخیلات اور دُنیا کی حقیقت الگ الگ نہیں ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ بعد کی تصانیف میں وہ اس نظریہ سے دُور ہوتا گیا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اس کے خیالات میں تبدیلی کا باعث اس کا یہ خیال تھا کہ ہیگل کے نظریات میں تجرباتی سائنس اور طریقت کی کوئی جگہ نہیں ہے، جبکہ وہ خود ان کی حقیقت کو تسلیم کر چکا تھا اور ان سے متاثر بھی تھا۔ اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ہیگل کی تصویریت ایصالی نہیں ہے کہ وہ طریقت اور تجرباتی سائنس کے نتائج کو اپنے اندر سمو سکے، جبکہ جان ڈیوی نے تجرباتی سائنس کے نتائج اور طریقت کو یکجا کرنے کی کوشش ۱۸۸۶ء میں ہی اپنی تصنیف Psychology میں کر دی تھی۔

جان ڈیوی نے اپنا زیادہ وقت فلسفہ سے متعلق موضوعات پر مطالعہ اور تحقیق میں گزارا، ساتھ ہی نفسیات کو بھی اپنا ایک موضوع بنا کر اس شعبہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس کی پہلی تخلیق Psychology کے نام سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی تھی اور کافی مقبول ہوئی۔ لیکن چار سال بعد ہی ولیم جیمس کی کتاب اسی نام سے شائع ہوئی تو اس کتاب نے تمام مفکرین کی توجہ کا رخ موڑ دیا اور ڈیوی کی کتاب اپنی



اہمیت کھو بیٹھی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد ڈیوی کی ہمت پست ہو گئی اور اس نے نفسیات سے رُخ موڑ لیا، بلکہ وہ فلسفہ کے تحت اس علم کا بھی مطالعہ کرتا رہا اور اپنی توجہ کو برقرار رکھی۔ آج بھی ڈیوی کو ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور نفسیات کے لئے اس کی خدمات کو فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے نظریات اور فکری اعمال جدید نفسیات کا بھی ایک حصہ ہیں۔

اگر نفسیات کے تعلق سے جان ڈیوی کے کاموں کا ذکر کیا جائے تو سب سے پہلے اس کے ”نظریہ وقوفیت“ کا ذکر کرنا بہتر ہوگا، کیونکہ یہی اس کے پورے کیریئر پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے لئے حالانکہ Epistemology کی اصطلاح رائج تھی، لیکن ڈیوی نے اپنے خیالات کو Theory of Knowledge کا نام دیا جس کے لئے اردو میں ”نظریہ علمیات“ کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ Epistemology صرف بیانیہ ہے اور ضرورت یہ ہے کہ اس نظریہ کا مفہوم اور زیادہ واضح ہونا چاہئے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس اصطلاح کے مفہوم کو اگر روایتی انداز میں لیا جائے تو یہ نظریہ، چاہے عقلی ہو یا تجرباتی، وقوف کے ایسے دائرہ اقتدار میں آتا ہے جو مابعد الطبعیات کے زیر اثر ہو اور دنیا کی حقیقت میں ایک حد فاصل طے کر دیتا ہے۔

ڈیوی نے اخلاقیات اور سماجی امور پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس نے اپنے نظریہ علمیت کو معاشرتی اور ثقافتی تحقیقات سے مربوط کرنے پر زور دیا۔ Thomas Alexander نے ۱۹۸۷ء میں اپنی کتاب میں جان ڈیوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ.....

”ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ڈیوی کے نظریہ علمیت اور نظریہ تحقیق کو ان کے صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جاسکتا اور ہم اس کے مرکزی عقیدہ کی تہہ کو نہیں چھو سکتے، جب تک ہم ان نظریات کو اطلاق کے بعد جانچ نہ لیں۔“

..... وہ آگے لکھتا ہے کہ.....

”در اصل یہ دونوں نظریات سماجی اور اخلاقی اقدار ذہن میں رکھ کر وضع



کئے گئے ہیں اور ان کے معانی نکالتے وقت اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ اس نے اپنے نظریات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کا تعلق براہ راست معاشرتی امور سے ہو گیا ہے۔“

ڈیوی کا عقیدہ تھا کہ فرد کا بنیادی مقصد معاشرہ کے اصولوں اور اخلاقی ضوابط کے تحت اپنی زندگی گزارنا ہے۔ اس نے اپنے مقالات میں کئی مقامات پر معاشرہ اور اخلاقیات کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس لئے اس کے خیالات اسی نظریہ کے تحت زیر بحث آتے ہیں۔ اس نے اپنے مقالے Experience in Nature میں لکھا تھا کہ اگر شعور کے معانی کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کا مرکز معاشرہ اور معاشرہ میں منظور کئے گئے اخلاقی ضوابط میں ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ابتداء سے ہی معاشرہ انسان کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی نشوونما تیزی سے ہوئی اور وہ اپنی ہیئت بدلتا رہا۔

اس نے اپنے مقالہ Ethics میں کئی اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک دوسرے مضمون Human nature and conducts میں معاشرہ سے ہم آہنگی پر زور دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کو معاشرہ کے ساتھ اپنے اختلاف کو ختم کر کے معاشرہ سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسان کو یہ سوچنا ضروری ہے کہ اس کی انفرادیت معاشرہ کا ایک عنصر ہے اور جب تک تمام عناصر میں سازگاری نہ ہو، معاشرہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اگر ہم میں سے ہر فرد دوسرے فرد کی فلاح و بہبود کو مقدم سمجھے تو معاشرہ سے برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اسی مقالہ میں اس نے لکھا ہے کہ فلسفہ کا موضوع اپنی وسعت اور ہمہ گیری کی وجہ سے معاشرہ کے مسائل حل کرنے میں کافی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ایک صحتمند معاشرہ کے لئے ایک صحتمند فرد کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر فرد اپنے اقدار کی حفاظت کرے، اُن کی اہمیت کو سمجھے اور اپنی عادات کو معاشرہ کی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے تو معاشرہ کو ترقی کرنے اور پنپنے میں مدد ملتی ہے۔



ڈیوی اپنے دو مقالوں، School and Society اور Democracy and

Education میں ایک خاص نکتہ بیان کرتا ہے کہ محض جمہوری حکومت قائم کر دینے سے جمہوری نظام قائم نہیں ہوگا۔ بلکہ کوشش یہ کرنی چاہئے کہ افراد میں جمہوری اقدار پیدا کی جائیں، اُن میں جمہوری عادات ڈالی جائیں تاکہ آپس میں اعتماد اور باہمی تعلقات کا جذبہ پیدا ہو اور اس طرح ایک باشعور سوسائٹی کی بنیاد پڑے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اس مقصد کے لئے بچوں میں اسکول کے ابتدائی درجوں میں ہی یہ تعلیم دینا لازمی کر دینا چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسکول میں تعلیم کا مقصد یہ نہ ہو کہ ٹیچر کہے اور طالب علم رٹ لے، اور جب امتحان آئے تو اپنے رٹے ہوئے بیان کو لکھ دے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ یہ خیالات اس کی زندگی میں رچ بس جائیں اور صرف امتحان کے مقصد سے ہی نہیں، بلکہ ہر قدم پر اس کی رہنمائی کریں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ایسی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں تب ہی صحیح معنوں میں علم کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

جان ڈیوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ Natural Theology کا قائل تھا (یعنی ایک نظریہ، کہ فطرت کے مطالعہ کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے۔) اس نے اپنے کئی مقالات کے ذریعہ اپنے آپ کو فطرت پسندی کے اصولوں کا پابند ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً اس کا یہ رجحان ڈارون کے نظریہ ارتقا سے متاثر تھا کیونکہ خود ڈارون نے اپنے مقالہ میں فطرت پسندی کا رجحان رکھنے والے افراد کی رہنمائی کرتے ہوئے یہ بات واضح کر دی تھی کہ نظریہ علمیت کو تسلیم کرنے کے بعد اپنے طرزِ نظر کو فطرت کے اصولوں کے مطابق ڈھال لینا ضروری ہے۔ جان ڈیوی نے اپنی فطرت پسندی کی اپنے چار مقالوں میں بہت عمدگی کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ یہ چار مقالے Studies in Logical Theory نام کی کتاب میں شامل ہیں۔ جان ڈیوی اپنے نظریہ سے اس وقت مطمئن ہوا جب ولیم جیمس نے اپنے ایک مضمون میں اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ جان ڈیوی نے ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد ڈالی ہے، اور اس کو مشورہ دیا کہ اپنے اس مکتب فکر کو آگے بڑھائے۔



جان ڈیوی کے پورے عہد کو اگر بغور دیکھا جائے تو اس نے اپنے مرکزی خیال کو نظریہ علمیت پر ہی مرکوز رکھا اور اس کے لئے Theory of Knowledge کی اصطلاح کا استعمال کیا۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ فلسفہ کی مشہور اصطلاح Epistemology کی محدودیت کو ختم کرنے اور اس کے مفہوم کو اور زیادہ وسعت دینے کے لیے اس کی جگہ Theory of Knowledge کا استعمال مناسب ہوگا۔ اس کے مفہوم میں عقلی نظریات کے ساتھ ساتھ تجرباتی اصولوں کو بھی شامل کر لینا چاہئے۔ ڈیوی کے مطابق روایتی علمیات، چاہے وہ عقلی ہو یا تجرباتی، تخیلات اور حقیقی دنیا میں ایک فرق پیدا کر دیتی ہے۔ وہ تخیلات کو ترجیح دیتا ہے اور ان ہی کو علم کا مرکز قرار دیتا ہے۔ حقیقی دنیا اور تخیلات کے متعلق بحث اُس کے کئی مقالات میں نظر آتی ہے۔

اگر جان ڈیوی کے خیالات سے اتفاق کیا جائے کہ تخیلات اور ان کا حلقہ اثر دنیا کے باہر کی شے ہے، تو پھر اُن کا تعلق دنیاوی مسائل سے کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے یہ دلیل پیش کی کہ علمی طور پر تخیلات کو وقوفیت کا ایک مظہر تصور کرتے ہوئے یہ تسلیم کر لیں کہ اسی کی وجہ سے انسان اپنی ذات کی پہچان کر سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اپنے تخیلات کی بنا پر حقیقی دنیا سے ایک واسطہ قائم کئے ہوئے ہے کیونکہ خود اس کی ذات کے وجود کی بنیاد اس کے تخیلات ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ جان ڈیوی ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے بہت متاثر تھا۔ ڈارون کے نظریہ سے اس بات کو تقویت پہنچتی ہے کہ دنیا کے تمام حیاتیاتی اجسام علم اشکال الاعضاء (Morphology) کے اصولوں کے تحت ایک فطری عمل کے ذریعہ اپنی شکلیں اپنے ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت ڈارون کے اس خیال کو ماورائی تصور کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں اس نظریہ کو تسلیم کر لیا گیا کہ تمام حیاتیاتی عضویات یا اجسام اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس طرح اگر اسی بات کو دوسرے انداز میں کہا جائے تو ان کی اشکال سے ان کے ماحول کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس طرح ماحول کی بدلتی ہوئی حالت سے تطبیقی انسانی رد عمل کو بھی تسلیم کیا جانا



چاہیے۔ جان ڈیوی نے عضویات اور ماحول کے اس تعلق کو اپنے نظریات میں سمو کر یہ خیال پیش کیا کہ نظریہ علمیت کی ابتداء اس خیال سے ہوتی ہے کہ انسان اپنے ماحول سے کیا چرا لیتا ہے اور ماحول سے کیا سیکھتا ہے۔

اسی سلسلہ میں آگے بڑھتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ انسان کے تخیلات پر بھی ماحول اثر انداز ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، وہ تخیلات کو بنیادی طور پر عضویات اور ماحول کے ٹکراؤ کا نتیجہ مانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس ہم عملی کے نتیجہ میں جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے، وہ عملی اور آلائی طور پر اس ہم عملی کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ اسی مسئلہ کو سامنے رکھ کر اس نے نفسیات میں پہلی بار آلائیت (Instrumentalism) کی اصطلاح استعمال کی۔ اس خیال کے نظریہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ کسی عمل کا آلہ کار ہے اور اس کی سچائی اس کی افادیت پر مبنی ہے۔

جان ڈیوی اپنی کتاب کی اشاعت کے تقریباً دس سال تک اپنے مختلف نظریات پر غور و خوض کرتا رہا، خاص طور پر اس کی محویت کا مرکز نظریہ آلائیت اور اس کے مختلف پہلو پر غور تھا اور اس نکتہ پر غور کرتا رہا کہ اس کا اطلاق کہاں کہاں کیا جاسکتا ہے؟ اسی دوران اس نے اپنے ایک مقالہ میں ولیم جیمس کی مخالفت کر ڈالی اور مفکرین کے سامنے ایک سوال کھڑا کر دیا کہ کیا ولیم جیمس کے Pragmatism کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مابعد الطبعیات کے تحت یہ نظریہ فطری ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ڈیوی نے لکھا تھا کہ اس کے دل میں یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ روایتی مابعد الطبعیات کے اکثر اصولوں کے مطابق تحریکات کے ذریعہ غیر تغیر پذیر عناصر کی تلاش ہی ایک مقصد ہوتا ہے، جن کے ذریعہ علم میں اضافہ کیا جاسکے۔

ڈیوی کے خیال میں Pragmatism کے مطابق علم کی بنیاد ایسی کارکردگی ہے جو انسانی ضروریات کے تحت عمل میں لائی گئی ہو اور ایک حقیقی عقیدہ، جو کسی نفسیاتی یا علم الوجود کی بنیاد پر نہ ہو، وہ کسی ایسے مسئلہ کو زیر بحث نہیں لاسکتا جو تجرباتی طور پر مناسب نتائج نہ ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا ہو۔



جہاں تک نفسیات کا تعلق ہے، جان ڈیوی نے فلسفہ کے ساتھ ساتھ علم النفس پر بھی اپنی توجہ مرکوز رکھی اور خاص طور پر وظیفی نفسیات پر بہت کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو نفسیات کے اس شعبہ کے بانیوں میں سے ایک اہم رکن تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی پہلی کتاب نفسیات پر ہی تھی اور اس سلسلہ میں اس کا ایک اور اہم کام اس کا مضمون *The Reflex Arc Concept in Psychology* سمجھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس زمانے میں موجود ماہرین نفسیات کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ یہ مقالہ اس نے ۱۸۹۶ء میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں اس نے Reflex Arc حسی حرکی قوس کی جگہ استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاح اعصابی نظام کی وظیفی اکائی کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو اعصاب میں ربط قائم کرتی ہے، یا جب ایک عضوی نظام ایک مخصوص حالت میں حرکی جوابی فعل ادا کرتا ہے۔ اس طرح یہ اکائی اعصابی نظام کا سب سے اہم وظیفہ ادا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

جان ڈیوی نے اس نظریہ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ جسم اور ذہن سے متعلق قدیم نظریہ ثانویت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اب جدید تحقیقات کی روشنی میں اس کا مفہوم بدل دینا چاہئے اور اس کا یہ مفہوم لینا چاہئے ”حقیقی دنیا اور عضویات کی ہم عملی کے باعث وہ کارکردگی جو حسی اور حرکی رد عمل میں ایک تعلق پیدا کرتی ہے۔“ اس طرح اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کو ایک انفعالی مدرکہ کی طرح نہیں جاننا چاہئے بلکہ اس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جاننے اور سمجھنے کے عمل میں ماحول کا فعال کردار بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا کہ جان ڈیوی کو وظیفی نفسیات Functional Psychology کا بانی تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ تین اور اہم مفکرین کے نام بھی شامل ہیں۔ جیسے ولیم جیمس، جو ڈیوی سے ۷۱ سال بڑا تھا اور جان ڈیوی کے آنے سے پہلے ہی وہ امریکہ میں اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ پھر میدان ڈیوی نے سنبھالا اور اس مکتب فکر کو لے کر آگے بڑھا تو اس کو جیمس انجیل کا ساتھ ملا جو اس سے عمر میں دس



سال چھوٹا تھا۔ انجیل کے ساتھ مل جانے سے وظیفی نفسیات میں کام تیز ہو گیا اور ڈیوی اب نئی توانائی کے ساتھ اپنی کوششوں میں لگ گیا۔ پھر ان دونوں کے کام کو ہاروی کار (Harvey Carr 1873-1954) نے آگے بڑھایا۔ ان چاروں مفکرین اور دانشوروں کا ایک ساتھ ایک ہی مقام پر جمع ہو جانا نفسیات کے اس شعبہ کے لئے فال نیک ثابت ہوا اور ہر یونیورسٹی میں اس شعبہ پر کام ہونے لگا۔ حالانکہ یہ چاروں ماہرین اپنے اپنے راستے چل رہے تھے، لیکن وظیفی نفسیات کے سلسلہ میں یہ ہم خیال تھے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شعبہ کی ترقی اور عروج میں ان چاروں کا بڑا ہاتھ ہے۔

جان ڈیوی کا عہد اگر دیکھا جائے تو ایسا دور تھا جب فلسفہ تمام علوم پر حاوی تھا اور دنیا کے کونے کونے میں لوگ فلسفہ کو اپنا کر اس علم کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ ڈیوی کے بہت سے ہم عصر مسلسل تحقیق و تجربات میں مصروف تھے اور اس طرح اس شعبہ علم کی ترویج و ترقی کا باعث تھے۔ جان ڈیوی کے کام کو اس کے ہم عصر دانشوروں نے بہت سراہا، ساتھ ہی اس کو تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ناقدین کا خیال تھا کہ ڈیوی کے نظریات میں الجھاؤ اور پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں اور وہ ان نقائص کو دور کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس پر تنقید کرنے والوں میں برٹرینڈ رسل جیسے جید فلسفی بھی شامل تھے۔ ڈیوی تنقید کے سلسلہ میں بہت حساس تھا اور وہ اپنے ناقدین کا فوراً جواب دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں وہ اس کے خیالات کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ اس کا اپنے بارے میں یہ بھی خیال تھا کہ جن موضوعات پر وہ سوچتا ہے، جدید رجحان کے تحت سوچتا ہے۔ جبکہ اس کے ناقدین کے ذہن پر اس خاص موضوع پر روایتی اور قدیم خیالات حاوی ہوتے ہیں۔

ڈیوی کا کام بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں کافی اہم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی اہمیت کم ہوتی گئی، کیونکہ ان دنوں میں فلسفہ کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی اور نہ صرف امریکہ اور یورپ، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی فلسفہ کے ماہرین اپنے جدید خیالات کے ساتھ ابھرے اور چھا گئے، اور ان کے سامنے ڈیوی کے کام کی



اہمیت کم ہوتی گئی۔ لیکن یہی حال ان دانشوروں کا بھی ہوا جن کی وجہ سے ڈیوی کا کام دندھلا گیا تھا۔ کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہوتے گئے۔ اب جب فلسفہ کے عروج کا دور ختم ہو گیا ہے، ہم تمام مفکرین کو ان کے انفرادی کاموں کو نظر میں رکھ کر اور ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کر کے ان کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر ان کے نظریات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

جان ڈیوی نے فلسفہ سے متعلق موضوعات جیسے نفسیات، فطرتیت اور مابعدالطبیعیات پر بہت کام کیا ہے۔ اس نے ان موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے اور شائع کیا ہے، وہ سب آج بھی فلسفہ میں ایک بیش بہا خزانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ اب تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جان ڈیوی زود نویس تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ بسیار نویس تھا اور ہ اپنی کتابوں کو مکمل کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ اوپر جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاوہ بھی وہ مختلف جرنل میں اپنی تخلیقات بھیجتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی کتابوں میں سے بہت کم دستیاب تھیں، لیکن ۱۹۷۱ء میں اس کی ایک شاگردہ Jo Ann Boydston نے بہت محنت اور جاں فشانی سے اس کی تمام تخلیقات کو یکجا کر کے اور مرتب کرنے کے بعد ایک کتاب کی شکل میں The Collected Work of Jhon Dewey کے نام سے ۳۷ جلدوں میں شائع کیا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ ۱۹۹۱ میں دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا اور آج بھی یہی سرمایہ ہے جو نفسیات میں اور فلسفہ میں اہمیت رکھتا ہے اور جس کی وجہ سے ڈیوی کا نام زندہ ہے۔



# ایڈورڈ ٹچینر

Edward B. Titchener (1867-1927)

امریکہ کی اکیرون یونیورسٹی نے جب امریکہ میں نفسیات کی تاریخ مرتب کی اور ان مفکرین کی فہرست تیار کی، جنہوں نے امریکہ میں نفسیات کی بنیاد ڈالی اور اس کو فروغ دیا، تو اس فہرست میں ایڈورڈ ٹچینر کو پہلے دس مفکرین میں مقام دیا اور ان کو *Pioneers of psychology* کہا۔ حالانکہ ٹچینر کی خدمات امریکی نفسیات تک ہی محدود رہیں۔ لیکن اس نے ساختیت مکتب فکر (Structualism) کے لئے بہت کام کیا، ساتھ ہی اس نے وونٹ کے کام کو آگے بڑھایا اور اس کا ایک فعال معتقد ہونے کا فرض ادا کر دیا۔ یہ مکتب فکر دم توڑ رہا تھا۔ اُس کو اُس وقت ٹچینر جیسا دانشور ملا جس نے امریکہ میں اس کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی۔ ٹچینر کا نام صرف اس لئے ہی مشہور نہیں کہ اس نے وونٹ کے نظریہ ساختیت کو فروغ دیا، بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے تجرباتی نفسیات کی بنیاد ڈالی اور کارنیل یونیورسٹی کی تجربہ گاہ کو امریکہ میں اختباری نفسیات کے ایک مرکز کی شکل میں فروغ دینے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

ایڈورڈ ٹچینر برطانیہ کے رومن علاقہ میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا۔ ایڈورڈ بہت چھوٹا تھا کہ اس کا باپ انتقال کر گیا اور یہ بالکل بے سہارا ہو گیا۔ ایڈورڈ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا تھا، اس کو اپنے بے سہارا ہونے کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ماں نے اس کی ہمت بڑھانے کی کوشش جاری رکھی اور اس کے ذہن سے یہ احساس ختم کرنے کی



کوشش کی کہ وہ بے سہارا ہے اور اس کا مستقبل تاریک ہے۔ اس نے ایڈورڈ کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ ۱۴ سال کا تھا تو پرائمری اسکول سے نکل کر مالون کالج میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد وہ آکسفورڈ چلا گیا۔ آکسفورڈ جانے کے بعد اس کو احساس ہو گیا کہ اب وہ اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ وہاں اس نے فلسفہ کو اپنا موضوع بنایا اور چار سال تک اس موضوع پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ ان چار سالوں میں اس نے آکسفورڈ میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور پانچویں سال وہ مشہور ماہر علم الاعضا Burdon Sanderson کا ریسرچ اسٹنٹ مقرر کر دیا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ.....

”میں اس عظیم شخص کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کے ماتحت کام کرنے پر مجھے ایک قسم کے فخر کا احساس ہوتا تھا۔ شاید آکسفورڈ میں جو مدت میں نے گزاری، اس دوران اکثر اس عظیم ہستی کی ستائش سنی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میری تمنا تھی کہ مجھے اس کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملے..... اور میری یہ تمنا پوری ہو گئی۔“

لیکن اس کے باوجود اس کو آکسفورڈ کا ماحول اس نہیں آیا یا اس کو خود Leipsig جانے کا خیال آیا۔ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی توجہ نفسیات کی جانب مبذول کر دی تھی اور اس وقت لاپسگ نفسیات کی تعلیم کے لئے مشہور تھی۔ یہ خیال اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ خود یہ کہا تھا کہ..... ”فلسفہ کی تعلیم کے دوران میری توجہ نفسیات کی جانب گئی اور میں نے اس موضوع کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔“ لاپسگ میں اس کو نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے اور کئی دوست مل گئے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہاں ولیم وونٹ جیسا معلم ملا، جس کی شخصیت نے اس پر بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ ٹچینر وونٹ سے عمر میں تقریباً ۳۵ سال چھوٹا تھا اور یہ وہ دور تھا جب وونٹ میں الگ تھلگ رہنے کا رجحان پیدا ہو چکا تھا اور وہ زیادہ تر اپنی تجربہ گاہ یا اپنے دفتر میں وقت گزارتا تھا اور بہت کم کلاس لیتا تھا۔ اس لئے ٹچینر اس سے کوئی ذاتی تعلق قائم نہیں کر سکا۔ لیکن وونٹ کی عالمانہ شخصیت سے وہ بہت متاثر تھا اور اس کے اثرات اس کی



پوری زندگی پر پائے گئے۔

۱۸۸۲ء میں لچینر نے نفسیات میں ڈگری حاصل کی اور واپس آکسفورڈ میں آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہاں نفسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کر دیا جائے گا۔ لیکن اُن دنوں آکسفورڈ میں نفسیات کے پروفیسر کی کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لئے اُس کو مجبوراً ۶۱ ماہ تک حیاتیات پر لیکچر دینا پڑے۔ وہ نفسیات سے دُور نہیں رہنا چاہتا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ اس کو کہیں نفسیات کے شعبہ میں تقرری مل جائے۔ اُن ہی دنوں اُس کا ایک دوست جو کارنیل یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، کسی دوسری یونیورسٹی میں چلا گیا اور اس نے لچینر کو اطلاع دی۔ لچینر نے اس جگہ کے لئے درخواست دی اور وہ منظور کر لی گئی، اور اس طرح وہ ۱۸۸۲ء میں ہی کارنیل یونیورسٹی میں آگیا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ خوشی کی یہ بات تھی کہ وہ نہ صرف نفسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا، بلکہ اس کو یونیورسٹی کی نفسیاتی تجربہ گاہ کا انچارج بھی بنا دیا گیا۔ یہ تجربہ گاہ اس کے دوست فرینک آٹنبل نے قائم کی تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کارنیل یونیورسٹی میں آنے کے بعد لچینر نے نفسیات کی تعلیم کا حق ادا کر دیا۔ اس نے اس تجربہ گاہ کو نئے سرے سے آراستہ کیا اور نئے نئے آلات فراہم کیے اور وہاں تجربات کا سلسلہ زور و شور سے جاری ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کارنیل یونیورسٹی کا نفسیات کا شعبہ مشہور ہو گیا اور وہاں طلباء میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا۔

ابتداء میں لچینر خود اپنے شاگردوں کے ساتھ تجربات میں شانہ بشانہ کھڑا رہتا تھا اور ان تجربات کی رپورٹ تیار کرتا تھا۔ ہر رپورٹ ایک مدلل مقالہ کی شکل میں پیش کی جاتی تھی۔ اس طرح اس نے ۷ سال میں ۶۲ مقالات لکھے جو اُن تجربات کی رپورٹ کی صورت میں تھے جو اس نے اپنی تجربہ گاہ میں انجام دئے تھے۔ ۱۹۰۰ء کے بعد اس نے تحقیق و تجربات کا کام اپنے طلباء پر چھوڑ دیا۔ اس کے تحت تربیت یافتہ طلباء نئے طلباء کی رہنمائی کرتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے ہی تجربات کی رپورٹ تیار کراتا تھا اور



ان ہی کے نام سے شائع کرتا تھا۔ حالانکہ اس کے بعد اس نے اپنے نام سے کوئی مقالہ شائع نہیں کیا، لیکن اس کے شاگرد ہر مقالہ میں اس بات کی وضاحت کر دیا کرتے تھے کہ یہ رپورٹ ٹچینر کی رہنمائی میں تیار کی گئی ہے۔ اس کی محنت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی رہنمائی میں ۸۵ شاگردوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ جو تحقیقات کی گئیں، اُن پر ۲۶ مقالات قلمبند کیے گئے جو امریکہ کے American Journal of Psychology کے پہلے تیس شماروں میں شائع ہوئے۔ ان مقالات میں تحسیس، یادداشت، توجہ اور ادراک جیسے موضوعات پر تحقیق کے نتائج تھے۔ یہ ایسا کام تھا جس کی وجہ سے نہ صرف ٹچینر ہی نفسیات کے شعبہ میں مشہور ہوا بلکہ کورنیل یونیورسٹی کے نفسیات کے شعبہ کا بھی درجہ بلند ہو گیا۔

ٹچینر کا ایک اور اہم کام یہ ہے کہ اس نے وونٹ کی ایک اہم تخلیق The Principles of Physiological Psychology کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ وہ وونٹ سے اس قدر عقیدت رکھتا تھا کہ اس نے یہ کام مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ تین جلدوں کا ترجمہ زیر تکمیل تھا کہ اس کو معلوم ہوا کہ چوتھی جلد بھی شائع ہو گئی ہے۔ اُس نے چوتھی جلد کا ترجمہ مکمل کیا تو پانچویں جلد مکمل ہو گئی اور جب اس کا ترجمہ مکمل ہوا تو چھٹی جلد شائع ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اس کے صرف چھ ابواب کا ترجمہ مکمل کر سکا اور وہ بیمار ہو گیا۔ اس نے اس کتاب کا جتنا ترجمہ کیا تھا اس کو شائع کر دیا۔ اس کتاب کے باقی حصہ کا ترجمہ ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔ اس دوران ٹچینر اپنے تخلیقی کاموں میں مصروف ہو گیا اور پہلی مکمل کتاب Outlines of Psychology کے عنوان سے ۱۸۹۶ء میں مکمل کر کے شائع کی اور اس کے دو سال بعد ہی Primes of Psychology شائع کی۔ پھر وہ اختباری نفسیات کی جانب متوجہ ہوا اور اس نے اپنے تجربات کے نچوڑ کی شکل میں Experimental Psychology کی شکل میں چار جلدیں مکمل کیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جس کام کو وونٹ نے شروع کیا تھا، اس کو اس کے شاگرد نے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔



اختہاری نفسیات (تجرباتی نفسیات) پر مچینر کی یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے اس کتاب کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ یہ اس موضوع پر کام کرنے والے مفکرین کے لیے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اس کتاب کا ذیلی عنوان A manual of Laboratory Practice دیا ہے۔ اس نے اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے دو حصوں میں تجربہ گاہ میں تربیت دینے والوں کے لئے اصول بیان کیے ہیں اور دوسرے دو حصوں میں ان لوگوں کی رہنمائی کی گئی ہے جو تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں نفسیات کے ایسے تمام موضوعات پر ہدایات ہیں جن پر تجربہ گاہ میں تجربات کئے جاسکتے ہیں، مثلاً تحسین، ادراک، توجہ، آموزش، اور وقوف وغیرہ۔

مچینر کا اپنے مضمون سے لگاؤ کا یہ حال تھا کہ وہ شروع سے صرف ان لوگوں سے دوستی کرتا تھا جن کا تعلق نفسیات سے ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ زیادہ تر الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ وہ جب تعلیم حاصل کر رہا تھا تب بھی اس کے دوستوں کی تعداد پانچ یا چھ سے زیادہ نہیں تھی، اور وہ سب نفسیات کے طالب علم تھے۔ اس طرح ان لوگوں میں جو گفتگو ہوتی تھی اس پر بھی نفسیات چھانی رہتی تھی اور سب لوگ مل کر اپنے اپنے مشاہدات اور تجربات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اس نے نفسیات کو اپنے اوپر لا دیا تھا۔ اس کے جو دوست تھے، جب الگ ہوئے اور ان سے خط و کتابت کا سلسلہ رہا تو بھی وہ نفسیات پر ہی لکھتا تھا اور یہ خط کافی طویل ہوتے تھے۔ اس کے ایک دوست نے دعویٰ کیا کہ اس کے پاس مچینر کے ۲۱۲ خطوط ایسے ہیں جن میں اس نے نفسیات کے بہت باریک باریک نکات پر بحث کی ہے، اور اگر ان خطوط کے مجموعہ کو شائع کر دیا جائے تو ایک اہم نفسیاتی کتاب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سماجی طور پر زیادہ تر الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ جب وہ کورنیل یونیورسٹی میں تھا، تب بھی اس نے اپنے ملنے والوں کا دائرہ محدود ہی رکھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس دائرہ کو وسیع کرنے کے بجائے مختصر کرتا رہا۔ اس کے ملنے



والے یہ کہتے تھے کہ لگتا تھا جیسے اس کے اندر ایک راہب کی شخصیت پوشیدہ ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کورنیل یونیورسٹی میں ایک معلم کے وقار کو بلند رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی کلاس میں نظم و ضبط کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ لیکچر دینے سے پہلے اپنی تجربہ گاہ میں کچھ وقت گزارتا اور وہاں ہر چیز اپنی جگہ پر ہے یا نہیں، اس کا بہت خیال رکھتا۔ وہ یہ کام اپنے سینئر شاگردوں کے ذریعہ انجام دیتا تھا اور جب تک تجربہ گاہ بالکل تیار نہ ہو، تب تک وہ ان کو ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اس کی ہدایات تھیں کہ لیکچر شروع ہونے سے پہلے تمام طلباء اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ جو طلباء لیبارٹری میں اس کی مدد کرتے تھے، وہ سب سے آگے بیٹھا کرتے تھے اور مقررہ وقت پر وہ سامنے کا دروازہ بند کرنے کا اشارہ کرتا تھا۔ اس کے بعد پیچھے کے دروازہ سے اپنے روایتی انداز میں گاؤن پہن کر بڑے پُر وقار طریقہ پر وہ لیکچر ہال میں داخل ہوتا۔ اس کا کہنا تھا کہ جس علم کی تعلیم دی جاتی ہے، اُس علم کی عظمت کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور جب تک ہم اپنے علم، اپنے موضوع کا احترام نہیں کریں گے، ہم اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔

۱۸۸۲ء میں امریکن سائیکولوجیکل ایسوسی ایشن کے ایک اہم عہدہ پر اس کا انتخاب ہوا۔ لیکن وہ اس عہدہ سے بہت جلد دست بردار ہو گیا، کیونکہ اس نے وہاں دیکھا تھا کہ ایسوسی ایشن کا طریقہ کار اس کے خیال میں سائنٹفک مطالبات کو پورا نہیں کرتا تھا اور اس ادارہ کی بعض تجاوزات اس کے پیشہ سے متعلق اخلاقیات کے ساتھ انصاف نہیں کرتی تھیں۔ لیکن ایسوسی ایشن کو چھوڑنے کے بعد بھی وہ نفسیات سے متعلق افراد سے اپنے موضوع کے تعلق سے جڑا رہا، اور ایسا بھی ہوا کہ جب اس کے شہر میں ایسوسی ایشن کا جلسہ منعقد کیا گیا تو اس کے گھر پر ان لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا جو جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے دُور دراز سے آتے تھے اور وہاں ٹچینز کو نہیں پاتے تھے۔ اس بات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے مفکرین کی نظر میں اس کی شخصیت کی کتنی اہمیت تھی۔



۱۹۰۴ء کی ابتدا میں ٹچینر نے اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک گروپ تشکیل دیا جو اختباری نفسیات میں دلچسپی رکھتے تھے اور اسی بنیاد پر اس گروپ کا نام Experimentalists رکھا۔ یہ دراصل کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں تھی بلکہ چند ہم خیال مفکرین کی ایک نشست کی حیثیت تھی۔ لیکن اس کے بعد اس کی باقاعدہ میٹنگ ہونے لگیں۔ اس کا سالانہ جلسہ بھی ہوتا تھا اور اس کو منعقد کرنے کی ذمہ داری اس وقت کے لیباریٹری کے ڈائریکٹر کی تھی۔ لیکن اس میٹنگ میں کس کس کو مدعو کرنا اور کس موضوعات پر بحث ہوگی، یہ طے کرنا ٹچینر کی ذمہ داری تھی۔ یہ گروپ آج بھی موجود ہے اور پہلے سے زیادہ منظم شکل میں ہے، اور آج بھی برطانیہ میں اختباری نفسیات کے تعلق سے اس گروپ کی بیش قیمت خدمات شامل ہیں۔ اس گروپ کے کام کی تفصیل امریکن جرنل آف سائیکولوجی میں باقاعدہ شائع ہوتی تھیں۔ ٹچینر ابتداء میں اس جرنل کا معاون ایڈیٹر تھا اور بعد میں وہ اس کا مدیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا، اور اسی لیے اُس نے اس جرنل کے ذریعہ اپنے گروپ کے کام کی تشہیر کی اور نفسیات کے ماہرین کو اس جانب متوجہ کیا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے اس جرنل کو اپنے نظریات کی تشہیر کے لیے استعمال کیا اور خاص طور پر وہ کورنیل یونیورسٹی کے گریجویٹ کو اس کے ذریعہ ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حالانکہ اس کے اس رجحان کی وجہ سے اس کو اپنے ناقدین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنا کام جاری رکھا۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں اس نے اپنی تمام تر توجہ نفسیات کے نصاب کی تیاری اور ترتیب میں مبذول کردی اور کئی سال کی محنت کے بعد اپنی ایک اور اہم تخلیق Textbook of Psychology شائع کی۔ اس معرکتہ الآرا کتاب کے بازار میں آتے ہی دھوم مچ گئی اور اس کی شہرت کورنیل یونیورسٹی سے نکل کر امریکہ کی بہت سی یونیورسٹیوں تک پہنچ گئی اور وہاں اس کتاب کو نفسیات کی تعلیم کے لیے ایک رہنما کی حیثیت دی گئی۔ اس کتاب کی آج بھی وہی اہمیت ہے جو اس زمانہ میں تھی۔ اس کتاب



میں بڑی محنت سے نفسیات کے مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ اس کتاب کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس نے اس کی دوسری جلد کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن یہ نفسیات کی بد قسمتی کہ وہ اس کو مکمل نہ کر سکا۔ لیکن اس کے کچھ حصے اس نے جرنل میں شائع کیے جو کافی پسند کئے گئے۔ نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے مفکرین اور نفسیات کے طلباء اس کتاب کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن یہ مکمل نہیں ہو سکی۔

۱۹۱۲ء کے بعد اس کی تخلیقی صلاحیتوں میں اچانک کمی آنے لگی۔ اس کے بعد اس نے بہت کم لکھا اور جو کچھ لکھا وہ اس کی پچھلی تخلیقات کے مقابلہ میں اتنا جامع اور مبسوط نہیں تھا۔ اس کی فکری بلندی کے زوال کا سبب اس کے دماغ میں پھوڑا ہو جانا بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کو اپنی بیماری کا پتہ اپنی موت سے کچھ دن پہلے ہی چلا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیماری کافی عرصہ پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور اندر ہی اندر بڑھ رہی تھی اور اپنے اثرات پیدا کر رہی تھی۔ اس کے اندر جو فکری تعلق سے تبدیلی پیدا ہو گئی تھی وہ اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی توجہ نفسیات سے ہٹالی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس عمیق موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے اپنے شوق کو بدل دیا اور اچانک اس نے پرانے سکوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ یہ پرانے سکے خاص طور پر مسلمان سلاطین کے زمانے کے تھے۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ اس نے کئی مسلم ممالک کا دورہ بھی کیا اور سکوں کی عبارت سمجھنے کے لیے اُس نے عربی بھی سیکھ لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے کچھ دوستوں کا خیال تھا کہ وہ شاید اسلامی فلسفہ کی جانب جھکتا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے قریبی دوستوں نے اس رائے کو تسلیم نہیں کیا۔

وہ امریکہ میں رہتے ہوئے بھی برطانیہ کا شہری تھا۔ اس نے کبھی امریکہ کی شہریت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس کی وجہ سے اس کو کبھی کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑا اور امریکہ کے بعض اعزاز، جن کا وہ حقدار تھا، اُن سے اس کو محروم رہنا پڑا۔ کیونکہ ان اعزاز کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ صرف امریکہ کے شہریوں کو دئے جاتے



تھے۔ اتنا ہی نہیں اس کو بعض اداروں کی ممبر شپ بھی نہیں مل سکی جس کا وہ حقدار تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ٹچینر نے نفسیات کو اپنے اوپر لا دیا تھا لیکن اپنی عمر کے آخری کچھ سالوں میں اس نے نفسیات سے بے توجہی کا مظاہرہ کیا اور اس کی یہ کیفیت اس کے دوستوں کے لیے تعجب خیز تھی۔ اس کے ساتھ رہنے والے بھی اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکے کہ جس شخص نے نفسیات کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، اچانک نفسیات سے اس کی دلچسپی کیوں ختم ہو گئی۔ اس سلسلہ میں اس کے وہ دوست، جو ہمیشہ اس کے ساتھ نفسیات کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے، زیادہ پریشان تھے۔

ٹچینر کا خیال تھا کہ ہر سائنسداں کسی نہ کسی طرح اپنے موضوع کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کے تجربات سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس نے اس طرح دی کہ پانی کے گلاس میں جب ایک سلاخ ڈالی جاتی ہے تو وہ باہر سے ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ یہ سائنس کا موضوع ہے اور انسانی ذہن کو نہ اس پانی کے گلاس سے کوئی تعلق ہے، نہ اس سلاخ سے۔ لیکن اس مظہر کا تجربہ ایک ذہنی عمل ہے۔ اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ نفسیات میں تجربہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اس وجہ سے کردار کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس نے نظریہ کرداریت کی نفی کر دی بلکہ اس نے اپنے مضامین میں مشاہدہ باطن کی وکالت کی اور اس بات پر زور دیا کہ اگر ہم انسانی تجربات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اندر جھانک کر دیکھنا ہوگا اور اپنے احساسات کی روشنی میں دوسروں کے احساسات کو سمجھنا چاہئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ علم النفس کی ترقی اور بقا کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کو تجربات میں معروض بنایا جاتا ہے، ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے احساسات بغیر کسی جھجک کے بیان کریں اور اس کا کوئی حصہ پوشیدہ نہ رکھیں۔ ورنہ ایسے تجربات کے نتائج قابل اعتبار نہیں رہیں گے۔

ٹچینر کے خیال میں انسانی ذہن اس کی زندگی بھر کے تجربات کا انچوڑ ہوتا ہے اور ان تجربات کے مواد سے ہی شعور کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ شعور



اور ذہن ایک ہی چیز ہے۔ اگر دونوں میں کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ شعور میں حال ہوتا ہے اور ذہن میں ماضی کے تجربات..... اور یہ تجربات بھی شعور کے راستے ذہن کے خزانے میں جاتے ہیں اور یہ ایک ذہنی عمل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو موجود ہے، وہ شعور میں ہے اور جو موجود نہیں، وہ لاشعور میں ہے۔ اس کے خیال میں نفسیات کے تحت صرف شعور اور لاشعور سے متعلق ذہنی اعمال سے بحث ہونا چاہئے۔ اس نے ولیم جیمس کی کتاب پر بھی تنقید کی۔ اس نے لکھا ہے کہ اس کتاب کو Theory of Knowledge تو کہا جاسکتا ہے، لیکن Psychology بالکل نہیں۔

اس نے ان مسائل کا ذکر کرتے ہوئے، جو نفسیات کے سامنے ہونا چاہئے، لکھا ہے کہ ماہرین نفسیات کو تین سوالوں کے جواب تلاش کرنا ہوتے ہیں..... ”کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟“ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہیں ہر مسئلہ کو ان ہی سوالات کے جوابات کی روشنی میں حل کرنا چاہئے۔ اس نے لکھا کہ ”کیا؟“ کے جواب میں اسے دیکھنا چاہئے کہ شعوریت براہ راست قابل مشاہدہ ہے۔ یہ چند سادے عناصر پر مشتمل ہوتی ہے جس کا تجزیہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے اور ان عناصر کو الگ الگ کر کے اس سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ ”کیوں؟“ کا جواب تلاش کرنے میں ماہر نفسیات کو نامیاتی اصولوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہ شعوریت کے عناصر کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ اس کے نتائج اخذ کیے جاسکیں اور ان نتائج کی بنیاد پر مختلف تراکیب کے اصول وضع کئے جاسکیں۔ اس طرح ”کیسے؟“ کا جواب اس کے خیال میں ذرا مشکل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ذہنی عمل کسی دوسرے ذہنی عمل کا موجب نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ نیوٹن کے کلیہ کے مطابق ہم یہ تو ثابت کر سکتے ہیں کہ روشنی میں سات رنگ شامل ہوتے ہیں، لیکن اس بات کا جواب ہمارے پاس نہیں کہ یہ سات رنگ مل کر سفید رنگ میں کیسے تبدیل ہو جاتے ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ ٹچینر کی ذاتی زندگی کے حالات کہیں نہیں ملتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں اس کی موت کے ایک سال بعد ہی بورنگ نے اُس کی سوانح لکھی تو اس میں بھی



اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بیان نہیں تھا۔ بلکہ اس نے زندگی بھر نفسیات کے لیے کیا کام کیا اور اسی سلسلہ میں بیانات تھے۔ حالانکہ ٹچینز کو نفسیات کے ساختیات کے شعبہ کا معمار یا بانیوں میں سے ایک اہم شخصیت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن اس نے عمومی نفسیات میں بھی کافی اہم کارنامے انجام دیے ہیں اور اس کو مکمل طور پر نفسیات کا ایک عہد ساز مفکر تسلیم کیا جاتا ہے اور خاص طور پر اس کی تخلیقات امریکہ میں بھی جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔

○○



# ایڈورڈ تھارنڈائک

Edward Thorndike (1874-1949)

جب ہم نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سے ایسے دانشوروں کے نام آتے ہیں جنہوں نے نفسیات کو فروغ دینے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ اردو میں بہت سے دانشوروں کا تذکرہ نہیں ملتا اور اسی لیے اردو کے قارئین اُن سے متعارف نہیں۔ ایسے مفکرین کی خاصی تعداد ہے جن کی کوششیں اگر شامل نہیں ہوتیں تو نفسیات کو فروغ حاصل نہیں ہوتا اور یہ مفید علم ابھی تک فلسفہ کی ایک شاخ کی حیثیت سے صرف فلسفہ کے طلباء تک ہی محدود رہتا۔ یہ فہرست کافی طویل ہے اور اس میں سے اگر چند کا انتخاب کیا جائے تو ان میں تھارن ڈائک، ورتھائمر، کرٹ کوفکا، بیولوف وغیرہ ایسے ماہرین ہیں جن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہم سوچ سکتے ہیں کہ جب نفسیات ایک آزاد علم کی حیثیت پا کر فلسفہ سے الگ ہوئی اور سائنس کے زمرے میں شامل ہونے کے لیے تگ و دو کرنے لگی، تو اس وقت اس کی وسعت کیا ہوگی؟ اور جس شکل میں ہمارے سامنے ہے، اس صورت میں آنے کے لیے اس کو کتنی صدیاں گزارنا پڑی ہوں گی اور اس دوران کتنے دانشوروں نے اس کو پروان چڑھانے کے لیے اپنا وقت صرف کیا ہوگا۔

بہر حال، اس بحث کو مختصر کرتے ہوئے ہم اصل بحث کی جانب رخ کرتے ہیں اور جس فہرست کا اوپر ذکر کیا ہے، اُس میں سے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتے ہیں



جس نے اُنیسویں صدی میں نفسیات میں ایک اہم شعبہ کی بنیاد ڈالی۔ اس نے حیوانات کی ذہانت سے متعلق تجربات کیے اور بلی، بندر اور کتوں پر تجربات کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جانور سعی و خطا کے ذریعہ سیکھتے ہیں۔ آج سرکس میں جب ہم حیوانات کو انسانوں کے اشاروں پر عمل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں یا راستوں پر ریچھ، بندر اور دوسرے جانوروں کے کرتب دیکھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کبھی بھی تھارن ڈانک کا نام نہیں آتا، جس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ جانوروں کو بھی تربیت دی جاسکتی ہے۔

ایڈورڈ تھارن ڈانک (Edward Lee Thorndike 1874 - 1949) ایک پادری کے ہاں پیدا ہوا، اس لیے اُس کا بچپن کسی ایک شہر میں نہیں گزرا۔ کیونکہ اس کے والد کا ایک گرجا گھر سے دوسرے گرجا گھر میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے بیٹے کی تعلیم منقطع نہیں کی، بلکہ جہاں گیا وہاں اس کی تعلیم کو جاری رکھا۔ ایڈورڈ تھارن ڈانک نے اپنی کالج کی زندگی برطانیہ کے ایک شہر میڈل ٹاؤن میں شروع کی اور وہاں عمدہ کارکردگی دکھاتے ہوئے تعلیم میں ترقی کرتا رہا۔ وہاں سے وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا جہاں اس کو ولیم جیمس جیسے عظیم مفکر کے ماتحت تعلیم حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس وقت تک ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیاتی تجربہ گاہ کا انتظام نہیں تھا۔ ولیم جیمس نے جب تھارن ڈانک میں تجرباتی نفسیات سے دلچسپی دیکھی تو اس کو وہ اپنے گھر لے گیا، جہاں اُس نے ایک تجربہ گاہ قائم کر رکھی تھی۔ حالانکہ یہ تجربہ گاہ ابتدائی شکل میں تھی، لیکن تھارن ڈانک نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ولیم جیمس کا کہنا تھا کہ تھارن ڈانک کے آنے سے اس تجربہ گاہ میں ایک جان سی پڑ گئی تھی، کیونکہ اُس نے یہ محسوس کیا تھا کہ تھارن ڈانک میں تجرباتی نفسیات سے بے پنہا لگاؤ تھا اور تھارن ڈانک اس لیے خوش تھا کہ تجربہ گاہ کی سہولت کے ساتھ ساتھ اس کو ولیم جیمس جیسے ماہر نفسیات کی رہنمائی مل رہی تھی۔ ہارورڈ میں دو سال گزارنے کے بعد تھارن ڈانک کو لمبیا چلا گیا جہاں اس کے شوق کو سراہا گیا اور اس کی ایما پر ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا، جہاں وہ



اپنے جانوروں کو رکھ سکے، جن پر وہ تجربات کر رہا تھا۔ اس طرح اس کی ہمت افزائی ہوئی اور اس کے جوش میں اضافہ ہو گیا۔ وہاں کے حالات کے بارے میں اس نے ایک خط اپنی ایک دوست کو لکھا جس کا ذکر Melwin & Hillix نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس خط کا مفہوم کچھ اس طرح تھا.....

”میرا کمرہ کیا ہے..... بس ایک کباڑ خانہ ہے۔ اس میں چوہے ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں، کچھ مرغیاں ایک کونے میں رکھے درجہ میں بند ہیں، کمرہ میں جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں اور تمباکو پھیلا ہوا ہے، جس کی بدبو کمرہ میں میں پھیل رہی ہے۔ اخبار کے ٹکڑے اور کتابیں بکھری پڑی ہیں، ایک کونے میں مٹی کے تیل کا ایک چولہا ہے، ساتھ ہی ایک فرائی پان رکھا ہے۔ قریب ہی ایک برتن پڑا ہے جس میں بلی کے لئے دودھ ڈال دیتا ہوں۔ اسی کمرہ میں ایک جھاڑو بھی ہے جس کا استعمال ہوتا ہی نہیں ہے۔ بس یہ کمرہ کی حالت ہے اور اسی حالت میں میں رہتا ہوں۔“

یہ خط اس کا بالکل ذاتی تھا اور اس نے اپنی اس دوست کو لکھا تھا جس کے ساتھ بعد میں اس کی شادی ہوئی۔ وہ اس خط کے ذریعہ اپنے لائوبالی پن کی تصویر کشی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں اس خط کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قارئین کو یہ معلوم ہو سکے کہ کن حالات میں اس نے تجرباتی نفسیات کی خدمت کی اور اس شعبہ کے فروغ میں معاون ثابت ہوا۔ اس مختصر سی تجربہ گاہ اور وسائل کی کمی کے باوجود اس نے جانوروں پر بہت سے تجربات کئے۔ اس نے بھول بلیاں قسم کا ایک ڈبہ تیار کیا تھا جس میں وہ چوہے کو چھوڑ کر یہ جاننے کی کوشش کرتا تھا کہ چوہا کتنی جلد صحیح راستہ اختیار کر کے باہر آ جاتا ہے۔ اس نے یہ دیکھا کہ دو تین بار چوہا غلطی کرتا ہے، پھر اپنی کوشش میں کامیاب ہوتا ہے اور باہر نکل آتا ہے، اور اسی چوہے کو جب بھی اس نے اس ڈبے میں چھوڑا، وہ ہر بار صحیح راستہ سے باہر آ گیا۔



اسی طرح اس نے چوہے دان کی طرز پر ایک پنجرہ بنایا تھا، جس میں وہ بھوکی بلی کو بند کر دیا کرتا تھا اور پنجرہ کے باہر اس کی خوراک رکھ دیا کرتا تھا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ کتنی جلد وہ محفوظ طریقہ سے باہر نکل سکتی ہے۔ اس پنجرہ میں ایک ایسا آلہ لگا ہوا تھا، جس پر اگر بلی کا پنجه پڑ جائے تو اس کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ بلی کو جب اس پنجرہ میں بند کر دیا جاتا تھا تو اپنے پنجنوں سے اس کی دیواروں کو کھرچنے کی کوشش کرتی اور یہ عمل بار بار ہر جگہ کرتی تھی۔ اچانک اس کوشش میں اس کا پنجه اس لیور پر پڑ جاتا تھا، جس سے دروازہ کھل جاتا تھا۔ اس نے ایک ہی بلی پر بار بار تجربہ کیا اور اس نے دیکھا کہ ہر بار وہ کچھ کم کوشش کے بعد کامیاب ہوتی تھی۔ اس بلی پر ۲۴ بار تجربہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اب اس کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس پنجرہ کے دروازہ کھولنے کا طریقہ کیا ہے۔ اسی طرح وہ چوہوں پر بھی تجربات کیا کرتا تھا۔

اپنے ان تمام تجربات کی تفصیل اس نے اپنی کتاب Animal Intelligence میں شائع کی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ چونکہ اس دوران اس نے اپنے تجربات کا دائرہ کافی وسیع کر دیا تھا اور کچھ دوسرے جانوروں پر بھی تجربات کئے تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں ان سب کی تفصیل بھی شامل کر دی تھی۔ اس طرح یہ کتاب تجرباتی نفسیات کی ایک مکمل اور بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

تھارن ڈانک کی کوششوں کو سراہا گیا اور کولمبیا یونیورسٹی نے اس کی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۴ سال تھی۔ اس کے بعد وہ ایک سال تک مقامی حکومت کے تعلیمی محکمہ میں ملازمت کرتا رہا۔ لیکن وہ وہاں مطمئن نہیں تھا کیونکہ تعلیم کے تعلق سے تعلیمی اداروں کے بارے میں اس کے خیالات بہت بلند تھے اور وہاں اس کو وہ معیار دیکھنے میں نہیں آیا جس کی وہ اُمید کر رہا تھا اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اس معیار کو بلند کرنے کی کوشش میں کامیاب بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اُس نے ایک سال کے بعد ہی اس ملازمت سے چھٹکارہ پا



لیا اور کولمبیا یونیورسٹی میں واپس آ گیا، جہاں اس کو ٹیچرز کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔ اُس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ اپنی اس ملازمت سے اُس کو ایک لگاؤ سا ہو گیا تھا اور وہ وہاں چالیس سال تک خدمات انجام دیتا رہا۔ اس بارے میں اس نے لکھا تھا کہ ایک نفسیات داں ہونے کی حیثیت سے مجھے اس سے بہتر موقع کی خواہش کبھی نہیں ہوئی، کیونکہ یہیں مجھے میرے خوابوں کی تعبیر ملتی نظر آئی۔

تھارن ڈانک نے تقریباً ۳۰ سال تک اس کالج میں خدمات انجام دیں اور ۱۹۳۹ء میں وہاں سے سبکدوش ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دس سال نفسیات کی خدمات کے لیے وقف کر دیے اور اس مدت میں اُس نے نفسیات کو عروج پر پہنچانے میں اپنی پوری محنت صرف کر دی۔ اُس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ جانوروں کی ذہانت کے بارے میں تجربات کرتے کرتے میں انسانوں کی ذہانت کے بارے میں بھی تجربات کرنے لگا اور اس سلسلہ میں اُس ٹیچرز کالج میں مجھے ایسے بے شمار مواقع ملے، جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور انسانوں میں تعلیم اور آموزش کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

نفسیات میں Connectionism (نظریہ علائق) تھارن ڈانک سے منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے ہی سب سے پہلے اس کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے مقالات نفسیات کے جرنل میں اور دوسرے جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اُس کی ایک کتاب جو اُس کی موت سے چند ماہ پہلے ہی شائع ہوئی Selected Writings For a Connectionist's Psychology تھی جو کافی مقبول ہوئی۔ یہ کتاب نفسیات کے لیے اس کی خدمات کا ایک جائزہ پیش کرتی ہے اور ساتھ ہی نظریہ علائق کے تعلق سے اس نے جو خیالات پیش کیے اُن کا بھی احاطہ کرتی ہے۔

نفسیات میں ایک مکتب فکر ایسوسی اٹوٹ (Associationism) ۱۸ویں صدی میں ہی قائم ہو چکا تھا اور اس طرز فکر کے معماروں میں ہابس، جان لاک اور ہائٹلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن تھارن ڈانک کا کام بھی اس مکتب فکر کی ترقی اور فروغ میں



اہمیت رکھتا ہے۔ حالانکہ اس نے تجرباتی نفسیات میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن جب وہ ٹیچرز کالج میں بحیثیت پروفیسر منتخب کیا گیا تو وہ تعلیمی نفسیات کی جانب بھی متوجہ ہوا اور اس نے تعلیمی نفسیات میں ہی نہیں، بلکہ ذہانت کے موضوع پر بھی کافی کام کیا۔ کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ تھارن ڈانک نظریہ وظیفیت کا قائل تھا اور اس کے مقالات میں اسی مکتب فکر کی وکالت کی گئی ہے۔ لیکن اس نے خود اس بات کی مخالفت کی کہ اس کا نام وظیفیت کے حامیوں میں شامل کر دیا جائے۔ البتہ اس نے نظریہ انتیلا فیت کی تشہیر کی اور اس کے بارے میں کئی مقالات بھی شائع کیے۔ یہ نظریہ ادراک سے متعلق ہے جس کے مطابق بچے کے حسی تجربات منتشر ہوتے ہیں اور بعد میں وہ ان تجربات میں ایک ربط قائم کر کے ان سے اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت ادراک ایک ترکیبی عمل ہے جو حس کی تنظیم سے وجود میں آتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت حس کو اولیت حاصل ہے اور ادراک کو ثانویت۔ تھارن ڈانک نے Connectionism کے تحت اس بات کو واضح کیا ہے۔ اس کا ایک قول نفسیات میں بہت مشہور ہے..... ”اگر کسی چیز (مادی یا غیر مادی) کا وجود ہے تو یہ لازمی ہے کہ وہ کسی مقدار میں موجود ہے اور جب کسی شے کی مقدار کا ذکر آتا ہے تو پھر اس کی پیمائش بھی کی جاسکتی ہے۔“

تھارن ڈانک نے ولیم جیمس کی نفسیات سے بھی کافی استفادہ کیا ہے اور اس کی بعد کی تخلیقات میں ولیم جیمس کے خیالات کی جھلک واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ تھارن ڈانک نے جب پہلی بار Law of Effect پیش کیا تو اس کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس قانون کے تحت اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ.....

”کسی جوابی فعل کی کامیابی کی صورت میں اس کے دہرائے جانے کے

امکانات زیادہ ہوتے ہیں، جبکہ ناکامی کی صورت میں کم.....“

..... اس نے یہ قانون اپنے ان تجربات کی بنیاد پر قائم کیا تھا جو اس نے مختلف جانوروں پر کیے تھے اور اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس سلسلہ میں آموزش پر بھی کچھ اصول وضع کیے جاسکتے ہیں۔ اس نے انسانی آموزش پر بھی کافی تحقیقات کیں اور



بقول اس کے اس سلسلہ میں وہ مستقل دو سال تک مصروف رہا۔ اس نے تعلیمی نفسیات میں بھی کافی اہم کام کئے۔ اس نے بچوں کی سرزنش پر بھی ایک مقالہ لکھا جو اس وقت کافی مقبول ہوا اور اس کو ہر اسکول میں آزمایا گیا۔ اس نے اس مقالہ میں خیال پیش کیا تھا کہ بچوں کو غلطی پر سزا دینے سے ان کی صلاحیت میں کسی بھی اضافہ کی اُمید نہیں کی جاسکتی، چاہے وہ سزا کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔

تھارن ڈانک نے ۱۹۲۷ء میں ذہانت کی پیمائش پر ایک کتاب Measurement of Intelligence کے نام سے شائع کی اور ۱۹۳۲ء میں اسی سلسلہ کی دوسری کتاب جو آموزش سے متعلق تھی The Fundamental of Learning کے نام سے لکھی۔ تھارن ڈانک نے اپنی زندگی میں تقریباً ۸۷ کتابیں شائع کیں۔ اُن میں سب سے اہم Educational Psychology کو تسلیم کیا جاتا ہے اور تعلیمی نفسیات پر اس کتاب کی آج بھی اہمیت ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ تینوں جلدیں ۱۲-۱۹۱۳ء میں شائع ہوئیں۔ تھارن ڈانک نے تین سو سے زیادہ مقالات لکھے جو نفسیات کے مختلف جرنل میں شائع ہوئے اور اُن مقالات کی وجہ سے تھارن ڈانک کو نفسیات کے ماہرین میں شمار کیا جانے لگا۔ اس نے انگریزی کی ایک ڈکشنری بھی مرتب کی جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور آج بھی استعمال کی جاتی ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں تھارن ڈانک کو بہت اہمیت حاصل تھی اور آج بھی وہ نہ صرف اختباری نفسیات میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، بلکہ تعلیمی نفسیات میں بھی اس کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اس عظیم مفکر اور دانشور کا ۱۹۴۹ء میں انتقال ہوا۔

○○



# کارل یونگ

Karl G. Jung (1875-1961)

کارل یونگ کا جب ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی سگمنڈ فروئڈ کا نام بھی ذہن میں آ جاتا ہے، کیونکہ یونگ کو عام طور پر فروئڈ کے شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کارل یونگ فروئڈ سے نہ بھی ملتا تو بھی وہ ایک عظیم مفکر، بلند پایہ فلسفی اور دانشور ہوتا، کیونکہ اس کی اپنی شخصیت ان تمام خصائص کی حامل تھی جو ایک دانشور میں ہونا ضروری ہیں۔

یونگ سوئزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا خاندان تعلیم یافتہ تھا، ساتھ ہی مذہبی امور میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے خاندان میں کئی افراد چرچ سے جڑے ہوئے تھے اور کئی پادری بھی تھے۔ یونگ کے والد نے اس کو لاطینی زبان سیکھنے کے لیے ایک مکتب میں داخل کر دیا جہاں اس کی طبیعت میں قدیم زبانوں کو سیکھنے اور ان کے ادب کے مطالعہ کا رجحان پیدا ہوا۔ غالباً اس کا یہی رجحان جب نمو پایا تو اس نے اپنی عمر کے ایک دور میں مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہ ہندوستان بھی آیا جہاں اس نے سنسکرت زبان سیکھی، تاکہ وہ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں سے استفادہ کر سکے۔

یونگ کو اس مکتب سے نکل کر بیسل میں ہی ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس اسکول میں داخلہ کے بعد اس میں تنہائی پسندی کا رجحان پیدا ہو گیا اور وہ زیادہ



تر اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھتا تھا۔ وہ اپنی تعلیم کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ خاص طور پر وہ تعلیمی مقابلوں سے بہت گھبراتا تھا اور ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے بیماری کا بہانہ کر کے الگ پڑا رہتا۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ بورڈنگ اسکول کی زندگی میں وہ اپنے آپ کو ایک نفسیاتی مریض سمجھنے لگا تھا، کیونکہ جب اس پر تناؤ کی زیادتی ہوتی تو وہ بیہوش ہو جاتا تھا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کر کے وہ پيسل یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس کی دلچسپی علم آثار قدیمہ میں تھی، لیکن اس کے والد اس کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ لہذا اپنے والد کی خوشی کے لیے اس نے ڈاکٹری کا پیشہ اپنایا۔ یونیورسٹی میں اس کو مشہور Neurologist ڈاکٹر Krafft. Ebing کا ساتھ ملا اور ان کے مشورہ سے یونگ نے Psychiatry شعبہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے زیورک میں ہی ایک دماغی امراض کے اسپتال میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسپتال میں ڈاکٹر بلائکر کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر بلائکر بذات خود ایک مشہور اور نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر تھے۔ اُن کا نام آج بھی مشہور ہے کیونکہ انہوں نے ہی اسکیزوفرینیا کی بیماری کی پہچان کی اور اس کو یہ نام بھی انہوں نے ہی دیا۔ ان حالات میں یونگ کی شخصیت میں نکھار آیا اور وہ اپنے شعبہ میں کافی دلچسپی لینے لگا۔ کچھ عرصہ بعد اس کو اپنا ذاتی دواخانہ کھولنے کی اجازت بھی مل گئی، ساتھ ہی وہ یونیورسٹی میں لیکچر بھی دینے لگا۔

کارل یونگ کی شخصیت کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ خود بعض نفسیاتی الجھاؤ کا شکار تھا۔ وہ بچپن سے ہی اپنے خوابوں کے بارے میں کافی پریشان رہتا تھا کیونکہ خوابوں میں عجیب و غریب حالات دیکھتا تھا۔ وہ جب اپنے گھر والوں سے اپنے خواب بیان کرتا تو وہ بھی پریشان ہو جاتے تھے، کیونکہ اس کے خوابوں میں اکثر مذہبی رہنماؤں اور مقدس مقامات کی بے حرمتی کا اشارہ ملتا تھا۔ اس قسم کے خوابی مواد سے خود یونگ بھی خوفزدہ ہو جاتا تھا، کیونکہ وہ کبھی کبھی خواب میں ایک ایسے معبود کو دیکھتا تھا جس کی شبیہ ایک بڑے مردانہ عضو سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس قسم کے



خوابوں کی وجہ سے اس میں ان کی حقیقت جان لینے کی ایک تڑپ پیدا کر دی۔ اس سلسلہ میں اگر اس کا موازنہ فرائڈ سے کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یونگ فرائڈ سے زیادہ اپنے خوابوں کی حقیقت جاننے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے خوابوں کا ریکارڈ رکھتا تھا، بلکہ وہ اپنے دوستوں اور اپنے مریضوں کے خواب بھی بہت دلچسپی سے سنتا تھا۔ وہ اپنے مریضوں سے کہتا تھا کہ اگر انہوں نے کوئی عجیب سا خواب دیکھا ہو تو وہ بیان کریں۔

خوابوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی پیاس ہی فرائڈ سے اس کی ملاقات کا سبب بنی۔ اس وقت تک فرائڈ کے نظریات کے بارے میں بحث شروع ہو چکی تھی، لیکن فرائڈ کے نظریات سے زیادہ وہ اس کی پہلی کتاب Interpretation of Dreams سے زیادہ متاثر ہوا اور اس نے فرائڈ سے ملاقات کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ۷ سال تک وہ فرائڈ سے ملنے کے منصوبہ پر عمل نہیں کر سکا۔ ان سات سالوں میں فرائڈ کو کافی شہرت مل چکی تھی اور اس کی تحلیل نفسی کی تحریک زور پکڑنے لگی تھی۔ فرائڈ ویانا میں اپنے گھر ہر بدھ کے دن اُن لوگوں سے ملاقات کرتا تھا جو اس تحریک کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یونگ نے ۱۹۰۷ء میں ویانا آکر ایسی ہی ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ فرائڈ یونگ سے مل کر اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے اپنے پورے دن کی مصروفیات رد کر دیں اور یونگ کے ساتھ مسلسل ۱۳ گھنٹے تک بات چیت کرتا رہا۔ دو فلسفیوں کی آپس میں گفتگو سے یونگ سے زیادہ فرائڈ متاثر ہوا اور اس نے سوچا کہ یونگ میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جو اس کے نظریات اور اصولوں کی روشنی میں فرائڈ کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہیں۔

۱۹۰۹ء میں فرائڈ کو امریکہ کی کلارک یونیورسٹی میں لیکچر دینے کی دعوت آئی تو وہ یونگ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں اس نے یونگ کو اپنے جانشین کی حیثیت سے متعارف کرایا اور یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد کلارک یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے



اکیلے یونگ کو ہی دعوت دی جانے لگی۔ اس سال جب وینا میں فرائڈ نے International Psychoanalytic Association کی بنیاد ڈالی تو کارل یونگ کو اس کا پہلا صدر نامزد کیا۔ اس وقت وینا میں یہودیوں کی آبادی کا غلبہ تھا اور ان لوگوں کو فرائڈ کی یہ بات ناگوار گزری کہ اس نے اس ایسوسی ایشن کا پہلا صدر ایسے شخص کو بنایا جو یہودی نہیں تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں فرائڈ کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ یہودیوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تعصب کے رجحان سے یہ ایسوسی ایشن محفوظ رہے اور اس نے مقامی لوگوں کو اس سلسلہ میں راضی کر لیا۔

جیسا کہ یہ عام خیال ہے کہ فرائڈ بہت ضدی تھا اور تحکمانہ مزاج رکھتا تھا، وہ ہر شخص پر اپنے خیالات کو حاوی کرنے کا عادی تھا اور تنقید سے تو اس کی ہجانی کیفیت کچھ عجیب سی ہو جاتی تھی۔ فرائڈ کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ یونگ ایسوسی ایشن کے انتظام میں اس کی توقعات کو پورا نہیں کر رہا۔ اس کے ساتھ ہی فرائڈ نے یہ بھی محسوس کیا کہ یونگ اس کے نظریات کو سو فیصدی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس نے لبیڈو کے مفہوم کو بھی بدل دیا اور کلارک یونیورسٹی کے ایک لیکچرر میں اس نے فرائڈ کے نظریہ جنس کی بھی مخالفت کی تو فرائڈ یہ برداشت نہ کر سکا اور ۱۹۱۳ء میں یونگ کو ایک خط لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ اس کے ذاتی تعلقات اب ختم ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد دونوں کے رشتے ٹوٹ گئے اور خط و کتابت بھی بند ہو گئی۔ اس کے بعد یونگ نے کبھی فرائڈ سے ملاقات نہیں کی اور اپنا الگ مکتب فکر قائم کیا جس کو وہ Analytical Psychology کہتا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ کارل یونگ اپنے خوابوں کے عجیب و غریب مواد سے خود پریشان رہتا تھا اور وہ ان خوابوں کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک خطرناک سیلاب نے پورے یورپ میں تباہی مچا دی ہے اور اس کے اپنے وطن کے پہاڑ اس سیلاب میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس سیلاب کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نے ہزاروں لوگوں کو مرتے



ہوئے دیکھا تھا، اور پھر اس قسم کے خواب ہفتوں تک اس کی نیند حرام کرتے رہے، کیونکہ وہ ہر بار خون کی ندیاں بہتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اس قسم کے خوابوں نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔

اسی سال اگست میں پہلی جنگ عظیم کی ابتداء ہو گئی اور پھر جو اس نے دیکھا اور سنا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی اس کی اپنی ذات اور پوری انسانیت میں کوئی رابطہ ہے، کوئی واسطہ ہے جس کی توضیح نہیں کی جاسکتی تھی؟ اور یونگ خود اعتراف کرتا ہے کہ اس دن سے ۱۹۲۸ء تک وہ اپنی ذات کی تلاش میں بھٹکتا رہا اور تقریباً ۱۵ سال تک اپنی ذات کی گہرائی میں ڈوب ڈوب کر نکلتا رہا اور اس کی یہ کوشش آگے چل کر اس کے کئی نظریات کی بنیاد بنی۔

یونگ کے نظریات اور فلسفہ کے بارے میں ہال اور لنڈزی C.S. Hall and

Lindzey نے اپنی کتاب Theories of personalities میں لکھا تھا.....  
 ”یونگ کے نظریہ کے مطابق مکمل ذات یا نفس مختلف لیکن ہم عمل عناصر پر مشتمل ہوتی ہے جو ایک باہمی نظام کے تحت مل کر ذات کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ عناصر یا اصول ہیں..... انا (Ego)، ذاتی لاشعور (personal Unconscious) اور اس کے الجھاؤ، اجتماعی لاشعور (Collective Unconscious) اور اس کے آثارِ اولیٰ، شخصیت ظاہری (persona)، روح حیوانی (Anima/ Animus) اور ہمزاد (Shadow)۔ یہ تمام عوامل ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں، جس کے ساتھ ہی فرد کا طرزِ فکر، مشاہدہ باطن اور بیرون بینی کا میاں طبع، فکر، احساس، حسیّت اور بصیرت باہمی اشتراک سے ایک ذات (Self) تشکیل پاتی ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہے۔

فرانڈ نے شخصیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا یعنی اڈ، انا اور فوق الانا۔ اسی طرح یونگ نے بھی اس کو تین حصوں میں ہی بانٹا ہے لیکن ان کے نام بدل دیے ہیں۔ پہلے حصہ کو وہ اِگو (Ego) کہتا ہے (اس کا مفہوم اس کی نظر میں وہی ہے جو شعور کا ہو سکتا ہے)، دوسرے حصہ کا نام اُس نے ذاتی لاشعور (یا شخصی لاشعور یعنی Personal



(unconscious) رکھا۔ اس سے اس کا مطلب ذہن کے اس مواد سے تھا، جس کا فرد کو (اس وقت) شعور نہ ہو لیکن جو مستقبل میں ضرورت پڑنے پر شعور میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ مفہوم فرائڈ کے مفروضہ تحت الشعور کے مطابق ہی ہے اور یونگ نے اس کا نام بدل کر ذاتی لاشعور رکھ دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ فرد کے ان تجربات کے ساتھ ساتھ ان خیالات کو بھی شامل کرتا تھا جو کسی سبب ذاتی لاشعور میں دھکیل دیے گئے ہوں، یعنی Supress کر دئے گئے ہوں۔ لیکن ان میں فرد کی جبلی خصوصیات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یونگ کے نظریہ ذات کا جو سب سے اہم حصہ تھا اُسے یونگ نے اجتماعی لاشعور (Collective Unconscious) کا نام دیا۔ اس سے اس کا مطلب اس لاشعوری مواد سے تھا جو فرد پیدائش کے وقت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور اس میں وہ خصوصیات، تجربات اور احساسات شامل ہوتے ہیں جو فرد کو اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اجتماعی لاشعور انسان کے ذاتی تجربات اور واقعات سے بالکل لاتعلق ہوتا ہے، اس لیے اس کا مواد شعور میں نہیں آتا۔ لیکن ہمارے ہر تجربہ پر، ہر کردار پر اور ہر رویہ پر اس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں اور فرد کو اس مواد کی معلومات دوسرے افراد کے کردار اور رویوں سے ہوتی ہے۔ اجتماعی لاشعور عالمگیر ہوتا ہے اور تمام انسانوں میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے ذہن میں ذاتی لاشعور کا جو خطہ ہوتا ہے، اس کے پرے اجتماعی لاشعور کا خطہ آجاتا ہے جس میں بہت گہرائی ہے اور بہت اندھیرا ہے اور وہاں کسی شے کا تلاش کرنا اور پالینا ناممکن ہے۔

اپنے اس نظریہ کی دلیل میں یونگ نے کہا تھا کہ پہلی ہی نظر میں کسی کی جانب ایک کشش محسوس کرنا یا کسی اجنبی جگہ جا کر یہ محسوس کرنا کہ ہم یہاں پہلے بھی آچکے ہیں، یا بعض ایسی نشانیوں کو پہچان لینا جو ماضی بعید سے تعلق رکھتی ہوں، یہ ایسی خصوصیات ہیں جو افراد کو ان کے مشترک آبا و اجداد اور مشترک تہذیب کے ذریعہ ان کے لاشعور میں آگئی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہزاروں سال پہلے جب دُنیا کے مختلف خطوں میں



کوئی آمد و رفت یا رسل و رسائل کے ذرائع نہیں تھے اور مختلف تہذیبوں میں آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا، اس وقت بھی دُنیا کے مختلف علاقوں کی تہذیب و تمدن میں یکسانیت پائی جاتی تھی اور وہی نقوش آج بھی نمایاں ہیں۔

یونگ نے اپنے اسی نظریہ کو بنیاد بنا کر Archetype کا تصور پیش کیا (اس کے لئے راقم الحروف نے آثارِ اولیٰ کی اصطلاح استعمال کی ہے)۔ یہ اجتماعی لاشعور کے اجزاء ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ آثارِ اولیٰ کی وجہ سے ہی انسان ایک خاص انداز میں ادراک کی صلاحیت رکھتا ہے، خاص انداز میں سوچتا ہے اور خاص انداز میں ہی عمل کرتا ہے اور ان سب کا دار و مدار ہمارے قدماء کے تجربات پر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آثارِ اولیٰ ایک کائناتی مظہر ہے کیونکہ اس کے تجربات بھی کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس وسیع و عریض دُنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے افراد کا فنون لطیفہ کی جانب ایک جیسا رجحان، دُنیا کے تمام مذاہب کے عارفانہ اور پُر اسرار عناصر کا ایک ہی ساتھ مختلف مقامات پر ظہور ہونا اور جن بھوت اور پریوں کے بارے میں دُنیا بھر میں ایک ہی خیال ہونا اس نظریہ کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ یونگ نے ایک عجیب سی مثال بھی دی ہے جس کا آجکل دُنیا میں چرچا ہے کہ انسان کو اپنی موت سے قبل کچھ اشارے ملنے لگتے ہیں اور یہ اشارے دُنیا کے مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے اور الگ الگ تہذیب و تمدن میں پرورش پانے والے، سب کے لیے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو لوگ موت کے قریب ہوتے ہیں وہ ایک جیسے خواب دیکھتے ہیں، وہ خوابوں میں اپنے گزرے ہوئے رشتہ داروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ انہیں بلا رہے ہیں، یا وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ ایک اندھیری سرنگ میں جا رہے ہیں اور پریشان حال ہیں کہ ان کو سرنگ کے دوسرے کنارے پر ایک روشنی نظر آتی ہے۔ وہ مرحوم رشتہ داروں کو اسی لباس میں دیکھتے ہیں جس لباس میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ پوری دُنیا میں پیدائش، موت، ماں، باپ، بچہ اور خالق مطلق کے لئے یکساں تصورات پائے جاتے ہیں۔



جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اجتماعی لاشعور کے اجزاء آثارِ اولیٰ کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں اور اس کے خیال میں آثارِ اولیٰ کی بہت سی اقسام طے کی جاسکتی ہیں اور ان کا تعین انسان اپنی ضرورت اور اپنے تجربہ کی بنیاد پر کر سکتا ہے۔ ایک Archetype ایسی خصوصیت ہے جس کے بارے میں ہمیں زیادہ علم نہیں، لیکن پھر بھی اس کی وجہ سے ہم مختلف اشیا کا تجربہ ان کی مخصوص حالت میں کرتے ہیں۔ اس کی کوئی طے شدہ شکل بھی نہیں ہے لیکن اس کا عمل منظم اصول کے تحت ہوتا ہے۔ فرائڈ کے ہاں اسی خیال سے ملتی ہوئی خصوصیت جبلت کہلاتی ہے۔ اس نے جن Archetype کا ذکر کیا ہے، ان میں سے کچھ خاص مندرجہ ذیل ہیں.....

**Mother Archetype:** - اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ ماں کے بارے میں دُنیا بھر میں ایک ہی تصور پایا جاتا ہے۔ یہ تصور انسانوں میں ہی نہیں بلکہ حیوانات میں انسان سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک ایسی ہستی جو اپنے بچہ کے لیے ضروری ہے۔ ہم بغیر مادرانہ احساس کے ایک بچہ کی پرورش کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یونگ کا کہنا تھا کہ ہم دُنیا میں آئے تو ماں کی ضرورت کو ساتھ لائے اور ساتھ ہی لائے اس سے رشتہ کا ایک احساس، جس کی وجہ سے ہم اسے ماں کہتے ہیں۔ ایک بچہ اس وقت بھی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے جب اس کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ اس ہستی کے جسم کا ایک حصہ ہے اور اس کی وجہ سے ہی اسے یہ زندگی ملی ہے۔

اس کے بعد وہ Mana کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے اس کا مطلب اس پر اسرار توانائی سے تھا جو ہر شے میں موجود ہوتی ہے اور ہزاروں سال سے اس کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ یونگ کے کچھ ہم عصر مفکرین کا خیال تھا کہ یونگ کے لیے منا کا تصور وہی ہے جو ہندو مذہب میں شیولنگ کا ہے۔ وہ اس کو روحانی طاقت تصور کرتا ہے کیونکہ اس نے قدیم زبانوں کا مطالعہ کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ کسی زمانے میں ایک ایسی ہی شے کی پرستش کی جاتی تھی جو مردانہ عضو سے مماثلت رکھتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں اس شے کا تعلق قطعی طور پر جنس سے نہیں تھا بلکہ اس کو خالق مطلق کی حیثیت دی جاتی تھی اور اس کو



زندگی دینے والا تصور کیا جاتا تھا۔ اس شے کی پرستش خاص موقعوں پر خاص مقاصد کے لیے کی جاتی تھی۔ جیسے اچھی فصل کے لئے، مچھلیوں کی اچھی پیداوار کے لئے، اگر علاقہ پر کوئی آفت آگئی ہے تو اس سے حفاظت کے لئے یا کسی لاعلاج مرض سے چھٹکارا پانے کے لئے۔ اس شے کی پرستش انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ہی کی جاتی تھی۔

ایک اور Archetype کا ذکر کرتا ہے اور اس کو وہ Persona کہتا ہے، جسے ہم اردو میں ظاہری شخصیت کہہ سکتے ہیں۔ Persona کے معنی ایک نقاب سے لیے جاتے ہیں جو کسی ڈرامہ کے مختلف کردار استعمال کرتے ہیں۔ اس سے اس کا مطلب فرد کی شخصیت کے اُس پہلو سے تھا جو معاشرہ میں اس کی پہچان بن جاتا ہے اور لوگ اس کو اس کی کچھ مخصوص خصوصیات کی وجہ سے جانتے ہیں۔ یعنی کوئی فرد حقیقت میں کچھ بھی ہو، لیکن معاشرہ میں وہ جو نقاب پہنے ہوئے ہے، وہی اس کی پہچان ہے اور وہی چہرہ جو لگائے ہوئے ہے، اس کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔

اسی سلسلہ کا ایک اور نظریہ اہمیت رکھتا ہے جس کو وہ Anima کہتا ہے۔ اس کو یہ نظریہ اس کے خوابوں سے ملا۔ وہ اکثر خوابوں میں ایک ایسی بزرگ ہستی کو دیکھا کرتا تھا جن کے بارے میں اس کے ذہن میں عقیدت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ان کو ایک بزرگ، ایک مقدس ہستی اور دانشور کا نام دیتا تھا۔ یونگ اس ہستی کے ساتھ اکثر ایک چھوٹی سی لڑکی کو بھی دیکھتا تھا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ اس مظہر سے اس نے Anima کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کے تحت اس کا خیال تھا کہ ہر مرد کے ساتھ ایک مونث روح ہوتی ہے جس کو وہ Anima کہتا ہے اور ہر عورت کے ساتھ ایک مذکر روح ہوتی ہے اور اس کو اس نے Animus کا نام دیا۔ وہ کہتا ہے کہ ان دونوں قسم کی روحوں کی وجہ سے مرد اور عورت میں ایک ابدی کشش پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہی دونوں متضاد توانائیاں اجتماعی لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ یونگ اس نظریہ کو اس حقیقت سے جوڑ کر دیکھتا ہے کہ کچھ مردوں میں عورتوں کی طرح لباس پہنے اور ان کی طرح میک اپ کرنے کا رجحان ہوتا ہے۔ دوسری طرف کچھ عورتیں مردانہ کپڑے پہن کر خوش ہوتی



ہیں۔ وہ سگریٹ پیتی ہیں، گھوڑے سواری کرتی ہیں، بالوں کو مردانہ طرز پر رکھتی ہیں۔ ان میں مذکر روح زیادہ توانا ہوتی ہے۔ یونگ کے ایک ہم عصر ماہر نفسیات نے یونگ کے اس نظریہ کی حمایت میں یہ لکھا تھا کہ کچھ لوگ اپنی مخالف جنس کی طرح کھلے عام رہتے ہیں جب کہ تحلیل نفسی کے دوران یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بہت سے مرد خلوت میں عورتوں کی طرح لباس پہن کر اور زنانہ میک اپ کر کے اپنی اس اندرونی خواہش کی تسکین کر لیتے ہیں۔

ایک اور Archetype کو وہ Shadow کہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ماضی کا سایہ ہمیشہ فرد کے ساتھ رہتا ہے اور یہ سایہ کبھی کبھی اس کو حیوانیت کے دروازہ پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے جہاں وہ ضابطہ اخلاق کو فراموش کر کے جو کردار ادا کرتا ہے، وہ جانوروں کی طرح عمل کرنے سے وجود میں آتا ہے اور ایسے کردار کو نہ ہم اچھا کہہ سکتے ہیں نہ بُرا۔ یونگ کا خیال تھا کہ چونکہ حیوانیت کا احساس بذات خود ایک غیر انسانی احساس ہے، اس لیے حیوانیت کا یہ سایہ ہماری ذات کا ایک تاریک پہلو ہے۔

یونگ کے Archetype نظریہ کے تحت سب سے اہم جز ہے جس کو وہ Self کہتا ہے۔ یونگ کے ہاں ذات کا تصور کچھ مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری ذات میں ہی ہماری تخلیق کا راز پوشیدہ ہے اور یہ ذات ہی ہے جو دنیا کی مختلف توانائیوں کا مرکز ہے۔ اس کے خیال میں ذات کی گہرائیوں میں جا کر ہی اس مرکز تک پہنچنا ممکن ہے اور جس نے اس گہرائی میں جا کر ذات کی حقیقت کو پہچان لیا، وہ عرفانیت کی بلندی کو پہنچ گیا۔ یونگ نے ایک نقش تیار کیا تھا جس کو وہ منڈالا Mandala کہتا تھا۔ یہ ڈرائنگ کچھ جیومیٹری کی اشکال اور کچھ پیچیدہ سی شکلوں پر مشتمل تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نقش کے درمیان میں ایک مرکز تھا۔ انسان جب مراقبہ کے دوران اس منڈالا نقش کو سامنے رکھ کر دھیان لگائے تو یہ ڈرائنگ اس کی توجہ کو اس کے مرکز پر مرکوز رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

یونگ کے نظریات کے بارے میں اس کے معاصرین کا خیال تھا کہ اگر تجرباتی



نفسیات کے تحت ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نظریات سائنٹفک نہیں کہے جا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نظریات علمی نفسیات کا ایک حصہ نہیں بن سکے اور ان کا ذکر آج بھی کارل یونگ کے تذکرہ کے تحت کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کی یہ بات صحیح ہو، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کارل یونگ کی خدمات نفسیات میں آج بھی اتنی ہی اہم تسلیم کی جاتی ہیں، جتنی ابتدائی دور میں ان کو اہمیت تھی۔ کارل یونگ فرائڈ کی موت کے بعد ۲۲ سال تک زندہ رہا اور حالانکہ اس نے اپنا الگ مکتب فکر قائم کر لیا تھا لیکن فرائڈ کی مخالفت میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ اس کے معاصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کے ہاں مذہبی رجحانات تو ملتے ہیں لیکن وہ خود عیسائیت سے کلی طور پر متاثر نہیں تھا۔ اس کی نظر میں دو ہستیاں ایسی تھیں جو عرفانیت کی بلندیوں تک پہنچ چکی تھیں، ایک حضرت عیسیٰ اور دوسرے مہاتما بدھ۔ یونگ کو ان دونوں مذہبی رہنماؤں سے بہت عقیدت تھی اور ان کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ دونوں ہی اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کی حقیقت کو پہچان گئے تھے۔

اس نے بار بار اپنے لکچر میں ہندو ازم کا بھی ذکر کیا۔ اس کے خیال میں ہندو ازم میں ذات کا تصور ایسا ہے جیسے کسی بحرِ اعظم میں چھوٹے چھوٹے جزائر۔ ان جزیروں کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ سب الگ الگ اکائیاں ہیں، غلط ہے۔ ہمیں یہ بھی خیال میں رکھنا چاہیے کہ ان سب کے نیچے ایک ہی سمندر ہے جو سب کی اصل کو ملائے ہوئے ہے۔ یونگ کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندو ازم سے اثرات قبول کئے تھے۔ وہ ہندوستان آیا تھا، لیکن وہ کہاں رہا اور یہاں اس نے کتنا عرصہ گزارا، اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اس نے سنسکرت سیکھی اور ہندو ازم اور بدھ ازم کا مطالعہ کیا۔ اس نے بیرونی دنیا کو مایا (Maya) کہا ہے اور اس لفظ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مایا خدا کا ایک خواب ہے یا ایک التباس کی شکل ہے۔ روح کے بارے میں اس کا فلسفہ ہندو ازم سے متاثر تھا۔ اس نے انفرادی روح کے لیے Jivatman کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس نے Atman کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اس کا مفہوم بیان کیا



ہے کہ یہ خالق مطلق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم سب اس کا ایک حصہ ہیں، ہم اس کی قدرت کے ذرات کی حیثیت رکھتے ہیں جو اپنی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے الگ تصور کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی بھی اپنی اصل سے الگ نہیں ہوتے۔ موت کے بعد جب آنکھ کھلتی ہے تو حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہم کون تھے اور ہماری اصل کیا تھی۔ یعنی وہی جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔ اسی طرح مراقبہ کے بارے میں اس کا نظریہ ہندو ازم سے متاثر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم اپنے ارد گرد کی دنیا کو بھول کر اپنی توجہ ایک مرکز پر کر دیتے ہیں تو اپنے لاشعور میں سکڑ جاتے ہیں اور اس طرح ہم اپنی ذات سے قریب تر ہو جاتے ہیں، اور اگر گہرائی میں جائیں تو اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں ہمارا لاشعور اجتماعی لاشعور Collective Unconscious کا ایک حصہ بن کر دوسرے افراد کے ذاتی لاشعور کے ساتھ رابطہ قائم کر سکتا ہے اور ان سے مکالمہ کر سکتا ہے۔

〇〇



# الفریڈ ایڈلر

ALFRED ADLER ( 1870-1937 )

ایک زمانہ ایسا تھا جب سگمنڈ فرائڈ کو ہر کوئی نے مخالفت اور تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور اس کے ناقدین میں مشہور دانشور بھی شامل تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت اس کو کچھ ایسے ساتھی بھی ملے جن کی وجہ سے اس کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کے بعد بھی تحلیل نفسی کی تحریک ختم نہیں ہوگی اور اس کی ترقی اور ترویج کی کوششیں جاری رہیں گی۔ اس کا یہ خیال اس لیے تھا کیونکہ اس کو یونگ اور ایڈلر جیسے ساتھی مل گئے تھے جو اپنے اپنے شعبوں میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ ابتداء میں ان دونوں کو اپنے بازو کہا کرتا تھا۔ لیکن اس کی بد قسمتی کہ یہ دونوں اس کو جلد ہی چھوڑ گئے اور دونوں نے اپنا اپنا الگ مکتب فکر قائم کر لیا۔ الفریڈ ایڈلر بذات خود ایک ماہر ڈاکٹر تھا، جس نے نفسیاتی امراض کے علاج میں مہارت حاصل کر لی تھی اور اس کی شہرت کی وجہ تھی کہ خود فرائڈ نے اس کو اپنے گھر ہونے والی بدھ کی نشست میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

الفریڈ ایڈلر ویانا کے مضافات میں ۷ فروری ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کی تیسری اولاد تھی۔ اس کا باپ یہودی نژاد تھا جو اپنے شہر میں اتاج کی تجارت کرتا تھا اور کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ الفریڈ کوئی چار سال کا تھا کہ وہ سوکھے کی بیماری کا شکار ہو گیا۔ علاج کے بعد وہ ٹھیک تو ہو گیا لیکن اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کا باپ ہمیشہ پریشان رہتا تھا اور اس کی پریشانی حق بجانب بھی تھی، کیونکہ اگلے ہی سال الفریڈ پر نمونیا



کا حملہ ہوا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ اس کی زندگی کی اُمید ہی ختم ہو گئی۔ مقامی ڈاکٹروں کے علاج سے وہ بچ تو گیا لیکن اس کی کمزوری باقی رہی اور بار بار اس کو ڈاکٹروں کے ہاں جانا پڑتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی ایک ڈاکٹر بنے گا۔ عہدِ طفلی کا خواب کم ہی پورا ہوتا ہے لیکن الفریڈ نے اپنے اس خواب کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کو ایک مقامی اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں اس کا بڑا بھائی سگمنڈ بھی پڑھتا تھا۔ الفریڈ جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود میدانی کھیلوں میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا، لیکن تعلیمی طور پر وہ ایک اوسط درجہ کا طالب علم ہی مانا جاتا تھا۔

مقامی اسکول سے فارغ ہو کر اس نے ویانا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور اپنی خواہش کے مطابق اس نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹری کی ڈگری ۱۸۹۵ء میں حاصل کی۔ جب وہ کالج میں تھا تو وہاں وہ ایک سوشلسٹ گروپ میں شامل ہو گیا تھا جو معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اسی گروپ کی ایک ممبر Raissa نام کی ایک لڑکی سے اس کی دوستی ہو گئی۔ یہ لڑکی روس کی رہنے والی تھی اور سوشلسٹ کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ یہ دوستی رشتہ ازدواج میں تبدیل ہو گئی اور دونوں نے ۱۸۹۷ء میں شادی کر لی۔ ان کے چار بیٹے ہوئے جن میں سے دو نے اپنے والدین کا پیشہ اختیار کیا اور نفسیاتی امراض کے ڈاکٹر بنے، باقی دو کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔

الفریڈ نے اپنا دواخانہ اپنے ہی علاقہ میں قائم کیا جہاں غریبوں کی تعداد زیادہ تھی اور عام طور پر سب محنت کش طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو سرکس میں کرتب دکھاتے تھے۔ الفریڈ ایڈلر اپنے مریضوں کے حالات میں دلچسپی لیتا تھا اور ان سے مرض کے تعلق سے ہی نہیں بلکہ ان کے خیالات اور طرزِ زندگی کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی دلچسپی نفسیات کی جانب رخ کر گئی اور اس نے نفسیات کا تفصیل سے مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کے کچھ نظریات جیسے Organ Inferiority اور Compensation ان ہی دنوں کی محنت کا نتیجہ تھے۔



الفریڈ ایڈلر نے نفسیاتی امراض میں مہارت حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا اور اسی مقصد نے ایک بار پھر یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور Psychiatry کے شعبہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے نفسیاتی امراض میں مبتلا مریضوں کے علاج کے لیے ایک دواخانہ قائم کیا۔ جلد ہی اس کی شہرت ہو گئی اور وہ وینا میں نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ غالباً اس کی شہرت سن کر ہی فرائڈ نے اس کو دعوت دی کہ وہ اس کی رہائش پر ہر بدھ کو ہونے والی نشست میں حصہ لے۔ الفریڈ نے فرائڈ کی دعوت کو قبول کر لیا اور ایک دو نشستوں میں حصہ لینے کے بعد اس نے بھی اپنے آپ کو تحلیل نفسی کی تحریک سے جوڑ دیا۔ الفریڈ نے فرائڈ کی مینٹنگ میں پہلی بار ۱۹۰۷ء میں شرکت کی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرائڈ کے ہر جگہ چہ چہ تھے اور کہنا چاہئے کہ یہ فرائڈ کے عروج کا زمانہ تھا۔ ایک طرف اس کی مخالفت ہو رہی تھی تو دوسری طرف تحلیل نفسی کو آزما کر اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے تھے، کیونکہ یہ ایسا طریقہ علاج تھا کہ اس میں دوا کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن فرائڈ کے دوسرے نظریات کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اور اس کے معاصرین اس سلسلہ میں آگے آگے تھے۔ ایسے حالات میں فرائڈ کو دوا ایسے ہموائل گئے کہ وہ تحلیل نفسی کے مستقبل سے مطمئن ہو گیا۔ ان میں ایک یونگ تھا اور دوسرا الفریڈ ایڈلر جو وینا میں ہی رہتا تھا اور وہیں اس کی ڈسپنسری تھی۔ اس لئے وہ فرائڈ کے زیادہ قریب ہو گیا۔ فرائڈ نے اس کو Veinnese Psychoanalytic Society کا صدر مقرر کر دیا، ساتھ ہی اس نے تحلیل نفسی سے متعلق اپنے جرنل Zentralblatt کا معاون ایڈیٹر بھی بنا دیا۔

الفریڈ خوش تھا کہ اس کو نفسیاتی امراض کے علاج اور تشخیص میں اس طرح بہت مدد ملے گی۔ لیکن اس نے اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھا اور نفسیات پر آزادانہ طور پر بھی کام کیا۔ اس نے کئی مقالات لکھے جو مقبول بھی ہوئے۔ اس نے انفرادی نفسیات کا ایک خاکہ پیش کیا۔ یہی وہ بات تھی جو فرائڈ کو ناگوار گزری، کیونکہ فرائڈ اپنے مزاج سے



بہت خود پرست انسان تھا اور دُوروں کو اپنے مقابل اُبھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایڈلر کے اس نظریہ سے وہ متفق نہیں تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ ایڈلر سے اس موضوع پر تبادلہ خیالات کرتا اور اس بارے میں مزید تحقیقات کرتا، لیکن اس نے اپنے دل میں ایڈلر کے خلاف ایک جذبہ پیدا کر لیا۔ ایڈلر نے جب ایک اور مقالہ Agressive Instincts لکھا تو فرائڈ کو اس میں بغاوت کی بو آنے لگی، کیونکہ اس مقالے میں کئی باتیں ایسی تھیں جو فرائڈ کے مفروضات کی نفی کرتی تھیں۔ خاص طور پر اس نے اس مقالے میں عہدِ طفلی میں جنسی تحریک سے متعلق فرائڈ کے نظریہ کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس مقالہ سے دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور ایک خلیج ایسی حائل ہوئی جو دن بہ دن وسیع ہوتی گئی اور ایڈلر کو یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ فرائڈ کے ساتھ رہ کر اپنی انفرادیت کھودے گا۔ اُدھر فرائڈ سوچنے لگا کہ جب اس کا ساتھی ہی اس کے مفروضات کی مخالفت کرے گا تو اس کے مخالفین کو اور تقویت پہنچے گی۔

فرائڈ اور ایڈلر میں اختلاف کی خبریں ان لوگوں تک پہنچ گئیں جو دونوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ ایسے مشترک دوستوں نے مشورہ دیا کہ دونوں کو مل بیٹھ کر اپنی بات صاف کر لینا چاہئے۔ اس مشورہ کو مانتے ہوئے فرائڈ نے ایک نشست کا اہتمام کیا جس میں وہ الفریڈ ایڈلر پر الزام تراشی کرنا چاہتا تھا اور اس طرح اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا۔ لیکن چونکہ الفریڈ بھی مقامی شخص تھا اور ساتھ ہی وہ بھی یہودی تھا، اس لیے اس کے بھی کچھ حامی پیدا ہو گئے تھے۔ اس نشست میں گرما گرم بحث ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الفریڈ نے اپنے آپ کو فرائڈ سے الگ کر لیا۔ اس کے ساتھ اس کے کچھ حامی، جن کی تعداد ۹ بتائی جاتی ہے، وہ بھی فرائڈ سے الگ ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۱ء کا ہے۔

فرائڈ کی سوسائٹی سے جب ایڈلر نے استعفیٰ دے دیا تو فرائڈ خوش ہوا اور اس نے ایک خط کارل یونگ کو لکھ کر اس کی خبر کی۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا.....

”مجھے خوشی ہے کہ ایڈلر نے خود ہی تحلیل نفسی کی تحریک سے اپنے آپ کو



الگ کر لیا ہے اور سوسائٹی سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جلد ہی مجھے ایڈلر سے چھکارا مل گیا۔ اس کے تحریک چھوڑنے کے فیصلہ سے مجھے کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوگا، بلکہ اس کی پیرانوی شخصیت سے اس تحریک کو فائدہ کے بجائے نقصان زیادہ ہوتا۔ پیرانوی شخصیت ہونے کی وجہ سے بعض معاملات میں وہ اپنے لیے صحیح ہو سکتا ہے، لیکن میرے لیے ہر معاملہ میں غلط ہی ہے۔“

تقریباً اسی مضمون سے مماثلت رکھنے والا ایک خط ایڈلر نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ.....

”تحلیل نفسی کے مکتب فکر سے میں پوری طرح متفق ہوں۔ لیکن فرائڈ کی جابرانہ شخصیت کی وجہ سے اس کے ساتھ کام کرنے سے مجھے فائدے سے زیادہ نقصان ہی ہوتا۔ میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے اور آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ان بندشوں سے آزاد ہونا چاہتا تھا..... اور میں نے وہی کیا۔“

یہ حقیقت ہے کہ اگر الفریڈ ایڈلر فرائڈ کے ساتھ رہتا تو اس کی شخصیت دبی دبی رہتی اور اس کو آزادی کے ساتھ نہ سوچنے کی اجازت ہوتی اور نہ ہی اپنے خیالات کے اظہار کے مناسب مواقع ملتے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ الفریڈ ایڈلر کے سنہرے دن اسی لمحہ شروع ہو گئے تھے جب اس نے فرائڈ سے کنارہ کشی اختیار کی، تھی کیونکہ اس کا یہ قدم اس کا اپنا مکتب فکر قائم کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔

چونکہ الفریڈ میں خدمت خلق کا ایک جذبہ تھا، اس لیے جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس نے آسٹریا کی فوج میں معالج کی خدمات پیش کیں۔ پہلے وہ روسی محاذ پر تعینات تھا، پھر فوجیوں کے بچوں کے لیے قائم کیے گئے ایک اسپتال میں اپنی خدمات دیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ اس اسپتال میں کام کر کے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنے آپ کو تاحیات اس اسپتال کے لئے وقف کر دیا۔ جنگ کے حالات دیکھ کر اس کو



بہت دکھ ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ جنگ انسانیت کا خاتمہ کر دے گی اور اس نے کھل کر جنگ کی مخالفت کی اور اس کام میں اس کی بیوی نے بھی ساتھ دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ دنیا میں انسانیت کی بقا کے لیے امن کی ضرورت ہے۔ جنگ سے کبھی بھی انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کی اس تحریک نے عوام کو متاثر کیا اور چونکہ اس کے خیالات کو سراہا گیا، اس لیے اس نے زندگی بھر کے لیے اپنے آپ کو انسانیت اور معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا اور اس مقصد کے لیے وہ کئی منصوبوں کے تحت کام کرنے لگا۔ خاص طور پر اس نے ان شفا خانوں میں بلا معاوضہ خدمات دیں جو اسکولوں سے ملحق تھے اور جہاں بچوں کی صحت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کی خدمات کے اعتراف کی شکل میں ۱۹۲۶ء میں اس کو امریکہ میں مدعو کر لیا گیا اور وہاں وہ مختلف اداروں میں لیکچر دیا کرتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ مستقل طور پر امریکہ منتقل ہو گیا اور وہیں وہ Aberdeen یونیورسٹی میں ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو ایک لیکچر دے رہا تھا جہاں اس کو دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اس طرح ایک ماہر نفسیات اور انسانیت کے ہمدرد سے دنیا محروم ہو گئی۔

حالانکہ الفریڈ کے نظریات کو فرائڈ کے نظریات کے ساتھ تو نہیں رکھا جاسکتا، پھر بھی اس کے خیالات کو نفسیات میں اہمیت حاصل ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ایڈلر نے ایسے موضوعات پر توجہ دی جو عام آدمی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے فرائڈ کے ایسے مفروضات کی مخالفت کی جو عام آدمی تو کیا، ماہرین کی سمجھ سے بھی کبھی کبھی دور تھے۔ اس نے فرائڈ کے نظریہ جنس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ہم اس سلسلہ میں نہ تجربہ کر سکتے ہیں اور نہ بچوں کے جذبات کو اس زاویہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے خلقی جبلت کے نظریہ کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ انسان کا ہر کردار جبلی نہیں ہو سکتا اور جبلی اثرات کا دار و مدار خاندان کی طرز زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایڈلر کا خیال تسلیم کیا گیا کہ بچہ جن لوگوں کے ساتھ نشو و نما پاتا ہے یا جن حالات میں اس کی پرورش ہوتی ہے، وہ اس کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ الفریڈ نے



یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ بچہ کی شخصیت پر اس بات کے بھی اثرات ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کی کون سی اولاد ہے۔ یعنی اس سے پہلے ان کی اور کتنی اولادیں ہیں۔ اس نے کہا کہ پہلے بچے کی شخصیت دوسرے اور تیسرے بچے سے کچھ معاملات میں الگ ہوگی۔ ایڈلر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے جو نظریات پیش کئے وہ اتنے آسان تھے کہ ہر آدمی سمجھ سکتا تھا، ساتھ ہی وہ نظریات عام آدمی سے تعلق رکھتے تھے۔ اتنا ہی نہیں، اگر کسی فرد میں مشاہدہ کی صلاحیت ہے تو ایڈلر کے مفروضات کو آزما بھی سکتا تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب کسی گھر میں پہلا بچہ پرورش پا رہا ہوتا ہے اور جلد ہی اس کا ایک اور بھائی یا بہن آ جاتی ہے، تو گھر کے سب افراد کی توجہ اس نئے مہمان کی جانب رخ کر لیتی ہے۔ یہ فطری بات ہے کیونکہ چھوٹے بچے کی یہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس پر ہر لمحہ توجہ دی جائے۔ لیکن جب بڑے بچے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی ماں اب تمام تر توجہ اس چھوٹے مہمان کی جانب مبذول کر رہی ہے تو اس کے دل میں ایک رقابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑا بچہ اپنی محدود صلاحیت کی وجہ سے یہ نہیں جانتا کہ اس کا چھوٹا بھائی یا بہن اس سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ اس رقابت کے جذبہ کے امکانات اس وقت کم ہو جاتے ہیں جب پہلا بچہ اتنا بڑا ہو جائے کہ وہ حالات کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر پائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پہلا بچہ دو سال کا ہو نہیں پاتا کہ دوسرا بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بچہ دو سال کی عمر میں اتنی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے بھائی یا بہن سے مطابقت پیدا کر پائے بلکہ وہ اُس کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس نے مجھ سے میری ماں کو چھین لیا، میرے دوسرے رشتہ دار بھی اس کو زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ان باتوں کا وہ کبھی شعوری طور پر اور کبھی لاشعوری طور پر احساس لیتا ہے۔ اس لیے نفسیاتی طور پر بھی ڈاکٹر یہی مشورہ دیتے ہیں کہ پہلا بچہ جب اتنا بڑا ہو جائے کہ قبل مدرسہ کلاس Pre Primary Class میں جانے لگے، اس کے بعد اگر دوسرا بچہ پیدا ہوتا ہے تو پھر اس پر زیادہ اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ ایڈلر نے اس جذبہ کو Sibling Rivalry کا نام دیا ہے جس کے لیے اردو میں برادرانہ رقابت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ بعض



گھروں میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ بڑا بچہ زیادہ حساس ہوتا ہے اور وہ اپنے اوپر ہونے والے سلوک کا اثر لیتا ہے۔ اگر یہ اثرات سطحی ہوں تو بہت جلد اپنی اہمیت کھودیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ احساس لاشعور کی حد تک پہنچ گیا ہے تو پھر اس کے مضر اثرات مستقبل میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ایڈلر نے شخصیت کے موضوع پر بھی بہت کام کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر فرد اپنی الگ شخصیت لے کر پیدا ہوتا ہے، اس کی شکل و صورت اور جسمانی ساخت ہی دوسروں سے مختلف نہیں ہوتی، بلکہ بہت سارے معاملات میں اختلاف ہوتا ہے۔ کسی معاملہ میں اس کی مماثلت کسی دوسرے فرد سے اتفاق ہو سکتی ہے۔ ہر شخص اپنے طرز پر اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی جیتا ہے۔ اسی طرح ہر فرد کا ماضی الگ ہوتا ہے۔ اس کو جن تجربات سے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر فرد اپنی انفرادیت کو لے کر پیدا ہوتا ہے اور اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ اپنی زندگی گزارتا ہے۔

یہ خیالات تھے الفریڈ ایڈلر کے جو اس نے انفرادی نفسیات کے تحت پیش کئے اور ان خیالات کے پس پشت اس نے ایک فرد کی زندگی کی کہانی کو سامنے رکھا۔ اس نے امریکہ کے صدر روز ویلٹ کے حالات پڑھے تو اس کو معلوم ہوا کہ روز ویلٹ ابتداء سے ہی جسمانی طور پر بہت کمزور تھا۔ حالانکہ جس خاندان میں وہ پیدا ہوا تھا، اس میں سب تنومند، خوبصورت اور صحتمند افراد تھے۔ روز ویلٹ پیدائش کے بعد ہی بیماریوں کا شکار ہوتا رہا، دمہ کی بیماری لگتا تھا اس کو وراثت میں ملی تھی، کیونکہ جب اس پر دمہ کا دورہ پڑتا تھا تو اس کے ماں باپ اس کی زندگی سے مایوس ہو جاتے تھے۔ اس کے والدین نے اس کی صحت سدھارنے کی بہت کوشش کی۔ کبھی اس کو ایک ملک سے لے کر دوسرے ملک چلے جاتے جہاں کے بارے میں سنتے کہ وہاں دمہ کا علاج اچھا ہوتا ہے، اس کو وہاں لے جاتے۔ اس طرح انہوں نے پورے یورپ کا دورہ کر لیا لیکن روز ویلٹ پر مثبت اثرات ہونے کے بجائے منفی اثرات ہوئے اور اس کی صحت سدھر



نے کے بجائے بگڑتی ہی گئی۔ لیکن اس کے باپ نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اس طرح مرنے نہیں دے گا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ورزش سکھائی اور باقاعدہ جسمانی نشوونما کے لیے اس کو ایک ادارہ میں داخل کر دیا گیا جہاں جسمانی تعلیم کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔ وہاں اس سے جسمانی نشوونما کے مختلف طریقے سکھائے گئے۔ ورزش کے ساتھ ایسے کھیلوں کی مشق بھی کرائی گئی جن میں جسمانی صحت ضروری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کو وہاں وزن اٹھانے کی مشق کرائی گئی۔ جب وہ ۱۳ سال کا تھا تو اُس کو احساس ہوا کہ اس کی بینائی بھی کمزور ہے۔ وہ دُور کی چیز نہیں دیکھ پاتا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود روزویلٹ کے باپ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوشش میں لگا رہا، ساتھ ہی وہ اپنے بیٹے کی ہمت بڑھاتا رہا۔ جب کوششیں رنگ لائیں اور اس کی صحت میں کچھ سدھار ہوا تو روزویلٹ کو ہارورڈ یونیورسٹی میں داخل کر دیا گیا اور وہاں جا کر اچانک اس کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ وہاں اس کے اندر قوتِ ارادی میں اضافہ ہو گیا اور کچھ کر گزرنے کا عزم اور بھی مستحکم ہو گیا۔

روزویلٹ ایک کامیاب شخص کی صورت میں ہارورڈ یونیورسٹی سے نکلا۔ نیویارک کی اسمبلی کا ممبر ہوا، پھر نیویارک کا پولیس کمشنر مقرر کر دیا گیا، وہاں سے وہ امریکہ کی بحری فوج میں سیکریٹری بنا دیا گیا، پھر نیویارک کا گورنر۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادب کی جانب بھی متوجہ ہوا اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تصانیف کافی مقبول ہوتی تھیں اور لوگ اس کی آنے والی کتاب کا انتظار کیا کرتے تھے۔ وہ چالیس سال کا ہی تھا کہ امریکہ کا سب سے کم عمر صدر منتخب کر لیا گیا۔

روزویلٹ کے ان حالات کو جان کر الفریڈ نے سوچنا شروع کیا کہ ایک کمزور اور ناتواں بچہ، جس کی زندگی کی اُمید بھی نہیں رہتی تھی، کس طرح ایک طاقتور شخص کی شکل میں ابھرتا ہے۔ جبکہ صحتمند بچے اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اس نے سوچا کہ روزویلٹ کی کامیابی کے پیچھے اس کی قوتِ ارادی اور قوتِ محرکہ تھی۔ اس کی ہمت اور حوصلہ نے قوتِ محرکہ کی شکل اختیار کی یعنی قوتِ محرکہ کا مرکز خود اس کے اندر موجود تھا۔



ان سب سوالوں کا جواب تلاش کرتے کرتے الفریڈ نے ایک نظریہ وضع کیا کہ ہر فرد اپنی انفرادیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اپنی انفرادیت کے ساتھ پرورش پاتا ہے۔ ایک ہی ماں باپ کی اولادیں بہت سے معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، اور اس طرح اس نے نفسیات کی ایک شاخ انفرادی نفسیات Individual Psychology کی بنیاد ڈالی۔ اُس کے خیال میں کسی شخص کے بارے میں خیال ظاہر کرتے وقت اس کی شخصیت کو ایک مکمل وحدت کی شکل میں دیکھنا چاہئے نہ کہ ٹکڑوں یا اجزا کی شکل میں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ Individual کا مطلب غیر منقسم Undivided لینا چاہیے۔ اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ کسی فرد کی شخصیت محض روایتی انداز میں اس کے مختلف خصائص کو لے کر ہی نہیں بلکہ اس کے طرزِ زندگی کو بھی نظر میں رکھ کر اس کا جائزہ لینا چاہئے۔ یہاں طرزِ زندگی کے لیے اس نے اپنے مضمون میں انگریزی ترکیب Style of Life استعمال کی ہے۔ اب اسی مفہوم کے لیے عام طور سے "Lifestyle" استعمال ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ طرزِ زندگی سے یہ مطلب لینا چاہیے، کہ فرد کس طرح رہتا ہے، وہ اپنے ماحول سے کس طرح سازگاری پیدا کرتا ہے، وہ اپنے معاملات سے کس طرح نمٹتا ہے اور وہ دوسروں سے رشتہ قائم کرنے کے لیے کن اصولوں پر چلتا ہے۔ وہ ایک مثال کے ذریعہ اپنی بات واضح کرتا ہے کہ جنگل میں بہت سے درخت ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ سب ایک جیسے لگتے ہیں لیکن ہر درخت اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور وہ انفرادیت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کا اُن درختوں سے واسطہ پڑتا ہے، وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ہر درخت اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔

اس کا دوسرا نظریہ کمتری کے تعلق سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکثر افراد دوسروں سے کمتر ہوتے ہیں اور یہ کمتری نفسیاتی ہی نہیں، عضوی بھی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی کے جسم میں کوئی کمی ہونا، یا کسی عضو کا کمزور ہونا۔ یہ کمزوری بطنِ مادر میں نشوونما کے دوران بھی ہو سکتی ہے اور اجداد سے وراثت میں بھی مل سکتی ہے۔ ایسی کمتری کو وہ



عضوی کمتری Organ Inferiority کہتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب بچہ کسی کمتری کے ساتھ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کی تلافی کا ذریعہ بھی ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کسی مخصوص کمتری کی تلافی اس کے خود کے جسم میں ہی ہو جاتی ہے۔ یہ عمل ایک فطری نظام کے تحت انجام پاتا ہے۔ اگر کوئی فرد کسی ایک عضو کے تعلق سے کمتر ہے تو اس کے دوسرے اعضا اس کی کمتری کی تلافی کا انتظام کر دیتے ہیں۔

حواس کی کمتری کی تلافی کا تجربہ ہم عام طور سے کرتے ہیں۔ اگر کوئی نابینا ہے تو اس کے دوسرے حواس طاقتور ہوتے ہیں یا اس میں کچھ ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں جو اس کی کمتری کی کسی حد تک تلافی کر دیتی ہیں۔ دُنیا میں بہت سے حیوانات ہیں جن میں انسانوں کی طرح پانچوں حواس نہیں ہوتے، لیکن جو حواس اُن کے پاس ہوتے ہیں وہ اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ دوسرے حواس کی عدم موجودگی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے اپنے نظریات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب کوئی فرد اپنے اندر کمتری کا احساس شدت سے محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کا یہ احساس ایک الجھاؤ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور زندگی بھر وہ اسی کتری الجھاؤ میں الجھتا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ الجھاؤ خالص نفسیاتی کیفیت ہے اور جو فرد اس کیفیت کا شکار ہوتا ہے، وہ اپنی زندگی میں بہت کچھ کھودیتا ہے، اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر اعتماد کھودیتا ہے اور دوسرے لوگ آسانی سے اس کا استحصال کر سکتے ہیں، اس کی اپنی شخصیت دبی دبی رہتی ہے اور یہ کیفیت اس کی دوسری خصوصیات کو بروئے کار لانے میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ بعض وقت جب فرد میں نفسیاتی طور پر کمتری کا احساس ایک الجھاؤ کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کی پوری شخصیت پر سے اس کا کنٹرول ختم ہو جاتا ہے۔ ایڈلر اس الجھاؤ کو منفی توانائی کہتا ہے جو فرد کو پیچھے کی جانب کھینچتی ہے، اور اگر اس میں مثبت توانائی کی مقدار کافی نہ ہو تو اُس کا نفسیاتی نشوونما رک جاتا ہے یا کم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کمتری کے احساس کی ذمہ داری خود اُس فرد سے زیادہ اُس کے



ماحول پر ہوتی ہے اور ماحول میں اس کے والدین، اس کے گھر کے افراد یا اس کا معاشرہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ جو بچے اسکول جاتے ہیں، وہ اس بات کا تجربہ کر سکتے ہیں کہ اگر کلاس میں کسی طالب علم نے اپنے ٹیچر کے کسی سوال کا جواب غلط دیا اور اس کے عوض اس کو ایسے الفاظ سننا پڑے جن کی وجہ سے پوری کلاس کے سامنے اپنے آپ کو شرمندہ محسوس کرنے لگا، تو اس کا یہ احساس منفی شکل میں ہوتا ہے اور اگر وہ اس کا مثبت اثر لیتا ہے تو اس کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

اس بات کا تجربہ ہم روزانہ زندگی میں بھی کر سکتے ہیں۔ اکثر والدین اپنے بچوں کو بدھو، کم عقل یا بیوقوف جیسے خطاب دیتے ہیں۔ یہ خطاب اس کی زندگی پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس لیے گھر میں بچوں کی کسی کمزوری کے عوض انہیں ایسے الفاظ سے نہیں نوازنا چاہیے جو ان کے اندر احساس کمتری کو پیدا کرنے کا باعث ہوں۔ ایڈلر کہتا ہے کہ نفسیاتی طور پر کمتری کا احساس وقتی نہیں ہوتا بلکہ بعض وقت یہ Neurosis (یعنی عصبی اختلال) کی شکل میں فرد کی زندگی سے چمٹ جاتا ہے اور فرد کو دوسرے درجہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اس کا ایک اہم خیال، جو کافی پسند کیا گیا، وہ مردانہ برتری کے بارے میں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ پرانے زمانہ سے مردوں کو برتر اس لیے سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ اپنے باپ اور بڑے بھائی کے ساتھ مل کر شکار میں حصہ لیتا تھا اور اگر موقع آجائے تو وہ دوسرے قبائلی گروہ کے ساتھ لڑنے اور جنگ کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا تھا۔ اس لیے ابتداء سے ہی مردانہ برتری کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور اسی لیے ان کی پرورش میں بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ آج بھی وہی روایت زندہ ہے اور ہر گھر میں لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ دونوں کے طور طریقے الگ ہوتے ہیں، لباس الگ ہوتا ہے، ان کے کھیل الگ ہوتے ہیں، لڑکیاں عام طور سے میدانی کھیلوں میں حصہ نہیں لیتیں۔ جبکہ لڑکوں کو گھر کے کاموں میں حصہ لینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی کے گھر لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کا باپ سمجھتا ہے کہ اس کا ایک معاون آگیا اور اگر لڑکی پیدا ہوتی ہے تو



ماں خوش ہو جاتی ہے کہ اس کی ایک مددگار آگئی۔ اسی طرح جب دونوں بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی ذمہ داریاں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ ایڈلر نے اس مسئلہ پر غور کیا اور اپنے ایک مقالہ میں لکھا کہ پیدائشی طور پر مردوں اور عورتوں میں کچھ جسمانی فرق کے علاوہ اور کوئی تفریق نہیں ہوتی، دونوں ایک جیسا کام کر سکتے ہیں اور ایک جیسی زندگی جی سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ دونوں میں ایک فرق پیدائش کے بعد ہی پیدا کر دیا جاتا ہے، اس لیے یہ تفریق زندگی بھر اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور زندگی بھر عورت اپنے آپ کو مردوں کے مقابلہ میں کمزور سمجھتی ہے اور مرد عورت پر ہمیشہ کے لیے غالب ہو جاتا ہے۔

اس نے کہا کہ اگر ابتداء سے ہی دونوں کی پرورش میں کوئی فرق قائم نہیں کیا جائے اور دونوں کو مساوی درجہ دیا جائے تو دنیا سے مردوں کی ”دادا گیری“ ختم ہو جائے اور عورتوں اور مردوں کو مساوی اہمیت دی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ پرورش کے دوران لڑکے اور لڑکی میں جو فرق قائم کر دیا جاتا ہے، اُس کی وجہ سے عورت ہمیشہ یہی سمجھتی ہے کہ وہ مردوں کے مقابلہ میں کمتر ہے، اور چونکہ اس کے ذہن میں یہی احساس گھر کر چکا ہوتا ہے، اس لیے وہ مردوں پر غالب آنا تو کجا، مردوں کے مساوی ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ جو خواتین اس احساس سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتی ہیں (جیسا کہ آج کل رجحان پیدا ہو رہا ہے) تو وہ ہر معاملہ میں مردوں کے ساتھ ساتھ مساوات کے اصولوں پر زندگی گزار سکتی ہیں۔

الفریڈ ایڈلر نے شخصیت کے تعلق سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم تصور کر لیں کہ ہمارے اندر ایک توانائی ہے تو وہ توانائی ہماری سوچ سے پیدا ہوتی ہے اور یہی توانائی ہماری زندگی میں بہت سے معاملات میں کارفرما ہوتی ہے، خصوصاً نفسیاتی طور پر شخصیت کی تشکیل کے لیے یہ توانائی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس نے اس تعلق سے شخصیت کو تین قسموں میں بانٹ دیا ہے، پہلی قسم کو وہ Ruling Type کہتا ہے۔ اس میں وہ ایسے افراد کو شامل کرتا ہے جو عہدِ طفلی سے ہی نفسیاتی طور پر اپنی برتری قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوشش گھر میں دوسرے بچوں کے



ساتھ برتاؤ سے ہی واضح ہو جاتی ہے۔ ایسے بچوں میں جارحیت کا مادہ ہوتا ہے اور وہ دُوروں پر حاوی رہنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

دُوسری قسم کو وہ Avoiding Type کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایسے لوگوں میں ان کی ذاتی توانائی بہت کم ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو صرف معمول کی طرح سمجھتے ہیں، ان میں اپنی ذات کے لیے کوئی خواہش، کوئی جوش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے اور نہ کسی سے جنگ و جدل کو پسند کرتے ہیں۔

تیسری قسم کو وہ Socially Usefull Type کہتا ہے۔ اس کے خیال میں اس قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو صحتمند ہوتے ہیں اور سماج کے لیے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بچپن سے ہی اپنی زندگی دُوروں کے لیے جینے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں بھی اندرونی توانائی وافر مقدار میں ہوتی ہے کیونکہ وہ دُوروں کے لیے تب ہی کچھ کر پائیں گے، جب اُن کے اندر اس کی ہمت ہوگی اور یہ ہمت اُن کو اُن کی ذات میں پوشیدہ توانائی سے حاصل ہوتی ہے۔

الفریڈ ایڈلر کی تخلیقات میں چار کتابیں اور کچھ مقالات شامل ہیں۔ اس کی کتابوں میں سب سے زیادہ اہمیت Understanding Human Nature حاصل ہے جو کافی مقبول ہوئی۔ اس کی دُوسری اہم تخلیق The Practice and Theory of Individual Psychology ہے اور یہ بھی اس کی انفرادی نفسیات کو سمجھنے کے لئے اہم درجہ رکھتی ہے۔ باقی کی دو کتابیں Social Problems of Neurosis اور Interest: A challenge to Mankind کے مقالات International Journal of Individual Psychology میں شائع ہوتے تھے۔ یہ جرنل اس کے قائم کردہ مکتب فکر کا ترجمان تھا۔

○○



# ہنری برگساں

Henri Bergson (1859-1941)

ہنری برگساں اپنے زمانے کا ایک عظیم فلسفی اور ماہر نفسیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ فرانس میں اس نے اپنی زندگی میں ہی شہرت کے آسمان چھو لیے تھے۔ اس کی شہرت کی وجوہات صرف اس کا فلسفہ، اس کے نظریات اور اس کی تعلیمی خدمات ہی نہیں تھیں، بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے فرانس کی سیاست میں بھی نمایاں کام انجام دیے تھے اور عالمی سطح پر فرانس کو عزت اور وقار دلانے کا باعث بنا تھا۔ اس نے ۲۱ سال تک فرانس سب سے زیادہ قابل فخر تعلیمی ادارے College de France میں فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اس مدت میں کئی مشہور دانشور اور مفکر اس ادارے سے نکلے جنہوں نے خود فرانس میں اپنے اپنے شعبوں میں شہرت حاصل کی۔

ہنری برگساں ایک یہودی خاندان میں ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں برطانیہ کی رہنے والی تھی اور باپ پولینڈ کا باشندہ تھا۔ ہنری برگساں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی کافی ذہین تھا اور اپنی کلاس میں ہمیشہ امتیازی شان کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ اسکول میں اس کی دلچسپی علم ریاضی میں تھی اور جب اس نے ۱۸۷۷ء میں علم ریاضی میں فرانس کا قابل فخر انعام حاصل کیا تو اس کے پروفیسر نے کہا تھا کہ ہنری آگے چل کر علم ریاضی میں کوئی کمال دکھانے والا ہے۔ لیکن ہنری نے اپنے اس پروفیسر کی پیشن گوئی صحیح ثابت نہیں ہونے دی اور جب وہ کالج



میں داخل ہوا تو اس نے فلسفہ کو اپنا موضوع بنایا اور فلسفہ میں ہی اس نے پیرس کے ایک مشہور کالج سے امتیازی پوزیشن سے گریجویشن مکمل کیا۔ اس دوران فلسفہ کے ہی ایک شعبہ نفسیات کو بھی اپنی دلچسپی کا مرکز بنایا اور اپنا پہلا تحقیقی مقالہ *What is Value of Contemporary Psychology* تخلیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے اُمیدوار ہو گیا اور اسی مقالہ پر اس کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔

برگساں کا پہلا اہم کام جو ۱۸۸۶ء میں فلسفہ کے ایک جرنل میں *On Unconscious Stimulation in States of Hypnosis* کے نام سے شائع ہوا تو وہ نفسیات سے ہی متعلق تھا۔ یہ مقالہ عمل تنویم پر مسلسل مشاہدہ اور تجربات کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہسٹیریا کے متعلق سگمنڈ فروئڈ اور ڈاکٹر برائر نے مل کر جو کام انجام دیا تھا، وہ ۱۸۹۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس لیے کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ عمل تنویم کے تعلق سے لاشعور کا تصور فروئڈ سے بھی پہلے برگساں نے پیش کیا۔ لیکن ان لوگوں کے خیال سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عمل تنویم کا استعمال سب سے پہلے فرانس میں ڈاکٹر شارکو نے ہی کیا تھا اور ۱۸۸۵ء میں خود فروئڈ نے فرانس کا سفر کیا اور تقریباً ایک سال وہاں رہ کر اس نے عمل تنویم پر تجربات کیے یا کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تربیت حاصل کی اور پھر واپس ویانا آ کر ڈاکٹر برائر کے ساتھ مل کر اس سلسلہ میں مزید تحقیقات اور تجربات کیے اور اس کے بعد دونوں نے مل کر اپنے تجربات اور تحقیق پر مشتمل تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جبکہ برگساں خود فرانس کا رہنے والا تھا اور وہ ڈاکٹر شارکو کے کام سے بھی واقف ہوگا۔ دوسرے یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اس نے عمل تنویم کے تعلق سے لاشعور کا جو ذکر کیا ہے، اس کا مفہوم فروئڈ کے مفہوم سے کچھ مختلف ہو سکتا ہے، کیونکہ خود برگساں نے اس بارے میں مزید پیش رفت نہیں کی یا اس نے خود اس موضوع کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

برگساں کا ایک اور اہم مقالہ ۱۸۸۹ء میں فرانسیسی زبان میں ایک جرنل میں شائع ہوا جس کا انگریزی میں ترجمہ *Time and Free Will* کے نام سے کیا گیا



اور اسی تحقیقی مقالہ پر اُس کو دوسری بار ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ برگساں کی دوسری بہت ہی اہم کتاب Matter and Memory کے عنوان سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی اور یہ کتاب اتنی مشہور ہوئی کہ اُس زمانے کے مشہور دانشوروں نے اپنی توجہ برگساں کی جانب موڑ دی۔ اسی تخلیق کی وجہ سے اس کا شمار بھی فرانس کے مفکرین میں ہونے لگا اور اسی تخلیق کی وجہ سے اس کو فرانس کے مایہ ناز اور مشہور تعلیمی ادارہ College de France میں ملازمت مل گئی۔ برگساں کہتا ہے کہ یہی موقع اُس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس نے اب نہایت سنجیدگی سے اپنے موضوعات پر توجہ مبذول کی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ برگساں نے لاشعور کا جو مفہوم لیا تھا، وہ اس مفہوم سے مختلف تھا جس کے تحت فرائڈ نے تحلیل نفسی کی بنیاد رکھی اور یہ بات اُس وقت اور بھی صاف ہو گئی جب فرائڈ اور برائر کی کتاب شائع ہوئی۔ لیکن برگساں نے اپنے مفہوم کو ہی صحیح سمجھا۔ وہ اس کو وجدانیت کا ایک وسیلہ یا ایک صلاحیت کی شکل میں دیکھتا تھا۔ اس سلسلہ میں اُس کے کئی مقالے یونیورسٹی کے جرنل اور ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ وجدانیت کے تعلق سے اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور اس موضوع پر مسلسل تحقیق و تجربات میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس کو ایک اور اعزاز ملا۔ اس کو لندن میں واقع Society for Psychical Research کا ۱۹۱۳ء میں صدر منتخب کر لیا گیا۔ یہ اس کی زندگی میں ایک اور بڑا موڑ تھا کیونکہ اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد اس نے اس سوسائٹی کو نیا جوش اور ولولہ دیا۔ دوسری طرف سوسائٹی کے تحقیقی کاموں میں دلچسپی لینے کی وجہ سے اس موضوع پر اس کو کافی عبور حاصل ہو گیا اور وجدانیت پر اس کے کام کو ہر جگہ سراہا گیا اور اس کی شہرت یورپ سے لے کر امریکہ تک پہنچ گئی۔

۱۹۰۷ء میں اس کی کتاب "Creative Evolution" شائع ہوئی تو پورے فرانس میں اس نے فلسفہ سے متعلق تمام شعبوں میں ایک دھوم مچا دی۔ اس کی اس کتاب کی وجہ سے ہی اس کا نام ملک کے مشہور اور مقبول دانشوروں کے ساتھ شمار کیا



جانے لگا۔ حالانکہ اس کتاب کے بعض حصوں پر اعتراضات کا سامنا بھی ہوا۔ جب بلند پایہ فلسفی برٹرینڈ رسل بھی اس پر تنقید کرنے والوں کے ساتھ مل گیا۔ اس نے برگساں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ..... ”برگساں ہم سب کو کیڑے مکوڑوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے یہ فقرہ اپنے مقالہ میں برگساں کے مضمون Nature of Intuition پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ برگساں کو ایک فلسفی تسلیم کرنا ہی غلط ہے کیونکہ اس کے خیالات تجربیت، فطرتیت اور حقیقت پسندی کے خلاف جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب برگساں کبھی لیکچر دیتا تھا تو ہال کچھا کھچ بھرا ہوتا تھا اور سامعین میں شہر کے فلسفہ کے طلباء ہی نہیں، بلکہ مشہور ہستیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس کا مشہور شاعر T.S.Eliot بھی برگساں کے پرستاروں میں شامل تھا۔

۱۹۱۳ء میں برگساں امریکہ بھی گیا اور وہاں اس نے کولمبیا یونیورسٹی میں Sprituality and Liberty کے عنوان کے تحت ایک لیکچر دیا جو امریکہ کے علمی حلقہ میں کافی پسند کیا گیا۔ امریکہ کے مشہور روزنامہ ”نیویارک ٹائمز“ نے اس لیکچر کی پذیرائی میں ایک بہت ہی جامع مضمون شائع کیا، جس میں برگساں کی دل کھول کر تعریف کی گئی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ برگساں کی شہرت امریکہ کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور جب اس کے دوسرے لیکچر کا اعلان ہوا تو عوام میں اس قدر جوش و خروش پایا گیا جو امریکہ کی علمی دنیا میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع دیکھنے میں آیا جب اس لیکچر ہال میں پہنچنے کے لیے ہر شخص کوشاں نظر آتا تھا اور وہاں جانے والوں نے ”براڈ وے“ نام کی شاہراہ پر ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح کی ٹریفک اس شاہراہ پر اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ امریکہ میں اس کی شہرت کی خبریں جب فرانس پہنچیں تو ان کی وجہ سے برگساں کی اہمیت میں اب اور بھی اضافہ ہو گیا اور اس کا احساس فرانس کی حکومت کو بھی ہوا۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ فرانس کی حکومت نے برگساں کی مقبولیت سے فائدہ



اٹھانے کی غرض سے اس کو اسپین میں فرانس کا سفیر بنا کر بھیج دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی اس کو فرانس کی حکومت نے امریکہ بھیج دیا تاکہ وہ صدر امریکہ ولن سے ملاقات کر کے امن کی کوششوں کو آگے بڑھائے۔ وہ خود کہتا ہے کہ پہلی بار جب میں امریکہ گیا تھا تو اُس وقت ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ دُنیا میں امن قائم کرنے کے لیے کوششوں کا مرکز واشنگٹن میں ہی ہے۔ اور دوسری بار جب حکومت فرانس کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ امریکہ گیا تو اس نے کہا..... ”میں نے اپنی زندگی کی چند ناقابلِ فراموش ساعتوں میں انسانیت کا ایک شاندار اور اُمید افزا روپ دیکھا۔ فرانس کو بچا لیا گیا اور یہ میری زندگی کے عظیم ترین اور پر مسرت لمحات ہیں۔“

برگساں کی زندگی میں امریکہ کے اس دورے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ امریکہ کی حکومت کے ساتھ League of Nation جیسی عالمی تنظیم کے قیام کے منصوبہ پر غور کرنے کے لئے پریزیڈنٹ ولن کے ساتھ ساتھ تھا اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا کہ اس تنظیم نے عالمی امن کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس طرح برگساں کی شہرت اب فرانس کی سیاست میں بھی آسمان چھونے لگی اور وہ بحیثیت ایک نامور فلسفی ہی نہیں بلکہ ایک دُوراندیش اور ماہر سیاستداں کی شکل میں بھی پہچانا جانے لگا۔

۱۹۲۵ء کے بعد برگساں کی صحت خراب رہنے لگی اور وہ شدید قسم کے وجع المفاصل کا شکار ہو گیا، جس کی وجہ سے اس نے عوامی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا تمام وقت فرانسیسی ادب اور فلسفہ کی ترویج و ترقی میں گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ ۱۹۲۷ء میں اس کو لیٹرچر میں نوبل پرائز سے نوازا گیا اور اس کی وجہ سے وہ پھر ایک بار خبروں میں رہنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ بیمار ہونے کے باوجود وہ اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا اور اس نے چار سال کی مسلسل محنت کے بعد اپنی آخری معرکتہ الآرا تخلیق The Two Sources of Morality and Religion کے نام سے شائع کی اور اُس کی اس تخلیق نے پھر اس کو ملک کے مقبول اور قابلِ فخر مفکرین کے درمیان لا بٹھایا۔ مذہب سے متعلق اس کے فلسفہ پر پھر بحث ہونے لگی، ساتھ ہی اس



کے فلسفیانہ خیالات بھی زیر بحث آنے لگے جس کی وجہ سے اس وقت کے فلسفہ کے طلباء کے ذہن پر بھی اس نے نشانات قائم کر لیے۔

۱۹۳۳ء میں اس کے مقالات کا مجموعہ Creative Minds کے نام سے انگریزی میں پھر شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ برگساں ۸۱ سال کی عمر میں ۳ جنوری ۱۹۴۱ء کو انتقال کر گیا۔ اس کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کیتھولک مذہب اپنا لیا تھا لیکن اس کی تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ اُس کی موت کی وجہ شدید نزلہ اور زکام کا حملہ بتائی جاتی ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس بیماری کا حملہ اس پر اس وقت ہوا تھا جب وہ پانچ گھنٹہ تک اپنے آپ کو یہودی شہریوں کی فہرست میں اندراج کرانے کے لیے قطار میں کھڑا رہا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس نے ۱۹۳۰ء میں ایک وصیت تیار کی تھی، جس میں یہ لکھا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے تمام کاغذات اور مسودے ضائع کر دیے جائیں۔ لہذا اس کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے اس کی بیوی نے اس کے تمام کاغذات آگ کے حوالے کر دیے اور اُن میں اُس کی ایک کتاب کا نامکمل مسودہ بھی شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پیرس کی لائبریری میں اس کی یاد میں قائم کیے گئے گوشہ میں کوئی دستاویز موجود نہیں، بلکہ وہاں اس کی ذاتی لائبریری میں موجود کتب اور اس کی تخلیقات ہی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے مفکرین اور دانشوروں کے لیے برگساں کے بارے میں جاننے کے لیے کچھ زیادہ مواد نہیں ہے۔

برگساں کے کام کا مختصر جائزہ لیا جائے تو اس کا پہلا مقالہ، جو فرانسیسی زبان میں تھا، کافی مقبول ہوا۔ بعد میں اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں TIME and FREE WILL کے نام سے کیا گیا۔ اس مقالہ میں برگساں نے کانٹ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس نے Time اور Space کے فرق کو صاف طرح واضح نہیں کیا، بلکہ اُن دونوں کو الجھا دیا ہے جس کی وجہ سے ہر فرد فطری عمل کا پابند تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ جبکہ برگساں کے خیال میں Time اور Space میں فرق کرنا بہت ضروری ہے،



تاکہ دونوں کو الگ الگ رکھ کر ان پر بحث کی جاسکے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ کانٹ کے ہاں شعوریت کا مفہوم بھی واضح نہیں ہے۔ شعوریت سے متعلق معطیات زمانی ہوتے ہیں اور اس کے خیال میں اس نکتہ کو تسلیم کرنے کے بعد ہی ہم اپنے ارتقا کا تجربہ کر سکتے ہیں۔

اس نے اپنے مقالہ میں مقداری کثرتیت اور کمیتی کثرتیت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ اس کی مثال وہ بھیڑوں کے ایک جھنڈ سے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم بھیڑوں کے ایک جھنڈ کو دیکھتے ہیں تو سب ایک ہی جیسی ہونے کی وجہ سے ہمیں ادراک ایک جھنڈ کا ہوتا ہے، یعنی بھیڑوں کا ایک گروپ، جس کا مطلب ہے کہ مقداری کثرتیت ہمیشہ Homogeneous (جس کے لیے اردو میں 'ہم قسم' یا 'ہم نوع' کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے) ہوتی ہے، جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ باوجود ان کی ہم نوعی کی خصوصیت کے، ہم ان بھیڑوں کو الگ الگ رکھ کر ان کا شمار بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ہر بھیڑ ایک مکانی حقیقت ہے۔

اس طرح ہمدردی یا ہم گدازی کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ حالانکہ اس جذبہ کا اظہار بہت آسانی سے کیا جاسکتا ہے، لیکن صحیح معنوں میں اس کا احساس بہت مشکل عمل ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ ہمدردی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے آپ کو اس فرد کی جگہ رکھ کر ان حالات کو محسوس کریں جن کو وہ محسوس کر رہا ہے اور اسی طرح اس درد یا دکھ کا احساس کریں جس سے وہ گزر رہا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر سوچیں تو بعض منفی احساسات بھی پیدا ہو جائیں جو ہمارے اندر دوسروں کے تئیں نفرت کے جذبہ کی بنیاد بن جائیں۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے باوجود ہم دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو ہم دوسروں کی ہمدردی نہیں حاصل کر سکیں گے، جب ہمیں اس کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دکھی اور دردمندوں کی مدد کرنا ہماری اپنی ضرورت ہے۔



اس طرح اگر سوچیں تو ہمارے ذہن میں ہمدردی کا جذبہ اپنے منفی پہلو کے ساتھ سامنے آئے گا۔ اس کا فلسفہ تھا کہ رحم کا اظہار تذلیل نفس اور منفی آرزو کو جنم دیتا ہے، ساتھ ہی یہ منفی آرزو فرد میں برتری کے احساس کی بنیاد بن جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ احساس مقداری ترقی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں ناپسندیدگی خوف میں تبدیل ہو جاتی ہے اور خوف ہمدردی کے جذبہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر ہمدردی شرمندگی اور پستی کا باعث ہوتی ہے۔ اس طرح اس نے وضاحت کی کہ گوا احساس میں غیر یکسانیت پائی جاتی ہے، پھر بھی مختلف احساسات ایک دوسرے کی تردید نہیں کر سکتے۔ اس نے اپنے ایک مضمون Introduction to Metaphysics میں ایک لفظ استعمال کیا ہے جس کو اردو میں وجدان ہمدردی کہہ سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح معنوں میں ہم احساسیت کا مطلب اُس وقت تک واضح نہیں ہوتا جب تک ہم خود اپنے آپ کو اُن حالات میں تصور نہ کریں جن حالات سے دوسرا فرد گزر رہا ہے، جس سے ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے آپ کو اس جگہ تصور کر کے درد محسوس کرنا الگ بات ہے اور اپنے آپ کو آس پاس رکھ کر کسی دوسرے کے درد کے احساسات کا مطالعہ کرنا الگ بات ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ حالات میں شامل ہو جانے سے ایک الگ قسم کا احساس پیدا ہوتا ہے جسے مطلق احساس کہتے ہیں۔

برگساں کا مشہور قول ہے کہ جیسے جیسے ہماری عمر بڑھتی ہے، ہمارا مستقبل مختصر ہوتا جاتا ہے اور ماضی طویل تر۔ اس کا یہ خیال امتداد Duration کی وضاحت کرتے وقت آیا۔ وہ کہتا ہے کہ ہر لمحہ ہمارے لیے ایک تجربہ ہوتا ہے۔ جو لمحہ گزر جاتا ہے وہ ماضی میں چلا جاتا ہے اور موجود لمحہ کے مد مقابل کبھی نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ شعوریت میں دو لمحے یکساں ہو سکتے ہیں، لیکن ہمارے ذہن میں وہ یکسانیت باقی نہیں رہتی۔ اس سلسلہ میں دلیل دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ خازنیت کے اصول کے تحت ہر لمحہ، جو ماضی میں چلا جاتا ہے، وہ ہمارے حافظہ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا حافظہ ماضی کے واقعات کا خزانہ ہے اور یہ خزانہ مختلف تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ دو تجربات یکساں



نہیں ہوتے، ہر لمحہ ماضی کے خزانہ میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ چونکہ ماضی طویل تر ہو جاتا ہے، اس لیے موجود لمحہ کسی بھی صورت میں ماضی جیسا نہیں ہو سکتا۔ وہ مختلف ہوتا ہے گزرے ہوئے لمحات سے بھی اور ان لمحات سے بھی جو آنے والے ہیں۔

اس سلسلہ میں Duration کی وضاحت کرنے کے لیے ایک مثال دیتا ہے کہ جس طرح دو چکریوں (یا چرخوں) کے درمیان ٹیپ گھومتا ہے تو ایک چکری سے اتر کر دوسری چکری پر لپٹتا ہے۔ یہاں ایک چکری ماضی، دوسری مستقبل، اور ٹیپ بذات خود امتدار ہے۔ اس مثال کا ایک نقص خود اس کے ذہن میں آیا تو اس نے لکھا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ چرخ کو الٹا گھما کر گزرے ہوئے ٹیپ کو آنے والے حصہ پر چڑھایا جاسکتا ہے، تو وہ یہ خیال رکھے کہ یہ مثال وقت کی چرخ سے متعلق ہے جو کبھی الٹی نہیں گھومتی۔ Duration یعنی امتدار کے بارے میں برگساں کے ہاں جو خیال ملتے ہیں، ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ مختلف العناصر ہونے کی صلاحیت کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی وجہ سے ماضی کا تحفظ بھی ہوتا ہے۔ برگساں کا یہ خیال حافظہ کو ایک نئے انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حافظہ کی وجہ سے فرد اپنے تجربات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور یہ تجربات مختلف ہوتے ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ بعض معاملات میں برگساں نے کانٹ پر فوقیت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ کانٹ کا فلسفہ پیچیدگی پیدا کرتا ہے، کیونکہ وہ مکمل علم کے امکانات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ مابعد الطبیعیات کے متعلق اس کے نظریات نقائص سے بھرے ہوئے ہیں۔ دراصل کانٹ نے وجدانیت کو ایک نیا مفہوم دیا تھا اور اس کو خردمندانہ وجدانیت کہا تھا۔ ساتھ ہی اس کو مابعد الطبیعیات کا ایک حصہ بتایا تھا۔ جبکہ برگساں کا خیال تھا کہ وجدانیت کی یہ خصوصیت ہونا چاہئے کہ وہ ہم کو فلسفہ کے تمام مکاتب فکر میں جو فرق پائے جاتے ہیں، ان سے بالاتر کر دے۔ اس کے خیال میں عقلیت، تجربیت، حقیقت پسندی اور فطرتیت ایسے مکاتب فکر ہیں جو اس کی نظر میں آپس میں فرق رکھتے ہیں۔



برگساں کے خیال میں کانٹ نے ”اخلاقی فرائض“ کے تحت نظریہ پیش کر کے ایک نفسیاتی سہو انجام دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوسائٹی میں افراد پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، لیکن کوئی فرد کبھی کبھی ان میں سے کسی ذمہ داری کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ چونکہ وہ اس کو اپنے اوپر بوجھ سمجھتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے اندر ہی ایک احساس جاگتا ہے کہ اسے اس بارے میں سوسائٹی کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا، ساتھ ہی اس کے اندر ایک اپنی اس حرکت کے لیے خود کی مذمت کرنے کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اس کے اندر ہی ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کانٹ نے اس حقیقت کو نظر میں نہیں رکھا۔ برگساں نے اس کیفیت کے لیے مزاحمت برائے مزاحمت کی ترکیب استعمال کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرد جب کسی ذمہ داری سے پہلو تہی کرتا ہے تو ایک نامناسب عمل سرزد ہوتا ہے اور اس کی یہ نامناسب خواہش پوری کرنے کے لیے اُس کو سوسائٹی کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اس اخلاقی مزاحمت سے ٹکرانے کے لیے وہ جس مزاحمت کا استعمال کرتا ہے، اُس کو عقلی مزاحمت کا نام دیا جاسکتا ہے۔

برگساں نے اپنے طریقہ وجدانیت کو بے داغ اور علم کا ایک ذریعہ بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وجدانیت ایک قسم کا تجربہ ہے اور اس نے خود اس کو حقیقی تجربیت کا نام دیا ہے۔ اس نے اپنے مضمون Introduction to Metaphysics میں وجدانیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک مکمل وقوف اور علم کا ذریعہ ہے۔ یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ کانٹ نے عقلی وجدانیت کی اصطلاح استعمال کی ہے، ساتھ ہی اس کو مابعد الطبعیات کا ایک عنصر قرار دیا ہے۔ لیکن برگساں کے خیال میں وجدانیت ایک ایسا ذریعہ ہونا چاہئے جو فلسفہ کے مختلف مکاتب فکر، خاص طور پر، تجربیت، تصوریت یا عینیت، حقیقت کلیات اور عقلیت (یعنی یہ نظریہ کہ علم صحیح کی بنیاد عقل پر ہے) کے فرق سے اوپر لے جائے۔ ایسے مقام پر جہاں ہم ان میں تفریق کو مٹا سکیں۔ برگساں نے نظریہ اور ”نقطہ نظر“ میں بھی جو فرق ہے، اُس کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔



ایک اور اہم بات یہ ہے کہ برگساں امریکہ کے نظریہ عملیت Pragmatism سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ ہماری ضروریات اور خواہشات ذہانت کی رہنمائی کرتی ہیں، لہذا جو معلومات ہمیں حاصل ہوتی ہیں وہ غیر متعلق نہیں ہوتیں، اور اگر اُن کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اپنے اپنے تناظر میں مختلف ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ معلومات مختلف عناصر کا مجموعہ ہوتی ہیں جو ہماری تشفی تو کر سکتی ہیں لیکن اُن کے وجود کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں وجدانیت کا احساس دلاتا ہے۔ اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وجدانیت عام حالات میں اس عمل کو پلٹ دیتی ہے، جس کی وجہ سے مختلف عناصر کی تجزیہ کاری میں ایک رُکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، برگساں اس عمل کو تجربہ کے عمل پر ایک ضرب کاری سمجھتا ہے کیونکہ اس طرح وہ تجربہ پھر اپنی افادیت سے محروم ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ انسانی تجربہ کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔

برگساں کا ایک اور مقالہ Matter and Memory کے نام سے شائع ہوا اور اس کی اشاعت کے بعد ہی فرانس کے ادب اور فلسفہ کے میدان میں برگساں کی شخصیت ملک کے مشہور اور نامور مفکرین کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ برگساں نے اس مقالہ کے بارے میں خود لکھا تھا کہ یہ واضح طور پر ثنویت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس مقالہ میں اس نے مادہ کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور غیر مادیت پر بھی بحث کی ہے، ساتھ ہی اس نے ہمیں خبردار بھی کیا ہے کہ ثنویت پر بحث کے دوران کچھ نظریاتی دُشواریاں سامنے آ سکتی ہیں۔ فلسفہ کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو ادراک کے خیال سے ہی پیچیدگیاں پیدا ہو جانا ممکنات میں سے ہے۔ لیکن برگساں کے خیال میں اس نے اس قسم کی دُشواریوں پر قابو پانے کا راستہ بھی اپنے نظریات کے ذریعہ دکھا دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس نے پہلے باب میں قطعی ادراک کا نظریہ پیش کیا ہے، جس سے اس کا مطلب ہے کہ تخیل سے ہٹ کر اشیاء کی حقیقی شکل اس وقت ہماری معلومات میں آ سکتی ہے جب وہ معلومات اس اشیاء سے متعلق ہوں جس کی شبیہ پیش کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ آگے لکھتا ہے کہ ہمیں جس چیز کا احساس ہوتا ہے وہ ایک تمثال



(Image) ہوتی ہے اور برگساں کا یہی مفروضہ ہمیں اشارہ دیتا ہے کہ اس نے وجدانیت کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ اس نے ادراک کے ذریعہ حقیقت اور تصویریت کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مقالہ میں اس نے کئی اہم نظریات پیش کیے ہیں جن کو اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے.....

☆ مادہ وہ چیز ہے جس کے اندر ایک پوشیدہ توانائی ہے جو مادہ کو ہمارے احساس میں اپنی ایک شبیہ پیدا کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

☆ برگساں کے خیال میں تمثال Image اور شبیہ Representation میں ایک نمایاں فرق موجود ہے۔ لیکن یہ فرق فطری نہیں ہے۔

برگساں نے کئی مقامات پر اپنے اس خیال پر زور دیا ہے کہ تمثال اور شبیہ میں فطری تفریق نہیں ہے سوائے اس کے کہ تمثال اس چیز سے کم ہے۔ لیکن اس چیز کی شبیہ سے زیادہ۔ اس طرح اس کم اور زیادہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ تمثال اور شبیہ میں جو فرق ہے اس کی پیمائش کی جاسکتی ہے۔

☆ شعوری طور پر جن عناصر کی ہمارے جسم کو ضرورت نہیں، انہیں ہم راستہ سے ہٹا دیتے ہیں اور جو عناصر ہمارے جسم کو مختلف وظائف ادا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں، انہیں محفوظ کر لیتے ہیں۔ شعوری طور پر اگر ہم زندگی کا تصور کرتے ہیں تو یہ تصور ہماری ضرورت اور جہت پر انحصار کرتا ہے۔

نفسیات کے تعلق سے اگر دیکھا جائے تو برگساں کا یہ مقالہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے اس میں کئی ایسے نظریات پیش کیے ہیں جو نفسیات میں تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ برگساں کے خیال میں زندگی پر اعتماد دو متضاد احساسات کا مجموعہ ہے۔ یہ احساسات پہلے تو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، پھر دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ پہلا احساس یہ کہ زندگی ایک زمانی حقیقت ہے جو زمانے کے ساتھ حرکت کرتی ہے اور ماضی میں چلی جاتی ہے اور وہ اپنی یاد چھوڑ جاتی ہے۔ جبکہ دوسرا احساس یہ کہ زندگی ایک مکانی حقیقت ہے



کو فراموش کرنے کی یہی ایک اہم وجہ تھی کیونکہ اس کے ہاں روایتی قدامت پسندی نمایاں نظر آتی تھی۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمن ایک نئی توانائی کے ساتھ ابھر کر آیا تھا اور وہاں کی ترقی کے اثرات اور نئے رجحانات سے فرانس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور جرمن کے یہی اثرات مسلک برگساں (Bergsonism) کے زوال کا ایک اہم سبب تھے۔

لیکن یہ حالات دیر پا ثابت نہ ہو سکے۔ جلد ہی حالات نے کروٹ لی اور فرانس میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ برگساں جیسے عظیم فلسفی اور قابل سیاستداں کو فراموش کرنے کا اثر یہ ہوگا کہ فرانس کی علمی اور ادبی تاریخ کا ایک اہم باب عالمی افق سے غائب ہو جائے گا اور یہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ اس لیے فرانس کے ایک مفکر Saulez نے اس طرف توجہ دی اور برگساں کے فلسفہ کو دوبارہ پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس نے ایک کتاب خود لکھی اور دوسری کتاب ایک اور مفکر F. Worms کے ساتھ مل کر مرتب کی اور ۲۰۰۲ء میں شائع کی۔ اُن دونوں کے اس تحقیقی کام نے برگساں کو پھر فرانس میں ہی نہیں بلکہ دُنیا کے دوسرے ممالک میں بھی نئی نسل سے روشناس کرا دیا۔

فرانسیسی زبان میں برگساں کی چھ کتابیں ملتی ہیں اور ان کے علاوہ اس کے خطبات اور مقالات بھی ہیں جو مقامی جرنل میں شائع ہوئے۔ برگساں کی تخلیقات کے انگریزی میں جو ترجمے اب تک ملتے ہیں، اُن کی تعداد ۹ ہے۔ اس کی ایک کتاب Key Writings جو انگریزی میں شائع ہوئی اور کافی مقبول ہوئی، Keith Ansell Pearson نے اپنے ساتھی John Mullarkey کے ساتھ مل کر مرتب کی۔ اس کتاب کی وجہ سے برگساں کے فلسفہ کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب آج بھی دُنیا کے مختلف ممالک میں فلسفہ کے طلباء میں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ بھی برگساں کے فلسفہ اور علمی ادبی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور جن دانشوروں نے اس کے کام پر اظہار خیال کیا ہے، اُن میں ولیم جیمس اور برٹرینڈ رسل بھی شامل ہیں۔ لیکن اُس کی



جو امتداد کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اس کا ایک اور اہم مقالہ Creative Evolution ہے جس میں حیاتیات کے تعلق سے کئی اہم نظریات پیش کئے ہیں۔ اس نے اس مقالہ میں زندگی اور ارتقائی ظہور کے موضوع پر بحث کی ہے ساتھ ہی اس نے اس کے تنوع یا تغیر پذیری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کو ہم حقیقی زاویوں سے بھی دیکھتے ہیں ساتھ ہی حقیقی ارتقائی منازل کے تعلق سے بھی۔ جب ہم کسی نوع کی زندگی کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو ان دونوں زاویوں کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اس مضمون میں حیاتیات کی تخلیق کے بارے میں اس کے بہت اہم بیانات ہیں۔ وہ اپنے بیانات کو چار حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔ پہلا یہ کہ تمام مخلوق کی تخلیق کے پیچھے ایک ہی مشترک تحریک کارفرما ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر نوع کی ارتقائی حقیقت کے تحت اس میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، اُن کو بھی زیر بحث لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر تخلیق کے پیچھے تحریک مشترک ہے تو پھر تغیر کے اصول بھی طے شدہ ہونا لازمی ہے۔ تیسرے یہ کہ تنوع کے دو مختلف رجحان جو ارتقاء کے ضامن ہوتے ہیں، اُن کی شناخت جبلت اور اس نوع کی ذہانت کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔ چوتھے مرحلہ کو وہ وجدانیت سے تعبیر کرتا ہے، جس کی وجہ سے ہم اپنے پرانے دور میں جا کر اُس ابتدائی تخلیقی تحریک کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں اور اس کا سہارا لے کر اپنی ترقی کے راستہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برگساں فرانس میں فلسفہ اور ادب کے میدان سے بالکل دور ہوتا گیا۔ جنگ کی وجہ سے فرانس کی عام زندگی غیر معمولی حد تک متاثر ہوئی تھی اور اسی وجہ سے وہاں کی علمی اور ادبی زندگی پر بھی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ فرانس میں جدید طرزِ فکر ابھرنا شروع ہوئی۔ فلسفہ اور ادب سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے مفکرین نے روایتی طرزِ فکر کو اس لیے نظر انداز کرنا شروع کیا کیونکہ وہ قدامت پسندی کا رجحان پیدا کرتی تھی اور برگساں



موت کے بعد اور بیسویں صدی کے اواخر میں برگساں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ کتابیں فرانسیسی زبان میں بھی ہیں اور انگریزی میں بھی۔ ان کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ان کی تعداد تقریباً ساٹھ تک پہنچتی ہے۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ اہمیت فرانسیسی مفکر Deleuze کی تخلیقات کی ہے۔ وہ بذات خود ایک عظیم دانشور اور فلسفی تھا۔ اس نے برگساں کے فلسفہ پر چھ کتابیں لکھی ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے برگساں کے کام کو پھر ایک نئے روپ میں پیش کیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اُن مفکرین کی کوششوں کی وجہ ہے کہ برگساں کا نام ابھی بھی زندہ ہے اور اس کے نظریات پر اب بھی بحث ہوتی ہے۔

〇〇

---

(نوٹ: برگساں پر جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ہمارے ملک میں آسانی سے دستیاب نہیں ہیں اور کافی تلاش کے بعد بھی کسی لائبریری میں نہ مل سکیں۔ البتہ انٹرنیٹ لائبریری میں ایسی کئی ویب سائٹ ہیں جن میں اس کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اس مضمون کو مرتب کرنے میں ان سائٹ میں دی گئی معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔)



# جان واٹسن

John B. Watson ( 1878- 1958)

اُنیسویں صدی میں نفسیات میں ایک نئے رجحان کی ابتدا ہوئی جس کو اثباتیت (Positiveism) کا نام دیا گیا۔ یہ خیال سب سے پہلے ایک فرانسیسی مفکر Auguste Comte ( 1797-1857) نے پیش کیا جس کے تحت اس نے خیال ظاہر کیا کہ ہمیں ہر واقعہ کو مثبت نظر یہ سے دیکھنا اور پرکھنا چاہئے۔

اس خیال کی کسی نے تردید نہیں کی کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس پر بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مثبت علم حاصل کرنے کے لیے ہمیں کن طریقوں کو اپنانا چاہیے کیونکہ بعض مفکرین کے خیال میں مثبت علم حاصل کرنے کا مطلب منفی علم کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہ تو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ منفی علم کا وجود ہی نہیں کیونکہ جب تک کسی مسئلہ کے منفی پہلو پر غور نہ کیا جائے، اس کا مثبت پہلو واضح نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں اگسٹے نے خیال پیش کیا کہ نفسیات کا مطالعہ کرنے والے کو اپنی ذات کی حدود سے باہر نکل کر خارجی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے۔ اس کا خیال تھا مطالعہ باطن فرد کو اس کی ذات سے متعلق تجربات تک ہی محدود رکھتا ہے اور صرف اس کے اپنے نفس کے بارے میں معلومات مہیا کرتا ہے۔ اس نے اس خیال کی سختی سے مخالفت کی کہ فرد اپنے ذہن کی گہرائی میں جا کر دوسروں کے ذہن کا مطالعہ کر سکتا ہے، اس نے موضوعی ذہنیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی



موضوعی طریقہ کار پر بھی تنقید کی۔ اس نے کہا کہ نفسیات ایک ایسا موضوع ہے یا ایک ایسا شعبہ ہے جو ہم کو نہ صرف اپنے شعور کے بارے میں سوچنے پر زور دیتا ہے، بلکہ وہ ارد گرد کے دوسرے افراد کے اندر بھی جھانکنے کی وکالت کرتا ہے، تاکہ ایک مکمل نظام کی خصوصیات سامنے آسکیں۔ اگستے کے اس خیال کے تقریباً ایک صدی بعد امریکا کے ماہر نفسیات جان واٹسن (John Broadus Watson 1878- 1958) امریکہ میں ایک نیا مکتب فکر Behaviorism قائم کیا، جس نے امریکہ میں نفسیات کی ترقی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اُردو میں اس کے لیے کرداریت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ واٹسن نے اپنے اس نئے مکتب فکر کے ذریعہ مطالعہ باطن کو بالکل رد کر دیا اور اپنے اس نظریہ کی تشبیہ اتنی شدت سے کی کہ بہت جلد ملک کے دانشور اس کے ہم خیال ہوتے گئے۔

جان واٹسن ۹ جنوری ۱۸۷۸ء کو گرین ولے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس کی والدہ اپنے مذہب کی بہت پابند تھی اور مذہبی روایات کی قدر کرتی تھی۔ جبکہ اس کا باپ مذہبی پابندیوں سے آزاد تھا۔ وہ مذہبی امور کو اہمیت نہیں دیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ دونوں میں عدم مطابقت کی وجہ سے اکثر ناچاقی رہتی تھی۔ ان ہی حالات میں واٹسن کی پرورش ہوئی اور ماں باپ میں مستقل رنجش کی وجہ اس کے احساسات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اُس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ میں نے محسوس کیا کہ میری شخصیت ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔ جب اس کے باپ نے گھر چھوڑ دیا، اُس وقت جان واٹسن کی عمر صرف ۱۳ سال کی تھی۔ ماں باپ کی مناسب سرپرستی نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایک لاپرواہ اور غیر ذمہ دار فرد کی طرح زندگی گزارتا رہا اور بقول اس کے، وہ ابتدائی اسکول میں ہر کلاس میں گرتے پڑتے ہی پاس ہوا کرتا تھا اور کبھی اچھے نمبر نہیں لایا۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد وہ گرین ولے میں ایک مقامی کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن اس کے سامنے اپنے مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ آگے چل کر کون سا پیشہ اختیار کرے گا۔ گریجویشن کے



آخری سال میں وہ کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے اُس کو ایک سال اور زیادہ گزارنا پڑا۔ اسی کالج سے اس نے ایم۔ اے کی ڈگری لی اور پھر اس میں اچانک فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ شکاگو یونیورسٹی چلا گیا، جہاں اس نے فلسفہ میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ شکاگو یونیورسٹی میں اس کو جان ڈیوی اور جیمس انجیل جیسے مفکرین کی رہنمائی نصیب ہوئی اور ان دونوں دانشوروں کی وجہ سے اس کے اندر نفسیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی، اور ۱۹۰۳ء میں اس نے شکاگو یونیورسٹی سے نفسیات میں ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اس وقت تک وائسن ہی ایسا شخص تھا جس نے اس یونیورسٹی سے سب سے کم عمر میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وائسن نے اپنے حالات میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ہائی اسکول کے زمانے میں اس نے لائبریری میں اپنا جو وقت برباد کیا تھا، وہ اس کی بھرپائی کی فکر میں رہتا تھا۔ ساتھ ہی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ کالج کے دوسرے دوستوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناسکے یا تفریح میں اپنا وقت صرف کر سکے۔ اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ وقت مطالعہ میں گزارتا تھا اور اس کی محنت کا پھل اس طرح ملا کہ وہ صرف ۲۵ سال کی عمر میں شکاگو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کو جس تحقیقی مقالہ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی، وہ حیوانات کے علم سے متعلق تھا اور اس میں سفید چوہوں کے جسمانی نشوونما اور اعصابی نظام کے نشوونما کے تعلق پر بحث کی گئی تھی۔ اس نے تجربات کے بعد یہ ثابت کیا کہ حیوانات میں دماغ کی نشوونما اور ان کی آموزش میں ایک تعلق ہوتا ہے۔ یہ کتاب آج بھی حیوانیات سے متعلق مطالعہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد وائسن کئی سال تک شکاگو یونیورسٹی میں تحقیقی کاموں میں مصروف رہا۔ اس نے اپنا زیادہ وقت جانوروں میں حسی خصوصیات کے بارے میں تجربات پر صرف کیا۔ اس نے بعض پرندوں کو مستقل اپنے مشاہدہ میں رکھا اور ان کے کردار کا



گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کا ریکارڈ رکھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک جزیرہ کو اپنا مسکن بنا لیا اور وہاں مختلف نسل کے پرندوں پر تحقیق کرتا رہا۔ اس دوران اس کے پرندوں کی نسلیات پر تحقیقی کام کو بہت اہمیت حاصل ہے، خاص طور پر اس لیے کہ اس کی وجہ سے سائنس میں ایک نیا شعبہ Ethology وجود میں آ گیا اور وائسن نے پرندوں کے کردار سے متعلق جو تفصیلی ریکارڈ تیار کیا تھا، وہ Ethogram کہلایا گیا جس کا مفہوم تھا ”حیاتیات کی کسی نوع میں فطری طور پر رونما ہونے والے کردار کا تفصیلی مطالعہ۔“

شکاگو یونیورسٹی میں اس نے جو مدت گزاری اس کو وہ اپنی زندگی کا سنہرا دور کہتا ہے، کیونکہ جب ۱۹۰۰ء میں وائسن شکاگو میں آیا تو اس وقت وہاں دنیا کے مشہور فلسفی جمع ہو گئے تھے اور یونیورسٹی دنیا بھر میں فلسفہ کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے جانی جاتی تھی۔ جان ڈیوی، جارج ہربرٹ میڈ، ایڈلسن مور، اور جیمس آئنجل جیسے عظیم فلسفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو جان ڈیوی جیسا مشہور دانشور کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔ جان ڈیوی بذات خود ایک نئے مکتب فکر اور ساختیت کا بانی تھا۔ شکاگو یونیورسٹی میں تجربہ گاہ کا سربراہ جیمس آئنجل تھا۔ وائسن کو اس کے ساتھ اس تجربہ گاہ میں کام کرنے کا موقع ملا اور وہ اپنے کام میں اتنا محو رہتا تھا کہ چھٹی کے دن بھی وہ وہیں رہتا تھا۔ وہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۸ء تک شکاگو یونیورسٹی میں معاون پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور ۱۹۰۸ء میں ہی وہ تجرباتی نفسیات کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح نفسیات کی لیبارٹری مکمل طریقہ پر اُس کے ماتحت آ گئی۔ اس نے وہاں عضویات میں بھی مہارت حاصل کر لی اور عصبیات کی بھی تعلیم حاصل کی۔ اس کی تحقیق سے سائنس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو چکا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے امریکہ میں اس کی شہرت پھیل گئی اور سائنسی حلقوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اُن ہی دنوں جان ہاپکنس یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کے صدر جیمس بالڈون (James Mark Baldwin) کو شکاگو یونیورسٹی میں لیکچر کے لیے



مدعو کیا گیا اور اس مختصر مدت میں جان وائسن کو اس کے ساتھ چند روز گزارنے کا موقع ملا۔ وہاں وہ وائسن کے خیالات سے متاثر ہوا اور وہیں اس نے جان ہاپکنس یونیورسٹی میں وائسن کو کل وقتی پروفیسر کی حیثیت سے تقرری کی پیش کش کر دی، جس کو وائسن نے فوراً قبول کر لیا۔

جان ہاپکنس میں اس کو اس وقت کے مشہور سائنسدان Robert M. Yerkes کا ساتھ ملا۔ وائسن نے رابرٹ سے حیوانات کے کردار سے متعلق اپنے تجربات کا تذکرہ کیا۔ ان دونوں نے مل کر حیوانات کی بصری خصوصیات کی جانچ کرنے کے لئے ایک آلہ بھی ایجاد کیا، جو امریکہ کے سائنسی حلقوں میں کافی مشہور ہوا۔ اس طرح رابرٹ اور وائسن کی کوششوں سے علمیات کا ایک جدید موضوع وجود میں آیا جو نفسیات، عضویات اور علم حیوانات کے اصولوں کا ایک منظم مجموعہ کہا جاسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے امریکہ میں حیوانات کے کردار سے متعلق ایک جرنل کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۱۵ء میں وائسن کو ۳۷ سال کی عمر میں امریکہ کی American Psychological Association کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ وائسن کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ وہ امریکہ کا پہلا صدر تھا جو اتنی کم عمری میں اس اہم عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا۔

جان ہاپکنس یونیورسٹی میں وائسن نے اپنی توجہ نفسیات پر مرکوز کر دی اور مسلسل تجربات و تحقیق میں مصروف رہنے کے بعد اس نے اس علم میں ایک اور مکتب فکر کی بنیاد ڈالی اور دنیا کے سامنے کرداریت کا نظریہ (Behaviorism) پیش کیا اور اس نظریہ کے ساتھ ہی مشاہدہ باطن کا نظریہ اپنی اہمیت کھونے لگا۔

وائسن نے اپنے نظریہ میں اسی بات پر زور دیا کہ تجربات سے حیوانات کے شعور کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی ان کے احساسات کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن وہ جس کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کے ذریعہ ہم ان کی مختلف صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اسی بنیاد پر اس نے نفسیات میں یہ اصول وضع کیا



کہ نفسیات میں ہم کو صرف کردار سے تعلق رکھنا چاہیے اور صرف اس کا ہی مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس طرح وائسن نے شعور کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا اور ساتھ ہی مشاہدہ باطن کو بھی رد کر دیا۔ یہ نظریہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ کسی انسان یا حیوان کے شعور کے بارے میں ہم اس وقت تک کوئی خیال قائم نہیں کر سکتے جب تک وہ ظاہری کردار میں اس کا مظاہرہ نہ کرے۔ اس کا خیال تھا کہ شعور کا مطالعہ کردار کے ذریعہ ہو سکتا ہے، براہ راست شعور کا مطالعہ ممکن نہیں۔

وائسن کے اس نظریہ کو مقبولیت ملنا شروع ہوئی اور علمی حلقہ میں اس پر بحث کے بعد آہستہ آہستہ ماہرین نے بھی اس کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح نفسیاتی مطالعہ میں شعور کی اہمیت کم ہونے لگی اور ساتھ ہی مشاہدہ باطن کو بھی نظر انداز کیا جانے لگا اور کرداریت کی اہمیت میں اضافہ ہونے لگا۔ امریکہ میں کرداریت کے اثرات آج تک قائم ہیں۔ اکثر مقامات پر نفسیات کو کرداریت کی سائنس کا نام دے دیا گیا ہے۔ (اس سلسلہ میں قارئین سے درخواست ہے کہ یہاں لفظ کردار کے وہ معنی نہ لیے جائیں جو عام زبان میں رائج ہیں، بلکہ اس کا اصطلاحی مفہوم لیا جائے یعنی ”کسی عضو یہ کا وہ فعل جو کسی مہیج کے رد عمل کی صورت میں وجود میں آیا ہو۔“)

۱۹۱۳ء میں وائسن کی ایک بہت ہی اہم تخلیق شائع ہوئی جس کا عنوان تھا Psychology as the Behaviorist Views It۔ یہ دراصل ایک خطبہ تھا جو اُس نے ایک خاص موقع پر اپنے کالج میں دیا تھا اور بعد میں اُس کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی نفسیاتی حلقوں میں اس نئے مکتب فکر کے چرچے ہونے لگے اور اس کتاب کو The Behaviorist Manifesto کا نام دیا گیا۔ اتنا ہی گہیں، بلکہ کہیں کہیں اس کو کرداریت کی بائبل تک کہہ دیا گیا۔ اس کتاب میں اس نے لکھا تھا کہ کرداریت کے ماننے والوں کی نظر میں نفسیات ایک معروضی تجرباتی شاخ ہے جو فطرت کی حکمیات پر بحث کرتی ہے اور جو کردار کے نظری اور عملی مفہوم کے اظہار پر یقین رکھتی ہے۔ اس نے لکھا کہ مشاہدہ باطن کا اب نفسیات میں



کوئی مقام نہیں رہا اور نہ ہی اس کے ذریعہ شعوریت کی کوئی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ کرداریت کے نظریہ کو تسلیم کرنے والوں کی نظر میں انسان اور حیوانات کے کردار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ حیوانات کا کردار سادہ اور انسان کا کردار پیچیدہ ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی وہ منہج کا رد عمل ہوتا ہے۔

وائسن کا یہ کام بھی تنقید کا نشانہ بنا اور بہت سے مفکرین نے اس کے منفی پہلو پر بھی روشنی ڈالی۔ سب سے اہم اعتراض یہ تھا کہ انسان کا ظاہری کردار کسی بھی طرح اس کے خیالات، اس کے سوچنے کے انداز یا اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۹۰۹ء میں بیولوف نے کتوں پر طویل عرصہ تک تجربات کرنے کے بعد مشروط اضطراب یہ کا نظریہ پیش کیا تھا۔ لیکن وائسن نے اس نظریہ کو سرے سے رد کر دیا تھا اور کہا تھا کہ کتوں میں یہ رد عمل غدود کے میکانیکی عمل کی حیثیت سے دیکھا جانا چاہئے۔ بیولوف نے بھی وائسن کے نظریہ کرداریت پر سخت تنقید کی تھی اور اس کو نفسیات میں غیر اہم بتایا گیا تھا۔ حالانکہ بیولوف کی اس تنقید کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

وائسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خود مرکزیت کا شکار تھا اور اپنی ذات کو ہی اہمیت دیتا تھا، ساتھ ہی اُس میں ”شیخی بگھارنے“ کی بھی عادت تھی جس کی ایک مثال نفسیات میں یہ مشہور ہے کہ اُس نے اعلان کیا کہ ”مجھے بارہ صحتمند شیر خوار بچے دے دیجئے۔ میں ان کی اپنے طرز پر کرداریت کے اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے اس طرح پرورش کروں گا کہ وہ میری پسند کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھال سکیں۔“ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ ان بچوں میں سے سائنسداں، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، مصور، تاجر اور صنعت کار ہی نہیں، بلکہ چور اور بھکاری بھی بنا سکتا ہے۔ ان کی شخصیت پر ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کے اثرات معلوم ہوں گے نہ ان کے آبا و اجداد کے خصائص، ان کی تہذیب و تمدن کی چھاپ ہوگی اور نہ ان کے والدین کی طرز زندگی کا کوئی اثر نظر آئے گا۔ اس



نے اعتراف کیا کہ اس بیان سے وہ حقیقت کو جھٹلا رہا ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ دُنیا میں ہزاروں سال سے یہی ہوتا آرہا ہے۔

وائسن کے اس دعوے کو ایک کھوکھلا دعویٰ کہا اور اس پر اعتراضات کی بھرمار ہو گئی۔ دراصل اس نے برسہا برس تک حیوانات کے کردار کا مطالعہ کیا اور اس نے اپنی زندگی کے قیمتی سال فطرت اور پرورش کے آپس کے مقابلہ کی گتھی سلجھانے میں صرف کئے۔ اس نے والدین کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش میں نفسیات کا استعمال کریں اور اس کی طرف توجہ دیں کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ بچہ اپنے اجداد کی روایات اور خصوصیات کو نظر انداز کر کے ماحول اور حالات کے تقاضوں کے تحت اپنی شخصیت کی تعمیر اس طرح کرے کہ وہ سماج کے لیے ایک مسئلہ بن جائے۔ وائسن کو ایک اور معاملہ میں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جب اس نے سفید چوہوں پر ایک تجربہ کیا اور اس کی رپورٹ تیار کی۔ اس تجربہ کو نفسیات میں Little Albert Experiment کہتے ہیں۔ اس تجربہ کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ مشروطیت اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے گیارہ مہینہ کے ننھے البرٹ، میں سفید چوہوں سے خوف کی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ جب نفسیات سے تعلق رکھنے والے دانشوروں میں اس تجربہ کے چرچے ہوئے تو اُن کو تعجب ہوا کہ وائسن جیسا تجربہ کار اور مشاق نفسیات داں اس قسم کا تجربہ عمل میں لانے کے بارے میں کس طرح سوچ سکتا ہے، جس کی صحت غیر معتبر اور نتیجہ میں یکسانیت کا فقدان تھا؟ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ تجربہ اپنی شاگرد Rosalie Rayner کی ایما پر کیا تھا۔ یہ وہی شاگرد تھی جس کے ساتھ وائسن کے عشق کے قصے عام ہو گئے تھے۔

وائسن نے مختلف جرائد میں بچوں کی پرورش کے بارے میں مقالات لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔ اس موضوع پر اس کی کتاب Psychological care of Infant and Child جو اُس نے ۱۹۲۸ء میں مکمل کی، اس کی ایک اہم تخلیق مانی جاتی ہے اور بچوں کی نفسیات کے موضوع پر اس علم میں ایک اہم اضافہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا



کہ اپنی اس تخلیق کی وجہ سے اُس نے اُس وقت کی نسل میں بچوں کی نفسیات سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی یونیورسٹی میں بچوں کی نفسیات کا ایک شعبہ قائم کر دیا گیا اور اس میں تحقیق کے مواقع بھی فراہم کیے گئے۔ بعض مفکرین کا خیال تھا کہ وائسن فرائڈ کے نظریات سے اتفاق کرتا تھا اور اس نے فرائڈ کے بعض ایسے اصول، جو بچوں میں جنس سے متعلق تھے، وہ اپنائے اور اپنے تجربات میں اُن کا استعمال کیا۔ قارئین کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ وائسن نے فرائڈ کے ذکری مرحلہ کے نظریہ کا استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ عہدِ طفلی میں بچہ جب اپنے تناسلی اعضاء سے کھیلتا رہتا ہے تو اس کو ایک خاص قسم کا حذ حاصل ہوتا ہے جو آگے چل کر اس میں خود لذتی کی عادت کا باعث ہو سکتا ہے اور مشیت زنی کی عادت کو بڑھاوا دیتا ہے۔ اس نے ایک مضمون میں والدین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی آستینیں بڑی رکھا کریں اور ان کو اس طرح آگے سے بند کر دیں کہ بچہ اپنے ہاتھوں کا استعمال اس مقصد کے لیے نہ کر سکے۔ حالانکہ وائسن ہی ایسا دانشور تھا جس نے سب سے پہلے عوامی طور پر یہ کہا کہ مشیت زنی انسان کی صحت کے لیے مضرت رساں نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں یہ عادت بچے کے لیے مثبت اثرات کا باعث ہوتی ہے۔

وائسن کی نفسیات میں دوسرا موڑ اس وقت آیا جب اس نے ۱۹۱۹ء میں اپنی ایک اور تخلیق *Psychology from the Standpoint of a Behaviorist* کے عنوان سے شائع ہوئی تو اس کو بہت مقبولیت ملی اور ماہرین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ کتاب نصاب میں بھی شامل کر لی گئی۔ اس کتاب میں کرداریت کے تعلق سے انسان کے نفسیات اعمال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پہلے دو ابواب میں وائسن نے نفسیات کے طلباء کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ نفسیات ایک آزاد فطری حکمیات (Natural Science) ہے۔ اس نے زور دیا کہ نفسیات کو اسی روشنی میں انسانی کردار کو اہمیت دیتے ہوئے مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس نے انسانی کردار کی تنظیم پر مہیج کے ردِ عمل کے اثرات پر کیے تجزیہ پر زور دیا۔ وائسن کی اس کتاب نے امریکہ میں نظریہ



کرداریت کو بہت تقویت پہنچائی اور نفسیات حلقوں میں اس کے چرچے عام ہو گئے۔ لیکن اس کے اس نظریہ پر تنقید بھی کی گئی کیونکہ اس نظریہ کے فروغ کے بعد مشاہدہ باطن کا نظریہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس نے اس بارے میں کہا کہ یہ تنقید اس لیے ہے کیونکہ نظریہ کرداریت کو صحیح معنوں میں ابھی تک سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور وائسن کی زندگی میں اس کا آخری ایڈیشن، جس میں کافی اضافہ بھی کیا گیا تھا اور کچھ ترمیم بھی، وہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ اس وقت تک کرداریت کا مکتب فکر امریکہ میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ وائسن جب تک زندہ رہا، اپنے مضامین کے ذریعہ اپنے خیالات کی تشہیر کرتا رہا اور اس نے کوشش کی کہ اس نظریہ کو صرف ایسے دانشوروں تک محدود نہ رکھا جائے جن کی شہرت نفسیات کے علم تک محدود تھی، بلکہ اس نظریہ کو عوام میں بھی مقبول بنانے کی کوشش کی۔

امریکہ میں اس مکتب فکر کے مقبول ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ یہ نظریہ ساختیت کی بہ نسبت آسان، سادہ اور عام فہم تھا۔ اس لئے آسانی سے تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری یہ کہ یہ مکتب فکر امریکہ کے ہی ایک مشہور دانشور نے پیش کیا تھا اور کسی حد تک امریکن عوام میں اس سلسلہ سے جانبداری کا ایک جذبہ پایا جاتا تھا۔ اس نے مکتب فکر کو امریکہ میں پھیلنے پھولنے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ وائسن کی پُرکشش شخصیت اور اس زمانے کے مفکرین میں اس کی مقبولیت بھی اس نظریہ کے فروغ میں معاون ثابت ہوئی۔ امریکہ میں اس مکتب فکر کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ نیویارک کے کئی کثیر الاشاعت روزناموں میں اس موضوع پر مقالات لکھے جاتے تھے۔ نیویارک ٹائمز نے اس نظریہ کی تعریف کی اور لکھا کہ یہ نظریہ نفسیات میں ایک مسلک کی حیثیت رکھتا ہے اور وائسن کی کتاب ان چند اعلیٰ معیار کی کتابوں میں سے ایک ہے جو اب تک امریکہ میں شائع ہوئی ہیں۔ نظریہ کرداریت نے ایک طرف نظریہ ساختیت کی مقبولیت کو ختم کیا تو دوسری جانب نفسیات میں مشاہدہ باطن کی اہمیت کو بھی کم کر دیا۔



وائسن نے اپنی ذاتی زندگی میں کافی اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ جب وہ ہاپکنس یونیورسٹی میں تھا، اُس وقت اس کی شاگرد اور تحقیقی امور میں اس کی معاون Rosalie Rayner نام کی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ اس کے معاشرے کی خبریں یونیورسٹی میں گشت کرنے لگیں۔ وائسن شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی ایک بہت ہی بارسوخ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا بھائی امریکہ کی حکومت میں ایک بہت ہی اہم عہدہ پر فائز تھا، جو بعد میں پریزیڈنٹ روزویلٹ کا سیکریٹری بھی مقرر ہوا۔ دوسری طرف اس کی شاگرد جس سے وہ واقعی عشق کرنے لگا تھا، باٹلی مور کے ایک بہت اہم سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وائسن کی بیوی کو جب اس کے شوہر کے عشق کی داستان معلوم ہوئی تو اس نے جان ہاپکنس کے چیرمین سے اس کی شکایت کی اور اس معاملہ میں دخل دینے کی درخواست بھی کی۔ ساتھ ہی اس نے وائسن اور اس کی محبوبہ کے درمیان جو خطوط لکھے گئے تھے، وہ بھی کسی طرح حاصل کر لیے اور اس کی نقول یونیورسٹی کے بارسوخ حضرات میں تقسیم کر دیں۔ معاملہ نے طول پکڑا اور نوبت طلاق تک آ پہنچی۔ اس زمانے میں ہاپکنس یونیورسٹی کا معیار بہت بلند تھا اور پوری دنیا میں اپنے تحقیقی کاموں کی وجہ سے مشہور تھی۔ لیکن وائسن کے عشقیہ قصہ نے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے امریکہ کا علمی حلقہ بھی شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے ہاپکنس یونیورسٹی کو خیر باد کہا اور اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اس سلسلہ میں اس کو ایک معاہدہ پر دستخط کرنا پڑا کہ وہ اپنی بیوی کو زندگی بھر ایک خاص رقم دیتا رہے گا اور یہ رقم اس کی اس تنخواہ کے نصف کے برابر ہوگی، جو وہ ہاپکنس یونیورسٹی میں پاتا تھا۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں اپنی محبوبہ سے شادی رچالی۔

وائسن کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ پہلے جیسا وقار نہیں پاسکے گا، اس لیے اُس نے اپنے آپ کو علمی حلقہ سے دُور کر دیا، اور تحقیقی کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور اپنے کیریئر کی قربانی دیتے ہوئے ایک بہت ہی باعزت اور باوقار پوزیشن سے نیچے اتر کر ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں معمولی سی ملازمت قبول کر لی۔ جس کمپنی میں وہ



ملازمت کرتا تھا وہ اس کے مخالفین کے اثرات سے دُور تھی۔ اس نے اس سلسلہ میں ایک اہم کام کیا کہ خریداروں کی نفسیات کا بغور معائنہ کرنے کی غرض سے اس نے پہلے ایک جوتوں کی دکان میں سیلز مین کا کام کیا اور اس کے بعد کئی اور دکانوں میں اس نے اس مقصد سے ملازمت کی۔ اس کمپنی کے ڈائریکٹرز کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ وہی وائسن ہے جس کی امریکہ میں ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے پہچان ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، تو انہوں نے اس کو قلیل مدت میں اُس کا وائسن پر یزیڈنٹ کے حیثیت سے تقرر کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تشہیر میں اتنا کامیاب رہا کہ اس کی تنخواہ اور اس کے اشتہارات کے بونس سے حاصل ہونے والی رقم مجموعی طور پر اس کی اس تنخواہ سے کئی گنا زیادہ تھی جو وہ یونیورسٹی میں پاتا تھا۔

لیکن بد قسمتی نے اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اُس کو اپنی زندگی کا سب سے عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جس کے لیے اُس نے اپنا وقار، اپنی عزت داؤ پر لگا دی تھی، وہی اُس کو داغ مفارقت دے گئی اور صرف ۳۷ سال کی عمر میں وہ انتقال کر گئی۔ وائسن نے اس صدمہ کا بہت گہرا اثر لیا اور اپنے آپ کو ایک غیر معروف علاقہ میں بند کر لیا اور زندگی کے آخر دن اپنی تنہائی کے ساتھ وہیں گزارے۔ وائسن کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام کاغذات کو اپنی زندگی میں ہی جلا دیا تھا اور صرف اس کی تخلیقات باقی تھیں جو شائع ہو چکی تھیں۔



# زین پیاثرے

Jean Piaget - ( 1896- 1980)

قدیم اور جدید دور کے ماہرین نفسیات کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے آخر میں دو نام ایسے آتے ہیں جن کو ہم صحیح معنوں میں قدیم اور جدید دور کی ایک کڑی مان سکتے ہیں۔ تاریخ وفات کے لحاظ سے اس فہرست میں آخری نام اکیئر کا ہے اور اس سے پہلے زین پیاثرے کا، جو تقریباً ۳۰ سال پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ جس کی اہمیت نہ صرف نفسیات میں بلکہ دوسرے علوم میں بھی تسلیم کی جاتی ہے اور جو اپنے زمانہ کا ایک قابلِ قدر دانشور مانا جاتا ہے۔ پیاثرے کا نام کسی ایک علاقہ تک ہی محدود نہیں اور نا ہی اس کی خدمات کسی ایک شعبہ کے لیے مخصوص تھیں۔ بلکہ اس نے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دیں اور دنیا کے ہر حصہ میں اس کے نظریات سے استفادہ کیا گیا۔ آج بھی جب وقوفی نفسیات کا ذکر آتا ہے تو ذہن میں پیاثرے کا نام آ جاتا ہے۔

شخصیت پر اگر بات چلی ہو تو پیاثرے کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ مختصر طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پیاثرے پیدائشی طور پر غیر معمولی ذہین بلکہ فطین تھا، جس نے دس سال کی عمر میں ایسا مضمون لکھا تھا جس کی وجہ سے اُس کا نام پورے سوئزر لینڈ کے اسکولوں میں مشہور ہو گیا تھا اور اس مضمون سے ابتداء کرنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنی زندگی کے آخری دور تک وہ تقریباً ساٹھ کتابوں کا مصنف تھا، جس



میں ایک کتاب ۳۷ جلدوں پر مشتمل تھی، اور پانچ سو سے زیادہ مقالات دُنیا بھر کے جرائد میں لکھ چکا تھا۔

زین پیازے کی علمی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دُنیا کی ۳۱ یونیورسٹیوں نے اس کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں عطا کیں جن میں ہارورڈ، مانچیسٹر اور کیمرج یونیورسٹیز بھی شامل ہیں۔ اس نے عالمی پیمانہ پر یونیسکو کے کئی اداروں کے ڈائریکٹر اور معاون ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کو ۱۹۷۲ء میں عالمی شہرت یافتہ Erasmus Prize سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی گیارہ ایسے انعامات دیے گئے جن کی علمی دُنیا میں عالمی سطح پر اہمیت ہے۔

زین پیازے ۹ اگست ۱۸۹۶ء کو سوئزرلینڈ میں Neuchtel کے مقام پر ایک پروفیسر کے گھر پیدا ہوا۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ذہانت کا اعلیٰ معیار اور علمیات سے گہری دلچسپی اُس کو وراثت میں ملی تھی۔ اپنے شہر کے مقامی کالج سے گریجویشن مکمل کیا۔ اس نے اپنا پہلا مضمون ایک پرندہ پر لکھا تھا اور اس کے بعد اس کی دلچسپی اس موضوع سے بڑھتی ہی گئی۔ بعد ازاں اُس نے فطرت کے مشاہدہ پر زیادہ توجہ دینا شروع کی۔ اسی اسکول کے Natural History Museum میں ڈائریکٹر کے معاون کی حیثیت سے جزوقتی ملازمت مل گئی اور اس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ اس دوران اُس نے فطرت سے متعلق کئی مضامین لکھے جو پورے یورپ میں شوق سے پڑھے جاتے تھے اور کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا مصنف ایک نو عمر جوان ہے۔ فطری سائنس سے اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور اسی مضمون میں اس نے ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے سائنس سے توجہ ہٹا کر فلسفہ کی جانب موڑ دی تھی اور فلسفہ کے مطالعہ کے دوران اُس کو نفسیات کے مطالعہ سے بھی واسطہ پڑا۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اس نے ایک سال تک Zurich میں ڈاکٹر بلیولر کی مشہور زمانہ نفسیاتی لیباریٹری میں ایک سال گزارا۔ اس دوران وہ سگمنڈ فرائڈ سے



بھی متعارف ہوا اور اس کے بعد اس نے تحلیل نفسی میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے نفسیات کو اپنا موضوع بنا لیا۔ اسی سلسلہ میں وہ پیرس چلا گیا جہاں وہ ایک کالج میں نفسیات کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ اسی کالج میں اس کو سائمن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک بیٹے - سائمن کے ذہانت کی آزمائش کے چرچے تھے اور اس پر تحقیقی کام ہو رہا تھا۔ پیٹھڑے نے بھی اس سلسلہ میں تحقیق کا کام شروع کیا، لیکن اس نے بیٹے - سائمن کے طریقہ کار پر عمل کرنے کے بجائے، صحیح یا غلط کا خیال کیے بغیر اپنا الگ طریقہ استعمال کیا۔ وہ بچوں سے سوالات کرتا تھا اور بحث مباحثہ کی شکل میں بچوں کے اندر پوشیدہ ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اسی طریقہ کار کی وجہ سے اس نے وقوفی نشوونما کا ایک نظریہ پیش کیا۔ اس کے ذریعہ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ انسان میں وقوفیت کا ارتقاء کس طرح ہوتا ہے اور معلومات حاصل کرنے میں کس طرح اس کی مدد کی جاسکتی ہے۔ اس کو اس نے Cognitive Psychology کا نام دیا۔ اسکول کے بچوں سے بحث و مباحثہ کے ذریعہ ان کی ذہانت اور وقوفی صلاحیت کا اندازہ لگانے کا طریقہ اس وقت بالکل جدید مانا جاتا تھا۔ اس لیے ابتداء میں اُس کو اس میں زیادہ لوگوں کا تعاون نہیں مل سکا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور اس شعبہ میں مسلسل کام کرتا رہا۔

زین پیٹھڑے کے تین بچے ہوئے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا، پیٹھڑے نے اپنی بیوی کے تعاون سے ایک منصوبہ کے تحت اپنے بچوں کی نشوونما کا باریکی سے مشاہدہ کیا اور اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا۔ اس سلسلہ میں اس کو جو معلومات حاصل ہوئیں اور تجربات کے جو نتائج اخذ کیے گئے، اُن پر مشتمل مواد تین کتابوں میں شائع کیا جو نفسیاتِ نمو میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا اس نے بچوں کی نفسیات میں ایک سلسلہ کا آغاز کیا جو بعد میں جا کر نفسیاتِ نمو کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ پیٹھڑے نے اپنے تجربات سے یہ بات واضح کی کہ کس طرح بچوں میں وقوفی صلاحیت نشوونما پاتی ہے اور کس طرح چھوٹی عمر میں سمجھ داری اور استدلال کی صلاحیت



اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔

نفسیات میں پیاژے کی بچوں میں حسی حرکی منازل کے بارے میں تھیوری بہت مشہور ہے۔ ساتھ ہی اس نے وقوفی نشوونما سے متعلق جو نظریہ پیش کیا، اس نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی اور اس پر مزید تجربات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے اس کو Genetic Epistemology کا نام دیا۔ Epistemology کے لئے اردو میں علمیات کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور یہ فطرت کے مطالعہ کے ذریعہ علم حاصل کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ پیاژے کا خیال تھا کہ یہ علم حاصل کرنے کا عمل نشائی مرحلہ سے ہی شروع کرنا چاہئے کیونکہ ان معلومات کو حاصل کرنے کا عمل دراصل ایک مصالحتی عمل ہے اور یہ دو افعال کے باہم ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ ان دو افعال کو Assimilation (یعنی جذب کرنا یا اپنانا) اور Accomodation (یعنی عمل تطبیق جس کا مفہوم مصالحت کرنا بھی لیا جاتا ہے)۔ اس میں پہلی اصطلاح اس نے اس عمل کے لیے استعمال کی ہے۔ جب بچہ اپنے ماحول میں سے ہر نئی چیز کا مطلب اپنے انداز میں لیتا ہے اور اس کا یہ انداز اس کے اپنے تجربہ پر منحصر ہوتا ہے، اسی طرح دوسری اصطلاح سے اس کا مطلب تھا کہ بچہ اپنے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنی سوچ کے انداز کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح وہ مختلف اشیاء کی معلومات حاصل کرتا ہے۔

ایک اور اہم بات جو اس نے کہی کہ ان دونوں اعمال کے ساتھ ساتھ اس کو توازن برقرار رکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بچہ خود بخود ان دونوں مراحل میں ایک توازن قائم کر لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ اپنے پرانے تجربات کو نئے تجربات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس کی وقوفی نشوونما ہوتی ہے۔ پیاژے نے کہا کہ یہ تینوں اعمال بچے کی عمر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا یہ بیان نفسیات نمو میں بہت اہمیت رکھتا ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ بچہ ارتقاء کی منازل میں انفعالی طور پر اپنے آپ کو ماحول کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ بلکہ حقیقت



یہ ہے کہ بچہ اپنے آس پاس کی چیزوں اور حالات کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور ان کے بارے میں اپنے خیالات قائم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نفسیاتی طور پر ہم ابتداء میں ہر چیز کا اپنے انداز میں مطلب نکالتے ہیں اور اس کو اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پیاثرے نے مسلسل تحقیق وہ تجربات کے بعد وقوفی نفسیات سے متعلق ایک نظریہ وضع کیا جو اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ بچوں میں وقوفی نشوونما کی کئی منازل ہیں اور یہ منازل ہر بچے میں یکساں ہوتی ہیں۔ پہلی منزل کو وہ حسی حرکی منزل کا نام دیتا ہے اور یہ بچے میں پیدائش سے لے کر دو سال کی عمر تک مقرر کی گئی ہے۔ اس منزل کو اس نے کئی مرحلوں میں تقسیم کر دیا ہے، مثلاً بچے کی عمر کے پہلے چار مہینوں میں وہ صرف اضطراری حرکات کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ابتدائی رد عمل کے اصولوں پر کام کرتا ہے۔ چونسے کے عمل سے اس کو غذا حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو ایک آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ہر چیز کو منہ میں لے کر اسی آسودگی کے احساس کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے بعد کا مرحلہ اس کی عمر چار ماہ سے بارہ ماہ تک کا ہے۔ اس دوران بچہ ثانوی رد عمل سیکھ جاتا ہے اور اس کی دلچسپی چونسے کے عمل تک ہی محدود نہ رہ کر دوسری طرز کی آسودگی کی جانب رخ کر جاتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ماحول میں اس کو اور دوسری چیزوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ اس منزل میں پہلے بچہ اپنے کھلونوں سے اپنی دلچسپی مخصوص کر دیتا ہے لیکن اس عمر میں اس کی دلچسپی ان کھلونوں سے صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ نظر کے سامنے رہتے ہیں۔ نظروں سے دور ہوئے تو وہ اس کے ذہن سے بھی دور ہو جاتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے اس کی عمر میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، بچے میں اپنی پسند کی چیزوں میں دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور پھر ایسا دور آتا ہے جب بچے اپنی پسند کے کھلونوں کو یاد رکھتے ہیں۔ اگر وہ ان کی نظر سے دور ہو جائیں تو ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بارہ ماہ کی عمر کے بعد بچے میں دلچسپیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ہی



افعال سے تجربہ حاصل کرنا سیکھ جاتا ہے۔ مثلاً اگر اس کو کوئی ایسا کھلونا دیا جائے جس پر ایک چھوٹی سی لکڑی سے مارنے سے آواز پیدا ہوتی ہے اور اگر بچہ اس آواز کو پسند کرتا ہے، تو پھر ہر چیز کو اسی لکڑی سے بجانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب اس کی پسند کی آواز حاصل نہیں ہوتی تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ آواز کسی مخصوص چیز سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ پیاثرے کے خیال میں بچہ کی عمر جب ۱۲ مہینے کی ہو جاتی ہے تو اس میں تصور کی صلاحیت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ اپنے ذہن میں شبیہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک کام کو بار بار دہراتا ہے اور ساتھ ہی وہ کھلونوں سے کھیلنے کے نئے نئے طریقے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری منزل کو وہ قبل تفاعلی منزل (Preoperational Stage) کا نام دیتا ہے۔ اس منزل کی عمر دو سال سے لے کر سات سال تک طے کی ہے۔ اس کو بھی اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی ۲ سال سے ۴ سال تک اور ۴ سال سے ۷ سال تک۔ ۲ سال سے ۴ سال کی عمر میں بچہ میں سیکھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور وہ ماحول سے مطابقت اور سازگاری پیدا کرنے کے لیے دوسروں کی نقل کرتا ہے اور اس طرح بہت سے کام سیکھ جاتا ہے۔ اس عمر میں اس میں زبان سیکھنے کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنی بات کے اظہار کی کوشش کرتا ہے۔ ۴ سال کی عمر میں بچے میں ادراک کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور وہ مختلف چیزوں کو پہچان سکتا ہے۔ خاص طور پر ان چیزوں کو جو پہلے بھی اس کے تجربہ میں آچکی ہوں۔ اس عمر میں وہ رشتوں کی پہچان بھی کرتے لگتا ہے۔ ۷ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد وہ چیزوں کی خصوصیات، جیسے سائز، رنگ، تعداد، حجم وغیرہ کے لحاظ سے ان میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچے میں کسی حد تک استدلال کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے یا اس کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ ماہر نفسیات اس عمر کو اسکول میں داخلہ کی عمر کہتے ہیں کیونکہ یہی وہ عمر ہے جب بچے میں سیکھنے کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ سات سال کی عمر سے پہلے بچے کو کسی باقاعدہ اسکول میں داخل کرنے کو ماہرین نفسیات ان پر تناؤ کی حالت لا دنا تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے



بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں آج بھی اسکول میں داخلہ کی عمر سات سال ہے۔  
 پیانٹھ کے خیال میں بچے میں ایک خاص بات یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خود  
 مرکزیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز صرف اسی کے فائدہ کے  
 لیے بنائی گئی ہے۔ اسی عمر میں اس کی انا کی نشوونما میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ انا کا صحیح  
 تصور تو نہیں کر سکتا لیکن خود مرکزیت کی وجہ سے ہر چیز سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا  
 ہے۔ بعض بچوں میں خود مرکزیت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور یہ اُس وقت اور بھی بڑھ جاتا  
 ہے جب اس کے دوسرا بھائی یا بہن پیدا ہو جائے یا اس کے دوستوں میں سے کوئی  
 دوست اس کی چیزوں کو بانٹنے کی کوشش کرے۔ ہم روزانہ اس بات کا مشاہدہ کر سکتے  
 ہیں کہ بچہ اپنی ماں کی گود میں کسی دوسرے بچہ کو برداشت نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ سمجھتا ہے  
 کہ اس کی ماں کی محبت اور مہربانیاں صرف اس کے لیے ہی ہیں۔

تیسری منزل کو وہ مقرون تفاعلی منزل (Concrete Operational Stage) کہتا ہے۔ اس منزل کی عمر اس نے ۷ سال سے ۱۲ سال تک مقرر کی ہے۔ اس عمر میں  
 بچے میں ایک قسم کا استقلال پیدا ہو جاتا ہے، استدلال کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا  
 ہے، جن چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے ان کی مختلف خصوصیات جان لینے کی خواہش بڑھ  
 جاتی ہے۔ یہ تجسس اس کے سکھنے کے عمل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ سات سال کی عمر  
 کے بعد بچے میں خاص طور پر وہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ چیزوں کی  
 خصوصیات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے وہ ان میں فرق  
 پیدا کرتا ہے اور اس فرق کی بنیاد پر وہ ان کی پہچان قائم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی  
 بچے نے اگر لسی کا ذائقہ پہلی مرتبہ لیا ہے تو وہ دودھ اور لسی کے ذائقہ میں ہمیشہ کے  
 لیے فرق پیدا کر لے گا۔ اس عمر میں بچوں کی یادداشت پختہ ہو جاتی ہے اور خازنیت کی  
 صلاحیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، اور رنگ، سائز، خوشبو، شکل اور حجم جیسی خصوصیات  
 کی بنیاد پر چیزوں میں تفریق پیدا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اکثر بچے  
 کھیلنے وقت اپنے کھلونوں کو الگ الگ رکھ دیتے ہیں۔ آپ اگر غور کریں تو کھلونوں یا



جن چیزوں سے وہ کھیل رہے ہوں، اُن کو الگ الگ رکھنے میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جن کھلونوں میں پہنے لگے ہیں، وہ الگ رکھے ہوں گے۔ یہ اصناف بندی کی صلاحیت اس کی ذہانت پر دلیل کرتی ہے، اور مستقبل میں اس کے بہت کام آتی ہے، اور اسی صلاحیت کو بڑھانے کے لئے قبل پرائمری اسکولوں میں ایسے تعلیمی وسائل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بچہ اپنی اس صلاحیت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

چوتھی منزل کو وہ صوری تفاعلی منزل (Formal Operational Stage) کہتا ہے۔ اس کے لیے اُس نے ۱۲ سال کی عمر سے سن بلوغت کی عمر طے کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمر بچے میں ایک انقلاب لانے والی عمر ہوتی ہے کیونکہ اس میں نہ صرف جسمانی تبدیلیاں بلکہ نفسیاتی، اور جذباتی تبدیلیاں بھی بہت تیزی سے وجود میں آتی ہیں۔ جسمانی نشوونما کی رفتار تیز ہوتی ہے، بچہ اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں محسوس کرنے لگتا ہے۔ کچھ بچے اس معاملہ میں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اکثر بچے اپنے آپ میں بڑے ہونے کا احساس تیزی سے کرنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو اپنی عمر سے چھوٹے بچوں سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمر میں بچے کے خیالات میں بھی ایک انقلاب رونما ہو جاتا ہے، سوچ کا انداز بدل جاتا ہے، تصور میں استقلال آ جاتا ہے اور اس کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے، ماضی کے تجربات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس عمر میں تجسس کی صلاحیت کچھ زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ جو چیزیں اُن سے پوشیدہ رکھی جائیں، اُن کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس عمر میں پہنچنے کے بعد بچے مفروضات پر زیادہ یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کی حقیقت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پیازے کے نظریات کی نفسیات میں اتنی اہمیت ہے کہ نفسیات کا ایک شعبہ اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے اور جسے پیازین نفسیات کہا جاتا ہے۔ وقوفی نفسیات میں تو اس کے کام کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر ہم اس کو نظر انداز کر دیں تو نفسیات کے



مطالعہ کو مکمل کہہ ہی نہیں سکتے۔ یہ پیاثرے نے ہی ہمیں بتایا کہ حیاتیات کا حصہ ہوتے ہوئے ہم کس طرح علم حاصل کرتے ہیں اور کس طرح ہم اپنی وقوفی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ منطقی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر بچہ اپنے ماحول سے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے اور اس طرح جو معلومات حاصل کرتا ہے اس کے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر مستقبل میں اس تجربہ کا فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔ ماحول سے اس ہم عملی کی وجہ سے اس کے جسمانی نشو و نما کے ساتھ ساتھ ذہنی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔ زین پیاثرے نے نفسیات کی جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کے نظریات سے کوئی ایک شعبہ ہی متاثر نہیں ہوا بلکہ اس نے بچوں کی نفسیات، تعلیمی نفسیات، نشائی نفسیات اور سماجی نفسیات میں بھی اپنے نظریات کے اثرات مرتب کیے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اس کی تخلیقات کی تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے اور پانچ سو سے زیادہ اس نے مقالات لکھے ہیں۔ اس کی تخلیقات میں خاص طور پر جن کو اہمیت حاصل ہے، ان میں The Construction of Reality in the Child جو اس نے ۱۹۳۷ء میں مکمل کی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ اس کتاب میں اس نے اپنے ہی بچوں کی نشو و نما کا جو گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا اس کی مکمل تفصیل ہے۔ یہ کتاب بچوں کی نفسیات میں ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک اور اہم کتاب جو اس نے ۱۹۴۷ء میں مکمل کی اور اس کا ترجمہ انگریزی میں ۱۹۵۹ء میں ہوا The Growth of Logical Thinking from Childhood to Adolescence نام سے تھی۔ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۹۳۲ء میں وہ ایک کتاب The Moral Judgement of the Child کے نام سے شائع کر چکا تھا۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ بچوں کی نفسیات کے موضوع پر اس کی ایک اہم کتاب The Psychology of the Child کے نام سے ۱۹۶۶ء میں مکمل کی اور اس کا ترجمہ ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس کی ایک اہم تخلیق جو فلسفہ سے تعلق رکھتی ہے،



Insight and Illusions of Philosophy کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی اور اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۷۱ء میں بازار میں آیا۔

پیاثرے کی اہمیت اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے خیالات سے جن دانشوروں نے اتفاق کیا، اُن میں جان ڈیوی، ماریا موٹیسری اور پاؤل فرائر بھی شامل ہیں۔ اس نے نہ صرف اپنے دور کے، بلکہ ہر دور کے معلمین کے لیے یہ پیغام چھوڑا ہے کہ بچوں کا ذہن خالی برتن نہیں جسے معلومات سے بھرنا ہے، بلکہ بچے تو ایک معمار کی حیثیت رکھتے ہیں جو خود معلومات کی بنیاد رکھتے ہیں یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ننھے سائنسداں ہیں جو اپنی تھیوری خود بناتے ہیں اور خود ہی اس کو آزماتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیاثرے کی بصیرت نے ذہن کے پردوں کو کھول کر مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک ایسا دانشور تھا جس نے اپنی کم عمری میں ہی اپنی صلاحیتوں کا سکہ جما دیا تھا اور اپنی عمر کے ۷۵ سال اس نے نفسیات کی خدمت میں صرف کئے۔ ہم اس کو صرف وقوفی نفسیات کے تعلق سے ہی نہیں یاد رکھیں گے بلکہ اس لیے بھی وہ رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا کہ وہ تعلیم کے شعبہ میں اصلاح چاہتا تھا اور اس نے بچوں کی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی ضروریات کو سمجھا اور پہچانا۔ اس کا یہ قول ہمیشہ یاد رہے گا کہ..... ”کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھا جائے کہ یہ مسئلہ کیسے پیدا ہوا۔“

〇〇



# کیرن ہارنائی

KAREN HORNEY ( 1885-1952)

نفسیات کے میدان میں ایسی خواتین بہت کم ہیں جنہوں نے اس علم میں مہارت حاصل کی ہو اور اپنے کسی نظریہ یا نئے خیال سے اس علم کے نشوونما اور ترقی میں اپنی خدمات پیش کی ہوں۔ جو چند ہیں ان میں کیرن ہارنائی (Karen Horney) کا نام سرفہرست ہے۔ (اس کے نام کا تلفظ 'Horn 'eye' کیا جاتا ہے۔) اس کی شہرت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے پہلے اپنے آپ کو فرائڈ کی تحریک میں شامل کر لیا تھا، لیکن یونگ اور ایڈلر کے بعد ہی اس نے بھی فرائڈ سے اپنا تعلق ختم کر لیا تھا۔ اس قطع تعلق کی وجہ یہ تھی کہ اس نے فرائڈ کے بعض ایسے نظریات کو تسلیم نہیں کیا تھا جن میں خواتین کے تعلق سے اظہار خیال کیا گیا تھا کیونکہ وہ خود عورتوں کی نفسیات پر کام کر رہی تھی اور ان نظریات کو تسلیم کرنے سے اس کے خود کے کام میں خلل پڑتا تھا۔ جیسا کہ یونگ اور ایڈلر کے ساتھ ہوا، فرائڈ نے اس سلسلہ میں بحث کرنے کے بجائے ہارنائی سے تعلق ختم کر لئے۔ اس نے کہا تھا کہ.....

”میں خود عورت ہوں اور خواتین کے جذبات، ان کے خیالات اور سوچنے کے انداز کے بارے میں میں خود بھی جانتی ہوں اور جو نہیں جانتی وہ میں دوسری خواتین سے معلوم کر سکتی ہوں۔ جبکہ ایک مرد یہ کام آسانی سے نہیں کر سکتا۔“



کیرن ہارنائی ۱۶ ستمبر ۱۸۸۵ء کو جرمن کی راجدھانی برلن کے قریب ایک شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ جہاز کا کپتان تھا اور زیادہ تر وہ باہر رہتا تھا۔ کیرن ہارنائی کی ماں اس کے باپ کی دوسری بیوی تھی اور عمر میں اپنے شوہر سے تقریباً بیس سال چھوٹی تھی۔ کیرن کا ایک بڑا بھائی تھا جس سے وہ بہت محبت کرتی تھی۔ اس کے چار بہن بھائی اور بھی تھے جو اُس کی سوتیلی ماں سے تھے۔ کیرن کی ابتدائی زندگی ذہنی کشمکش میں گزری۔ نہ جانے کیوں اُس کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کا باپ اپنی پہلی بیوی کے بچوں سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے اور اس کے بھائی اور اس سے کچھ زیادہ وابستگی کا اظہار نہیں کرتا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ کیرن سے اپنے باقی بچوں سے زیادہ محبت کرتا تھا اور جب وہ طویل سفر سے کسی دوسرے ملک سے واپس آتا تو کیرن کے لیے تحفے لے کر آتا تھا۔ اتنا ہی نہیں، وہ اس کو کئی بار اپنے ساتھ لمبے سفر پر بھی لے گیا تھا۔ حالانکہ اس ملک کے قوانین کے مطابق جہاز کے کپتان کے لیے یہ مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ سفر پر کسی دوسرے کو اپنے ساتھ رکھے۔ ان تمام حقائق کے باوجود کیرن کو یہ احساس کیوں تھا، یہ جاننے کے لیے جب اس نے خود اس کا تجزیہ کیا تو اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اپنی ماں کو زیادہ چاہتی تھی اور اس کی ماں بھی کیرن سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور جب کیرن اپنے ماں باپ کی محبت کو ایک پیمانہ سے تولتی تو اس کو احساس ہوتا کہ وہ ماں سے زیادہ قریب ہے۔ چونکہ اس کا باپ زیادہ عرصہ تک سفر میں رہتا تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ گھر پر رہتی تھی۔ اس لئے دونوں ہر لمحہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک تھے۔

کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ اس کی ماں اس کے باپ کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس کو اپنے شوہر کی پہلی بیوی کے چار بچوں کی پرورش کرنا پڑتی تھی۔ اس سلسلہ میں کچھ اور بھی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ آپس کے اختلافات نے اتنا طول پکڑا کہ ۱۹۰۴ء میں کیرن کی ماں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے دونوں بچوں کو لے کر وہ برلن میں آکر بس گئی۔ وہاں اس کا ذریعہ معاش کیا تھا اور کس طرح اپنا اور اپنے دونوں بچوں کا خرچ پورا کرتی تھی؟ اس بات کا



کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن کیرن کی اپنی تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے احساسات میں ایک تلاطم برپا رہتا تھا۔ ڈاکٹر جارج بورری نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ کیرن بہت خوبصورت تھی پھر بھی وہ اپنے بناؤ سنگھار کی جانب توجہ دیتی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں فرسودہ خیالات موجود تھے اور اُن کو زیادہ اعلیٰ تعلیم کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ کیونکہ کیرن کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے والدین اور دوسرے لوگوں کی مرضی کے خلاف برلن یونیورسٹی میں میڈیکل کالج میں ۱۹۰۶ء میں داخلہ لے لیا تھا۔

اسی کالج میں قانون کے طالب علم آسکر ہارنائی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ پہلے دونوں میں دوستی رہی اور پھر ۱۹۰۹ء میں دونوں نے شادی کر لی۔ یہ شادی بھی غالباً اس کی ماں اور بھائی کی مخالفت کے باوجود ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے ایک سال پہلے ہی شادی کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ کوشش میں تھی کہ اس کے بھائی اور ماں اس رشتہ سے راضی ہو جائیں۔ لیکن شاید ایسا نہیں ہوا اور آخر کار دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۱۰ء میں اس کے ہاں پہلی لڑکی پیدا ہوئی اور اگلے ہی سال اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ یہ زمانہ کیرن کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا اور اس نے اس دور کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ.....

”ماں کی موت کے بعد میرے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ چکا تھا اور ان کے بغیر

میری زندگی کے وہ دن مجھے بہت شاق گزرتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ

میں ڈپریشن کا شکار ہوتی جا رہی ہوں۔“

غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ تحلیل نفسی کی جانب متوجہ ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو تحلیل نفسی کی تربیت گاہ میں داخل کر لیا۔ وہاں ڈاکٹر کارل ابراہم تھے جو فرائڈ کے معتقد تھے اور فرائڈ کی بدھ کی میٹنگ میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔ جب اس کی تربیت مکمل ہو گئی تو کارل ابراہم نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بھی فرائڈ سے ملاقات کرے اور اس کی بدھ کی میٹنگوں میں شرکت کرے۔ لہذا وہ فرائڈ سے ملی۔ فرائڈ نے اس کے خیالات



جان لینے کے بعد اس کو بدھ کے دن ہونے والی میٹنگوں میں مدعو کیا۔ کیرن کو یہ تحریک پسند آئی اور وہ تحلیل نفسی تحریک کی ترقی اور فروغ میں مصروف ہو گئی۔ اس کی ان مصروفیات کی وجہ سے اس نے اپنے شوہر کی ناراضگی کو دعوت دی۔ اس کا شوہر اس لیے ناراض رہتا تھا کیونکہ اس نے جو تجارت شروع کی تھی، اس کی جانب وہ زیادہ توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں اس کو تجارت میں بہت بڑا نقصان ہوا جس کو وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور وہ بستر کو لگ گیا۔ وہ ایک جانب اپنی بیماری سے پریشان، دوسری جانب وہ جذباتی طور پر منتشر اور یہی وجہ تھی کہ اس میں مزاج میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس کی وجہ سے وہ اپنی بیوی سے بھی نالاں رہنے لگا۔

ادھر کیرن بھی ان حالات کی وجہ سے پریشان تھی اور جذباتی طور پر بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ اسی دوران اس کو ایک اور عظیم صدمہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا بڑا بھائی ۴۰ سال کی ہی عمر میں پھیپڑوں کے مرض کا شکار ہو کر مر گیا۔ اس غم نے کیرن کی شخصیت کو بالکل منتشر کر دیا اور وہ پھر ایک بار ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔ وہ بھی اس حد تک کہ اس نے ایک بار خودکشی کی کوشش بھی کی۔ فرائڈ کو کیرن کے حالات کا پتہ چلا تو اس نے اس کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کی، تاکہ اس کی جذباتی کیفیت کا اندازہ لگا سکے۔ فرائڈ نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ.....

”یہ کیرن کی بد قسمتی تھی کہ اس کو باپ کی وہ شفقت نہیں ملی جس کی وہ حقدار تھی اور باپ کی جابرانہ اور تحکمانہ شخصیت کی وجہ سے عہدِ طفلی میں بھی سکون سے نہ رہ سکی اور اس پر دوسرا ظلم یہ ہوا کہ اس کا شوہر بھی اس کے مزاج سے مطابقت نہیں کر سکا۔“

کیرن نے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ زیادہ دنوں تک اپنے شوہر کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس لیے وہ اپنی تینوں بیٹیوں کے ساتھ شوہر سے الگ ہو کر دوسرے مقام پر جا کر رہنے لگی۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا کے کونے کونے سے دانشور امریکہ جا رہے تھے۔ اس لیے کیرن بھی امریکہ چلی گئی جہاں اس نے کئی یونیورسٹی میں لیکچر



دیے۔ جب اس کو بروکلین یونیورسٹی میں لیکچر دینا کا موقع ملا تو اس کو اس شہر کا ماحول اچھا لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بروکلین دانشوروں کا صدر مقام کہلاتا تھا۔ کیونکہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے دانشور وہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس میں بہت سے یہودی تھے جو نازیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر جرمنی چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔

کیرن کو بروکلین کا ماحول سازگار آ گیا کیونکہ یہاں بہت سے ہم خیال اور ہم ذوق مفکرین کا اس کو ساتھ ملا اور اس کی زندگی میں پھر ایک بار خوشیاں لوٹ آئیں۔ یہاں اس نے بہت سے نظریات پر کام کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بروکلین میں اس کو دو ہمدرد دوست مل گئے جو اس کے ہم خیال تھے۔ ان میں سے ایک تھا ایرک فرام (Eric Fromm) اور دوسرا ہیری سولیوان (Harry Sullivan) وہ ان دونوں سے وہ زیادہ قریب ہو گئی۔ ایرک فرام کے بارے میں تو کچھ لوگوں نے یہ تک کہہ دیا کہ دونوں میں بہت گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے جن پر شک و شبہ کی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ اس کے خود کے ایک بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کیرن نے اپنی زندگی کے سنہرے دن بروکلین میں ہی گزارے تھے، اور یہاں آنے کے بعد اس کو جو ماحول ملا تھا، اس نے اس کی غور و فکر کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا تھا اور اس نے نفسیات میں قابل قدر کام کیا۔

کیرن نے اسی شہر میں اپنی کلینک بھی قائم کر لی تھی اور وہیں وہ تحلیل نفسی میں دوسروں کو تربیت بھی دیتی تھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرائڈ سے اس کے تعلقات ٹوٹ گئے تھے، لیکن اس نے تحلیل نفسی کی تحریک سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا اور وہ زندگی بھر اس تحریک سے جڑی رہی اور اس کی کوششوں سے ہی بروکلین میں اس کا فروغ ہوا۔ اسی زمانہ میں اس نے عصبی اختلال (Neurosis) کے بارے میں اپنے نظریات وضع کیے اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلہ میں اس کے مقالات بھی کافی مقبول ہوئے اور ان سے نہ صرف ڈاکٹروں نے بلکہ عام لوگوں نے بھی استفادہ کیا۔ اس کو شکاگو میں Chicago Psychoanalytic Institute میں ایک اہم عہدہ پر مدعو کیا گیا۔



اس کے بعد نیویارک کی تحلیل نفسی کی انسٹی ٹیوٹ میں تربیت دینا شروع کی۔ اس دوران اُس نے فرائڈین طرز پر تحلیل نفسی کی مشق کرنے کے بجائے اس میں کچھ اصلاحات کی اور عام روش سے ہٹ کر اس نے اپنی طرز پر کام کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ امریکہ میں یہ انسٹی ٹیوٹ فرائڈ کے اقتدار سے باہر تھیں، اس لیے اس کو آزادی تھی کہ وہ اس معاملہ میں جو چاہے اختراع کرے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کوشش کرتی تھی کہ کسی نئی طرز کو اپنانے سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں اور تحلیل نفسی سے متعلق دوسرے ماہرین سے اس پر تبادلہ خیالات کرے اور ان کی رائے جاننے کی کوشش کرے۔ اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی اصلاحات کی کہیں سے کسی نے مخالفت نہیں کی۔ اس نے ان حالات سے متاثر ہو کر امریکہ میں ہی Association for the Advancement of Psychoanalysis قائم کی۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کیرن ہارنائی نے Neurosis یعنی عصبی اختلال کے بارے میں زیادہ تحقیقات کیں اور ان کی بنیادوں پر اس سلسلہ میں بہتر نظریات پیش کئے اور اس سلسلہ میں اس کی خدمات کارل یونگ اور الفریڈ ایڈلر سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے نظریات دراصل ان تجربات کا نچوڑ تھے جو اُس نے تحلیل نفسی کی مشق کے دوران کئے تھے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ فرائڈ کے بعد تحلیل نفسی کے فروغ میں سب سے زیادہ حصہ کیرن ہارنائی کا تھا۔ کیرن ہارنائی کا خیال تھا کہ جو لوگ عصبی اختلال کا شکار ہوتے ہیں وہ بھی ایک نارمل زندگی گزار سکتے ہیں۔ کیرن نے اپنے وسیع تجربات کی بنیاد پر دس ایسی ضروریات کی فہرست تیار کی جو عصبی اختلال میں مبتلا افراد کو فراہم کرنا ضروری ہے۔ حالانکہ یہ ایسی ضروریات ہیں جن کی ہر فرد خواہش کرتا ہے۔ لیکن ہر فرد کے حالات اور عصبی اختلال میں مبتلا فرد کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں ایسے مریضوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ.....

(۱) ان کو دوسروں کا پیار ملے تاکہ وہ بھی ان لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اپنے برتاؤ میں بہتری لانے کی کوشش کر سکیں۔



(۲) عصبی امراض میں مبتلا افراد کے لیے اکیلا پن بہت مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ انہیں ہمیشہ کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جو اُن کے دکھ درد کو بانٹ سکے اور اس طرح اس کے ذہنی بوجھ میں افاقہ ہو۔

(۳) کیرن ہارنائی کے خیال میں عصبی اختلال کے مریض اپنے آپ کو ایک مختصر سے خول میں مقید کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ دُنیا کے جھنجھٹ کو وبال تصور کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں عصبی مریض اپنے آپ کو اس طرح الگ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ لاشعوری طور پر یہ تمنا کرنے لگتے ہیں کہ وہ وطن مادر میں واپس چلے جائیں اور وہاں پر سکون زندگی گزاریں جہاں دُنیا کے دُوسرے جھنجھٹ نہ ہوں۔

(۴) ایک عصبی مریض تمنا کرتا ہے کہ اس کو طاقت اور توانائی مل جائے، اتنی توانائی کہ وہ اپنے ماحول کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکے۔

(۵) کیرن ہارنائی کے مطابق عصبی مریض یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے زیادہ سے زیادہ وابستگی حاصل کر سکیں، چاہے اس کے لیے اُن کے ساتھ نا انصافی ہی کیوں نہ ہو یا اُن کا استحصال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

(۶) عصبی مریض خاص طور پر بے توجہی سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی ایک اہم ضرورت ہے کہ وہ دُوسروں کی توجہ کا مرکز بنے رہیں، معاشرہ میں ان کی پہچان ہو اور ان کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ یہ معاشرہ کے ہر فرد کی خواہش ہوتی ہے لیکن عصبی مریض کی یہ ضرورت بن جاتی ہے۔

(۷) عصبی اختلال میں مبتلا افراد اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان سے متاثر ہوں اور ان کی تقلید کریں۔ وہ اپنے اندر ایک خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں ان کو ایک غیر ضروری اور ناکارہ شے تصور نہ کر لیا جائے۔

(۸) یوں تو ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ جو کام کرے، اُس میں کامیاب ہو اور اس خواہش کو جلی بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن کچھ عصبی مریضوں کو اس بات کا خبط ہو جاتا ہے کہ وہ ہر مقصد میں کامیاب ہوں اور ان کا ہر فعل مثبت نتائج کا حامل ہو اور وہ ناکامی



کا منہ کبھی نہ دیکھیں۔

(۹) عصبی مریض میں خود کفیل ہونے کی ضرورت بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ کسی کام کے لیے دوسروں پر انحصار کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی ان کی مدد کو آگے آتا ہے تو وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ خود کچھ نہیں کر سکتے اور کسی کام میں ان کو دوسروں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱۰) عصبی مریض یہ چاہتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا ہر پہلو مکمل ہو، ان میں ہر قسم کی صلاحیتیں ہوں، وہ ہر کام بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دیں۔ حالانکہ یہ بھی ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے، لیکن جب یہ خبط کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس کو عصبی مریض سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

کیرن ہارنائی نے عصبی مریضوں کا کئی سال تک مسلسل مشاہدہ کیا اور ان کا ریکارڈ رکھا اور اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ مندرجہ بالا ضروریات کی فہرست مرتب کر سکے۔ اس نے کہا کہ عصبی مریضوں کے علاج کے دوران یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ان کی ضرورتوں کو پورا کریں تاکہ وہ اپنے اندر کسی خامی یا کمی کو محسوس نہ کر سکیں۔ اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ جن لوگوں کے ساتھ عہدِ طفلی میں والدین کی جانب سے بے توجہی ملتی ہے اور ان کو کسی عمر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے بزرگوں نے ان کو الگ تھلگ کر دیا ہے، تو عصبی اختلال کی جانب جانے والی شخصیت کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں کیرن ہارنائی کے خیالات الفریڈ ایڈلر سے بہت کچھ ملتے ہیں کہ جن بچوں کی پرورش میں لاپرواہی برتی جاتی ہے یا وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں میں عصبی اختلال پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ والدین یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو زیادہ چاہتے ہیں اور کسی دوسرے کو کم لیکن ان کے برتاؤ سے بچہ یہ فرق محسوس کر لیتا ہے اور اس بچہ کا یہ خیال غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ سلوک کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے



اور اس کا اثر لیتا ہے۔ کبھی کبھی یہ کیفیت مختلف بھی ہو سکتی ہے کہ ایک بچہ کسی وجہ سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے تو دوسرے بچہ کو اس کا اثر نہیں لینا چاہئے۔ لیکن چھوٹے بچے اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ وہ اس فرق کی وجہ تلاش سکیں۔ لیکن جب بچہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے یا اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے تو یہ احساس ایک احتجاج کی شکل میں ابھرتا ہے، اور جو بچے اپنے والدین کے اس قسم کے سلوک کا شکار ہوتے ہیں، اُن کے ذہن میں اس امتیازی سلوک کے خلاف ایک احتجاج کا جذبہ ابھرتا ہے، جس کی وجہ سے ان کے کردار میں ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے یا ان کے مزاج پر اس کا اثر ہو جاتا ہے اور ان میں طیش اور اضطراب کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایک طرف یہ کیفیت اپنے والدین کے سلوک کی مخالفت کے طور پر احتجاج کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے (جس کو وہ (Basic Hostility) کہتی ہے اور یہ اس کے ساتھ نا انصافی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے) تو دوسری جانب اُس میں مادرانہ رقابت Sibling Rivalry کا جذبہ بھی تقویت پاتا ہے۔

عصبی امراض کے بارے میں کیرن ہارنائی کا خیال ہے کہ ایسے مریض اپنے اندر یا اپنی ذات کے بارے میں سوچتے ہیں تو انہیں اس کے اندر ایک خاص قسم کی کمی یا خلا محسوس ہوتا ہے اور یہ کمی اس برتاؤ کا نتیجہ ہوتی ہے، جو مریض کے خیال میں اس کے بزرگ اس کے ساتھ کرتے ہیں۔ جب مریض یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کے گھر میں یا اس کے ماحول میں اس کی کوئی اہمیت نہیں یا اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے، اور جیسے جیسے اس کے تجربات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کے مرض یا مریجانہ کیفیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ایسے مریضوں کے ساتھ گھر کے افراد اپنے سلوک پر نظر ثانی کریں اور جہاں تک ہو سکے، اُس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وابستگی کا اظہار کریں اور اپنے برتاؤ سے اس کو یقین دلائیں کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح اُن کو عزیز ہے۔ اس طرح اس بچے کے ذہن سے یہ خیال نکل جائے گا کہ وہ گھر میں ایک غیر ضروری سی چیز ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ ابتداء میں عصبی اختلال پیدا ہو



جائے اور اس کو تقویت کا موقع ملتا رہے تو مریض انتشارِ نفس کا طرف بڑھتا رہتا ہے، جو ایک شدید مرض ہے اور اس کے لیے اسکیزوفرینیا کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ کیرن ہارنائی نے خواتین کی نفسیات کو عام نفسیات سے الگ کر کے دیکھا اور اپنی کتاب *Feminine Psychology* میں اس خیال کو پیش کیا۔ لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ وہ عام نفسیات سے عورتوں کی نفسیات کو الگ کرنے کی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کی اس کتاب کے بعد کئی مفکرین نے مقالات لکھ کر یہ بات صاف کر دی کہ بعض معاملات میں خواتین کے خیالات میں فرق ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک نفسیات کے عام اصولوں کا تعلق ہے، اُن میں جنس کے تعلق سے کسی قسم کا فرق پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کتاب اس نے اپنی عمر کے آخری دور میں لکھی تھی جو اُس کی موت کے بعد شائع ہوئی اور اس پر تنقید کا جواب دینے کے لیے وہ دُنیا میں موجود نہیں تھی۔ اس کی سب سے اہم کتاب *Neurosis and Human Growth* تسلیم کی جاتی ہے جو کافی مقبول ہوئی اور آج بھی اس موضوع پر کام کرنے والے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کی پہلی کتاب *Neurotic Personality of Our Time* جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی، اور اس کے دو سال بعد ہی اس کی دوسری کتاب *New Ways in Psychoanalysis* ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اگر فرائڈ اس کتاب کو پڑھنے کے لئے زندہ ہوتا تو وہ شاید کیرن ہارنائی کا سب سے بڑا مخالف ہو جاتا۔

اس کے بعد اس نے ۱۹۴۲ء میں *Self Analysis* کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اُس نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ معمولی عصبی اختلال کو ہم اپنے آپ کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد دور کر سکتے ہیں یا کم از کم اس سے محفوظ رہنے کی تدابیر کر سکتے ہیں۔ کیرن ہارنائی نے اپنی تمام تر توجہ عصبی اختلال پر مرکوز رکھی اور اس سے زیادہ وہ نفسیات میں کچھ اور اہم کام نہیں کر سکی۔ لیکن اگر کسی عمارت کی تعمیر میں ہر اینٹ اور ہر پتھر اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے تو کیرن ہارنائی کی خدمات نفسیات کی ترقی میں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔



# کرت لیون

Kurt Lewin ( 1890- 1947)

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں دُنیا کے مختلف علاقوں میں فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی پائی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دور میں ایسے بہت سے عظیم مفکرین کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے فلسفہ کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اُسی زمانہ میں جدید خیالات اور نئے نئے نظریات پیش کیے گئے۔ ہم اس دور کے مشاہیر پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شعبہ میں بہت سے ماہرین کا تذکرہ ملتا ہے۔ اُن میں کچھ ایسے ہیں جو کافی مشہور ہوئے اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں حالانکہ قابلِ قدر خدمات انجام دیں، لیکن اُن کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ حقدار تھے اور اپنے دور کے دوسرے مشاہیر کے سامنے مناسب توجہ سے محروم رہے۔

نفیات میں بھی ایسا ہی ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کافی بڑے بڑے نام سننے میں آتے ہیں، جنہوں نے کئی مکاتبِ فکر قائم کئے، نفیات میں نئے شعبوں کی بنیاد ڈالی اور اسی وجہ سے وہ مشہور ہوئے۔ لیکن اُن مکاتبِ فکر پر مزید تحقیق وہ تجربات کی ذمہ داری سنبھالنے والے بہت سے دانشوروں کو خاطر خواہ شہرت نہیں مل سکی اور ان کے کام کو سراہا نہیں گیا۔ جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اُس دور میں چھ مکاتبِ فکر قائم کیے گئے۔ اُن میں سے ایک تشکیلی نفیات یعنی Gestalt Psychology بھی تھا۔ اس



مکتب فکر کی بنیاد جرمنی میں پڑی تھی اور اس کے بانیوں میں میکس ورتھائمر (Max Wertheimer 1880-1943)، کوہلر (Wolfgang Kohler 1886-1967) اور کرٹ کوفکا (Kurt Koffka 1886-1941) کے نام خاص طور سے مشہور ہیں۔ نفسیات کا یہ شعبہ ساختیت Structurism کی مخالفت میں وجود میں آیا تھا اور اس کی بنیاد بیسویں صدی کے ابتداء میں ہی جرمنی میں پڑ گئی تھی۔ لیکن اس کو مقبولیت امریکہ میں حاصل ہوئی، جب اُس سے تعلق رکھنے والے مفکرین ایک ایک کر کے امریکہ منتقل ہو گئے۔ گسٹاٹ کا مطلب صورت یا شکل سے لیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح مکانی صورت کے بھری ادراک کے چند مطالعوں کے بعد اخذ کی گئی تھی۔ اس شعبہ کی ابتداء اس خیال سے ہوئی کہ ماہر نفسیات کو کسی بھی چیز کی مکمل صورت یا شکل کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اس کے اُن عناصر کے بارے میں بعد میں پتہ لگانا چاہئے جن سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ تشکیلی نفسیات کے ماننے والوں کے نزدیک ذہنی کیفیات کی اپنی الگ حیثیت ہوتی ہے اور ادراک ایک بنیادی عمل ہے جس کی الگ ایک حیثیت ہے۔ اس مکتبہ فکر کے مرکزی خیال کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ.....

”کل کی ایک خاص اہمیت ہے اور کل اپنے اجزاء کا محض مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ان کو ایک خاص ترتیب دے کر اُن کی ایک جداگانہ حیثیت قائم کر دیتا ہے۔“

اس مکتب فکر کو مزید فروغ دینے میں ایک اور مفکر کا نام آتا ہے جس کو خاطر خواہ شہرت نہ مل سکی۔ وہ تھا کرٹ لیون (Kurt Lewin 1890-1947)۔ ہم اپنے اس مضمون میں اسی دانشور اور مفکر کی شخصیت اور نفسیات کے فروغ کے لیے اُس کی خدمات پر روشنی ڈالیں گے۔

کرٹ لیون کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے نفسیات کی ترقی اور فروغ میں واقعی ایک اہم رول ادا کیا ہے اور اس کی خدمات کو اس کے حامی ہی نہیں، بلکہ اُس کے ناقدین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ کرٹ لیون نے



اپنے آپ کو صرف تشکیلی نفسیات سے ہی جوڑے ہوئے نہیں رکھا بلکہ اُس نے سماجی نفسیات پر بھی بہت توجہ دی اور اس کے بعض نظریات اور خیالات سماجی نفسیات میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب، جبکہ تشکیلی نفسیات کے نقوش ہلکے ہو چکے اور اس مکتبہ فکر کو تقریباً فراموش کیا جا چکا ہے، کرٹ لیون کا نام سماجی نفسیات کے ذریعہ اب بھی زندہ ہے اور اس کے وضع کئے ہوئے اصول اس شعبہ کا ایک اہم حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

کرٹ لیون ۱۸۹۰ء میں جرمنی میں Prussia کے مقام پر پیدا ہوا تھا اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ Munich چلا گیا جہاں اس نے فلسفہ میں تعلیم حاصل کی اور گریجویشن مکمل کرنے کے بعد وہ برلن چلا گیا۔ اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری برلن یونیورسٹی سے ہی ۱۹۱۴ء میں حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے فوج میں جانا پسند کیا۔ فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اور فلسفہ میں ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کسی تعلیمی ادارہ میں ملازمت اختیار کرنے کے بجائے اُس نے فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں کیوں سوچا، یہ کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن وہ پانچ سال کے بعد ہی واپس لوٹ آیا۔ شاید اُس کو احساس ہو گیا تھا کہ اُس کا فیصلہ صحیح نہیں تھا۔ واپس آنے کے بعد اُس نے برلن یونیورسٹی میں تعلیم دینی شروع کی اور وہیں مختلف اسامیوں پر ۱۹۳۲ء تک فائز رہا۔ اس کے بعد وہ بھی امریکہ چلا گیا۔

امریکہ جانے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس سے پہلے بھی جرمن سے کئی مشہور دانشور امریکہ ہجرت کر چکے تھے اور وہاں فلسفہ کے تعلق سے فضا زیادہ سازگار تھی اور تعلیم کے میدان میں بھی زیادہ مواقع حاصل تھے۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ جرمن میں نازیوں کے بڑھتے ہوئے ظلم سے یہ طبقہ پریشان تھا اور ان کے عتاب سے محفوظ رہنے کے لئے امریکہ زیادہ مناسب تھا۔ اس لئے وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا رجحان دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔ امریکہ پہنچتے ہی اس کو اسٹینفورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ کے



پروفیسر کی حیثیت سے تقرری مل گئی۔ وہاں وہ ایک سال تک ملازمت کرنے کے بعد Cornell چلا گیا، جہاں اُس نے دو سال گزارے۔ پھر ۱۹۳۵ء میں Iowa یونیورسٹی میں بچوں کی نفسیات کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ وہاں وہ ۱۹۴۴ء تک رہا۔ پھر وہ Massachusetts Institute of Technology میں ریسرچ سینٹر کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ وہاں اُس کو تحقیق و تجربات کا اچھا موقع ملا۔ لیکن اس کی عمر اس کا ساتھ نہ دے سکی اور صرف ۵۷ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

کرٹ لیون نے اس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کافی اہم کام انجام دیے۔ اس نے وہاں گروہی حرکیات سے متعلق ایک تحقیقی ادارہ Research Centre for Group Dynamics کے نام سے قائم کیا اور اس مرکز میں اُس نے گروہی حرکیات پر بہت سے تجربات کیے اور گروہی ہم آہنگی، گروہی مباحث، اور گروہی ترسیل سے متعلق کئی مفید نتائج اخذ کئے۔ چونکہ یہ مرکز کرٹ لیون کے دور میں ہی قائم کیا گیا تھا اور اُسی نے اس کا منصوبہ پیش کیا تھا، اس لیے اُسی کو اس کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنی اس پوزیشن سے کافی اہم کام انجام دیے۔ اس مرکز کے تحت کرٹ لیون کی تحقیقات کا مقصد افراد کے محرکات سے متعلق نتائج اخذ کرنا تھا۔ اس نے گروہی حرکیات سے متعلق کئی جدید نظریات پیش کئے اور Group Dynamic کی اصطلاح وضع کی۔ اس سے اس کا مطلب حرکیات کے تعلق سے گروہ کی اہمیت واضح کرنا تھا۔ اس نے اس سلسلہ میں تجربات کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔ یہ تجربات اوپر بیان کئے گئے ادارہ کے تحت انجام دئے جاتے تھے۔

مفکرین کا خیال ہے کہ ان تجربات کے نتائج سے کئی نظریات پیش کئے گئے اور اس طرح سماجی نفسیات کو کافی تقویت بہم پہنچائی گئی اور یہ ثابت کر دیا کہ اجتماعی اور منظم طریقہ پر کسی پروگرام سے بہت سے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس کے تجربات اور ان کے نتائج آج بھی سماجی نفسیات کی درسی کتابوں کا ایک حصہ ہیں اور اس طرح اُس نے سماجی نفسیات میں بھی ایک مقام حاصل کر لیا۔ اس نے



گروہی اختلاف کی وجہ سے فرد کے نقطہ نظر اور میلان طبع میں ہونے والی تبدیلیوں پر بھی تجربات کیے۔ زندگی کے آخری کچھ سالوں میں اس کی دلچسپی شخصیت کی تنظیم کی جانب رخ کر گئی۔ کرٹ لیون کی موت کے بعد یہ مرکز کچھ بے جان سا ہو گیا۔ اس لیے اُس کومشی گن یونیورسٹی میں منتقل کر دیا گیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ تشکیلی نفسیات کی بنیاد یوں تو جرمنی میں پڑ گئی تھی، لیکن اس مکتب فکر کے ماہرین جرمنی سے ہجرت کر کے امریکہ منتقل ہونے لگے تو اس شعبہ کا مرکز بھی امریکہ پہنچ گیا اور جرمن میں اس شعبہ کے حامیوں کی تعداد میں دن بہ دن کمی آنے لگی۔ کرٹ لیون بھی جب امریکہ منتقل ہوا تو اس نے اس شعبہ کی جانب توجہ دی اور اس سے متعلق ماہرین سے تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کے بعد وہ بھی اس مکتب فکر کا حامی ہو گیا اور اس نے اس شعبہ کو فروغ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں اس کے کام کی قدر کی جاتی ہے اور تشکیلی نفسیات کا جب ذکر آتا ہے تو کرٹ لیون کو فراموش نہیں کیا جاتا۔ لیکن وہ قطعی طور پر اپنے آپ کو صرف اس شعبہ کے روایتی طرز فکر کا مکمل طریقہ پر حامی نہیں رہا بلکہ وہ اس جدید شعبہ کے نظریات میں اصلاح کی ضرورت کو بھی محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے مقالات میں اس شعبہ سے جڑے ہوئے ماہرین کو اپنی تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔

Dr. A.J. Marrow نے کرٹ لیون کی سوانح حیات کو مرتب کیا اور The Practical Theorist کے نام سے شائع کیا۔ اس نے کرٹ لیون کو ایک بہت ہی کامیاب دانشور اور عظیم نفسیات داں بتایا۔ اس نے کرٹ لیون کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا.....

”کرٹ لیون نہ صرف ایک صاحب فہم و فراست اور اپنی دانشوری کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، بلکہ وہ ساتھ ہی ایک خوش مزاج شخص بھی تھا اور اس

میں دُوروں سے ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔“

وہ ایک اچھا اور شفیق استاد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں کا ایک اچھا



دوست بھی تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتا تھا اور اُن کی ہمت افزائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ اکثر بغیر اطلاع دیے اپنے شاگردوں کے گھروں میں چلا جاتا تھا اور وہاں مختلف موضوعات پر نہ صرف اپنے شاگردوں سے گفتگو کرتا تھا، بلکہ وہ اس گفتگو میں اس کے والدین، ملنے والوں اور وہاں موجود دوستوں کو بھی شامل کر لیا کرتا تھا۔ اس طرح وہ ایک طرف اپنے شاگردوں سے قلبی رشتہ قائم کر لیا کرتا تھا، تو دوسری طرف گروہی ہم آہنگی کا گہرائی سے مطالعہ کر لیا کرتا تھا۔ اس طرح اس کو اچھے تجربات کا موقع ملتا تھا جن کے نتائج کو وہ اپنے نظریات میں استعمال کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کرٹ لیون نے سماجی نفسیات میں اہم کام انجام دیے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے امریکہ کی سماجی نفسیات میں جدید اصولوں کا قابل قدر اضافہ کیا جو آنے والے دور میں نفسیات کے طلباء کے لیے مفید ثابت ہوئے اور آج بھی اپنی اہمیت کی وجہ سے سماجی نفسیات کا ایک حصہ ہیں۔

کرٹ لیون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ناقدین کی نظر میں بھی نفسیات کے ایک معمار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے نفسیات پر بے شمار تجربات کیے اور اُن کے نتائج سے اس علم کو ایک نیا موڑ دیا۔ اُس نے برلن یونیورسٹی میں نفسیات پر جو کام کیا تھا، وہ اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کی ایک مثال ہے۔ اس کے خیالات اور طریقہ کار میں ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے وہ امریکہ میں اپنا ایک اہم مقام حاصل کر پایا۔ وہاں اس کے کام کو نہ صرف سراہا گیا، بلکہ اُس کو ایک صاف دل اور بناوٹ سے پاک نظریہ کار اور دانشور تسلیم کر لیا گیا۔ اس کا ایک اہم نظریہ، جس کو انگریزی میں Vector Feild Theory کہتے ہیں، کافی مقبول ہوا۔ اس نظریہ سے اس کا مطلب تھا کہ ہر فرد کے سامنے ایک نفسیاتی میدان ہوتا ہے جس کو زندگی کا میدان Life Space یا ذاتی میدان Personal Feild بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک جگہ اس نے اسی مفہوم کے لئے Behavioural Feild کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دراصل اس نے Vector کا لفظ اس کے لفظی معنی کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا بلکہ اس سے اس کا مطلب قوتِ عمل



کے میدان سے تھا اور اسی مفہوم کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔ کرٹ لیون کے مطابق فرد کے کردار کا انحصار دو توانائیوں پر ہوتا ہے۔ ایک توانائی اس کو عمل کرنے پر اکساتی ہے اور دوسری توانائی اس کو عمل سے باز رکھنے پر زور دیتی ہے۔ یہ میدان ہر فرد کی حقیقت ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہمارا ہر فعل ہمارے ادراک کا تابع ہوتا ہے اور ہر فعل کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ادراک کیا ہے اور کیسا ہے؟

اس طرح یہ حقیقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ اگر دو افراد ایک جیسے ماحول میں ہوں اور ان کو ایک جیسے حالات کا سامنا ہو تو دونوں افراد کے کردار بھی ایک جیسے ہوں گے، یہ کوئی ضروری نہیں۔ نہ صرف یہ کہ دونوں کے کردار مختلف ہوں گے، بلکہ اُن کے رویوں میں بھی مماثلت کا ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالانکہ دونوں افراد ایک ہی ماحول میں ہیں اور ایک جیسے حالات کا سامنا کر رہے ہیں، لیکن دونوں نے ان حالات کا مطلب مختلف انداز میں لیا ہے یا پھر دونوں کے ادراک میں فرق ہے۔ کرٹ لیون نے کہا کہ افراد اپنے ماحول کے اثرات سے اپنی اپنی سوچ کو ڈھال لیتے ہیں اور ان کی سوچ کے مطابق ان کے کردار تشکیل پاتے ہیں۔

کرٹ لیون نے اپنے تجربات کے دوران گروہی مباحث کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران یہ ضروری سمجھا گیا کہ لوگ اپنی غذائی ضروریات میں تبدیلیاں لائیں اور اپنی غذائی عادات کو حالات کے مطابق ڈھال لیں، کیونکہ جو غذائیں وہ استعمال کرتے رہے ہیں، وہ اس وقت آسانی سے دستیاب نہیں تھیں اور جو آسانی سے مل جاتی تھیں۔ لوگوں کو ان کی عادت نہیں تھی۔ اس مسئلہ پر کرٹ لیون نے کافی توجہ دی اور نفسیاتی طریقہ کار کو اپناتے ہوئے لوگوں پر زور دیا کہ وہ اپنی غذائی عادات کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اس نے گروہی مباحث کا طریقہ اپنایا۔ اس مقصد کے لیے اس نے دو گروپ تشکیل دیے۔ ایک گروپ کو محض بیانات کے ذریعہ اس ضرورت کی اہمیت سے واقف کرایا اور دوسرے گروپ کو اس مسئلہ سے متعلق ایک موضوع دے کر آپس میں گفتگو اور بحث و مباحث کے طریقہ کار کو اپنا کر اس مسئلہ پر



روشنی ڈالنے کے لیے کہا۔ جب نتیجہ دیکھا گیا تو پہلے گروپ کے صرف ۷ فیصدی افراد نے اپنی عادات کو بدلنے کا فیصلہ کیا لیکن دوسرے گروپ کے ۵۲ فیصدی افراد نے اپنی غذائی ضروریات میں تبدیلی لانے کے لیے رضامندی کا اظہار کیا۔ حالانکہ یہ بات کوئی اتنی اہم نہیں تھی لیکن اس نے اس مسئلہ پر زور دیا کہ انسان کی غذائی عادات کا دار و مدار اس بات پر نہیں کہ اس کے آبا و اجداد کیا کھاتے تھے، بلکہ اس بات پر ہے کہ ماحول میں کون سی غذا آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اس نے گھر کی خواتین کو بھی اس مسئلہ میں شامل کر لیا اور ان پر زور دیا کہ وہ جنگ عظیم کی حالت میں آنے والی دشواریوں کے پیش نظر اپنی غذا میں بدلاؤ لائیں۔ کرٹ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا اور اس طرح اس نے ثابت کر دیا کہ جو مسائل سماج سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کو سماج کے افراد میں آپس میں بحث و مباحث کے ذریعہ آسانی سے سلجھایا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے اپنی کتاب *Dynamic Theory of Personality* میں بیان کیا ہے کہ بعض وقت محرکات میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ٹکراؤ کئی قسم کا ہو سکتا ہے۔ اس نے ایسے ٹکراؤ کی تین قسمیں طے کی ہیں.....

(الف) رغبت گریز کشاکش (Approach-Avoidance Conflict): اس سے اس کا مطلب اُس کیفیت سے تھا جب فرد کے سامنے دو محرکات ہوں اور اس کو ایسے حالات کا سامنا ہو کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی ذات کے لئے مناسب سمجھے اور دوسرے کو اپنے مفاد کے خلاف۔ لیکن دونوں ہی اُس کے لئے ضروری ہوں تو وہ ایک کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کے سامنے دو محرکات ہوں اور دونوں ہی اُس کے مفاد کا باعث ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ایک کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ ان میں سے کون سا راستہ اپنائے۔ اس کیفیت کو کرٹ لیون نے رغبت رغبت کشاکش (Approach-Approach Conflict) کا نام دیا ہے۔

(ج) تیسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ فرد کو بعض وقت دو ایسے محرکات سے واسطہ پڑ سکتا



ہے جو اس کے سامنے ایسی صورت پیدا کریں کہ دونوں ہی راستے اس کے مفاد کے خلاف ہوں، لیکن دونوں ہی ضروری ہوں تو فرد ایک کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کو وہ گریز گریز کشمکش کا نام دیتا ہے یعنی Avoidance - (Avoidance Conflict)۔

کرٹ لیون نے مقامی یونیورسٹی کے جرنل کے لیے بہت سے مقالات لکھے تھے۔ اُن مقالات کو چار جلدوں میں شائع کیا گیا۔ پہلی جلد ۱۹۳۵ء میں A Dynamic Personality کے نام سے، ایک سال بعد ہی دوسری جلد ۱۹۳۶ء میں The Principles of Topological Psychology کے نام سے، تیسری جلد ۱۹۴۸ء میں Resolving Social Conflicts کے نام سے اور چوتھی ۱۹۵۱ء میں Feild Theory of Social Science کے نام سے شائع کی گئی۔ جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے، بعد کی دو کتابیں سماجی نفسیات میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں اور اس لیے یہ بجا طور سے کہا جاسکتا ہے کہ کرٹ لیون اپنی عمر کے آخری دور میں تشکیلی نفسیات سے دُور ہوتا گیا اور اس نے اپنی تمام تر توجہ سماجی نفسیات کی جانب مبذول کر دی۔

کرٹ لیون نے کبھی نفسیات کا کوئی ایسا نظام پیش نہیں کیا جو اپنی سلیبت کے ساتھ اس کے نام سے منسوب کیا جاسکے۔ حالانکہ جب وہ اپنے نظریہ کرداری میدان پر کام شروع کرنے سے پہلے بھی اس نے بہت سے نفسیات مسائل پر تجرباتی اور نظریاتی طریقہ پر کام کیا۔ لیکن اس نے اپنے تجربات کے نتائج کو ایک منظم نظریہ کی شکل میں پیش نہیں کیا۔ یہی خیال W.K. Estes نے ۱۹۵۴ء میں اپنی ایک کتاب The Modern Learning Theory میں پیش کیا تھا وہ لکھتا ہے کہ.....

”کرٹ لیون نے جو تجربات کئے ان کے نتائج کی بنیاد پر وہ کوئی منظم نفسیاتی طریقہ کو پیش نہیں کر سکا۔ اس نے قابل آزمائش کی صلاحیت کی قیمت پر اپنے نظریات میں لچک اور نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔“



حقیقت یہ ہے کہ کرٹ کا جو کام سب سے اہم تسلیم کیا جاتا ہے وہ سماجی نفسیات میں Vector Feild Theory میں پیش کیا گیا ہے، جس کے بارے میں اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے ذریعہ اس نے نفسیات میں ایک جدید نظریہ پیش کیا۔ اس نے علم ہندسہ کے اصولوں کا اطلاق نفسیات میں کیا اور فرد کے رویوں اور برتاؤ سے متعلق تحقیق و تجربات میں اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے اس نظریہ پر کام اس وقت شروع کیا تھا جب وہ برلن میں تھا۔ لیکن اس کو پایہ تکمیل کو امریکہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد پہنچایا، جہاں اس کو مناسب سہولتیں میسر تھیں۔ وہاں دانشوروں کا ایک طبقہ موجود تھا جہاں نفسیاتی مسائل پر بحث و مباحث کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

Vector Feild Theory کا استعمال اس نے شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے کیا۔ اس کی تحقیق کی ابتدا فرد کے محرکاتی مسائل اور سماج پر ان کے اثرات جیسے موضوع سے ہوئی۔ جیسے جیسے وہ اس مسئلہ پر سوچتا رہا، اس کے لئے نئے نئے باب کھلتے رہے اور اس نے اس نظریہ کا استعمال شخصیت کی تنظیم سے متعلق مسائل میں بھی کیا۔ اس نے اسی سلسلہ میں سائنس کے ایک شعبہ Topology کا استعمال بھی کیا۔ سائنس کے اس شعبہ کے تحت مکانی ماہیت میں بدلاؤ اور Vector Analysis پر بحث کی جاتی ہے۔ اس طرح اس سائنس کے ذریعہ کسی مقام کا مکانی تعلق اس احاطہ سے کیا جاتا ہے جس میں وہ واقع ہے۔ نفسیات میں یہ خیال بالکل نیا تھا، اس لیے اس جدید نظریہ کو Topological Psychology کا نام دے کر اسے کرٹ لیون سے منسوب کر دیا گیا۔ کرٹ لیون نے یہ نظریہ پیش کرتے ہوئے علم ہندسہ کا سہارا لیا ہے اور ریاضی کے اصولوں کا اطلاق کر کے انسانی کردار کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انسانی کردار کو اس کے ارد گرد کے حالات کی روشنی میں ریاضی کے اصولوں کا استعمال کر کے بہتر طریقہ پر سمجھایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے ہمعصر مفکرین کے خیال میں نفسیات میں علم ریاضی کے اصولوں کا اطلاق کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔ ان کے خیال میں اس طرح اس نظریہ کو سمجھنے میں وقت



محسوس کی جائے گی۔ اس لیے کرٹ لیون نے اسی نظریہ کو ایک نیا نام دیا اور اس نے اس کے لیے Hodology کی اصطلاح استعمال کی۔

کرٹ لیون بعض غیر اہم نکات پر اظہار خیال کر کے بہت اہم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر افراد میں تناؤ کی حالت کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ اگر کسی فرد کو کوئی کام دے دیا جائے تو اس کو مکمل کرنے کے لیے وہ ایک تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ تناؤ ہی اس کی توانائی ہوتا ہے۔ جب تک وہ کام مکمل نہیں ہوتا، وہ تناؤ کی حالت میں رہتا ہے اور کام مکمل ہو جانے کے ساتھ ہی وہ استرخائی کیفیت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی حال اُن بچوں کا بھی ہوتا ہے جو کسی Puzzle کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک بچہ جب کسی معمہ کو لے کر بیٹھتا ہے تو جب تک اُس کو حل نہیں کر لیتا، وہ ایک تناؤ کے تحت رہتا ہے۔ اگر وہ تناؤ اُس کو تکلیف دینے لگتا ہے تو اس معمہ کو الگ کر کے دوسری جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ اُس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ حرکیاتی طور پر ایٹلاف کی حیثیت زنجیر کی ایک کڑی جیسی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ اجتہاد کی خاصیت کو ہم ایک قسم کی کشاکش یا تناؤ کی کیفیت سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اگر ہمیں کشاکش یا تناؤ سے نجات حاصل کرنا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنی ضرورت یا حاجت کو پورا کرنے کی کوشش کریں تاکہ تناؤ سے چھٹکارہ مل جائے۔ اس کے بعد جو آسودگی حاصل ہوتی ہے وہی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔

اس کے خیال میں ہر جدوجہد کا انجام تسکین ہونا چاہئے۔ اس موضوع پر مزید تحقیق و تجربات کے لیے کئی مشہور دانشور اور مفکر اس کے ساتھ ہو لیے اور انہوں نے اس کی رہنمائی میں تجربات کیے اور اپنے اپنے طریقوں پر ان کے نتائج نکالے۔ تناؤ سے متعلق اس کا یہ نظریہ اُس وقت اور زیادہ قوی ہو گیا جب اُس کی ایک شاگرد Zeigarnik نے اس موضوع پر کرٹ لیون کی رہنمائی میں تحقیق کی۔ کرٹ نے اپنی اس شاگرد کی تحقیق میں تناؤ کے ساتھ ساتھ مزید تجربات کئے جن سے مفید نتائج برآمد کیے گئے۔ اس نے ان مظاہر کی دریافت کو اپنی اس شاگرد سے منسوب کیا اور انہیں



جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ وہ غیر اہم مسائل کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا تھا اور ان پر نفسیاتی طریقہ سے غور کرتا تھا۔ اس کے اندر ایسی صلاحیت تھی کہ جن باتوں کو ایک عام انسان نظر انداز کر دیتا تھا، کرٹ اُن پر باریکی سے دھیان دیتا تھا، اُن کا بغور مشاہدہ کرتا تھا اور ان کی وجہ تسمیہ جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ بعض وقت اس کی اس صلاحیت سے اس کے ساتھی متعجب ہو جاتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ کرٹ پر ہمیشہ نفسیات سوار رہتی تھی اور وہ ہر بات کو اسی پہلو سے جانچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے دوست اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ ایک حقیر سی بات سے ایک اہم مطلب نکال لینا اور پھر اس کو نفسیات کے اصولوں کا ایک حصہ بنا لینا کرٹ لیون کا ہی کام تھا۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ وہ ایک دن برلن میں ایک ریستوران میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہاں وہ ویٹر کے کردار کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ویٹر کو ریستوران میں آنے والے ہر گاہک کے بل کی رقم یاد رہتی ہے، لیکن صرف اس وقت تک جب تک وہ رقم ادا نہ کر دے۔ رقم ادا کرنے کے بعد اس گاہک کا ریستوران سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور ساتھ ہی ویٹر سے بھی۔ اس لیے یہ تعلق ٹوٹتے ہی اس سے متعلق کسی بات کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

حالانکہ کرٹ لیون کا نام تشکیلی نفسیات کے بانیوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے، لیکن اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں سماجی نفسیات کے فروغ کے لیے زیادہ کام کیا۔ اس نے نفسیات کے اس اہم شعبہ کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں، انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ تشکیلی نفسیات سے توجہ ہٹا کر سماجی نفسیات کی طرف رخ کرنے کے پس پشت کیا راز تھا، یہ جاننے کے لیے مفکرین نے اس کی موت کے بعد کوشش جاری رکھی اور جب اس کی زندگی کے حالات کا بغور مطالعہ کیا تو یہ معلوم ہوا کہ وہ ذاتی طور پر سماجی نفسیات کے مسائل سے لگاؤ رکھتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود جرمنی کی فوج میں شامل تھا اور پانچ سال تک فوجی زندگی گزارنے کے دوران اس نے



جنگ کی ہولناکیوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ لیکن اس کا صلہ اُس کو کیا ملا؟ دوسری جنگ عظیم کے دوران اُس کے خاندان کو نازیوں کے ظلم اور تشدد کا شکار ہونا پڑا اور خود اس کی ماں کی موت نازیوں کے ظلم اور جبر کی وجہ سے ہوئی۔ ظاہر ہے یہ سب واقعات اس کے ذہن میں ایک انقلاب برپا کرنے لیے کافی تھے۔

نفسیات کے ماہرین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کرٹ لیون نے ابتداء میں جن نظریات کا ذکر کیا ہے، اُن پر تحقیق و تجربات کا سلسلہ اُس کی موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تشکیلی نفسیات سے اس کی توجہ ہٹ کر سماجی نفسیات کی جانب ہو گئی تھی۔ اگر وہ تشکیلی نفسیات سے ہی مربوط رہتا تو تشکیلی نفسیات کی اہمیت ختم ہو جانے کے ساتھ ہی اُس کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی۔ لیکن سماجی نفسیات سے متعلق نظریات اور اصولوں پر کام کرنے کی وجہ سے اُس کا نام آج بھی زندہ ہے اور سماجی نفسیات کے طلباء کے لیے کرٹ لیون کی خدمات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کرٹ لیون اُن چند ایسے دانشوروں میں شمار کیا جاتا ہے جو اپنے زمانہ سے بہت آگے چلتے ہیں اور مستقبل کی نشاندہی پہلے ہی کر لیتے ہیں۔

〇〇



# گورڈن آلپورٹ

GORDON ALLPORT (1897-1967)

۱۹۱۹ء کی بات ہے کہ ایک ۲۲ برس کا لڑکا بڑی کوشش کے بعد سگمنڈ فرائڈ سے ملاقات کا وقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ فرائڈ کے دفتر میں پہنچ تو گیا، لیکن وہاں جا کر وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بات کرے یا بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر وہ بول اٹھا کہ..... ”جب میں یہاں آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ٹرین میں ایک چھوٹا لڑکا اُس جگہ بیٹھنے کے لئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا جہاں سے ایک شخص گندے سے کپڑے پہنے ہوئے اٹھ کر گیا تھا۔“

فرائڈ نے اُس کو غور سے دیکھا اور کہا کہ ”اور وہ چھوٹے لڑکے تھے۔“  
آنے والا نوجوان حیران ہو گیا کہ فرائڈ کو یہ کیسے معلوم ہوا کیونکہ وہ خود یہ سوچ رہا تھا کہ فرائڈ سے اپنا تعارف کراتے وقت یہ ضرور کہے گا کہ اس کی ماں بہت نفاست پسند تھی اور وہ اپنی ماں کی اس صفت سے بہت متاثر ہوا تھا۔

فرائڈ سے ملنے کے لئے آنے والا نوجوان کوئی اور نہیں، بلکہ گورڈن آلپورٹ (Gordan Allport) تھا، جس نے فرائڈ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ اس سے ملنے کا بہت شوق رکھتا تھا۔ اس پہلی ہی ملاقات نے آلپورٹ پر گہرے نقوش چھوڑے تھے اور وہ اس کی قابلیت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس نے پہلی بار یہ سمجھا کہ فرائڈ کی نظر کتنی گہرائی تک جاسکتی ہے اور لاشعوری کیفیت کے مطالعہ میں اس کو



کتنی مہارت حاصل ہے۔

آپورٹ ایک مشہور ماہر نفسیات تھا، جس نے اس علم کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ آپورٹ ۱۱ نومبر ۱۸۹۷ء کو Montezuma نام کے شہر میں پیدا ہوا، جو انڈیانا میں واقع ہے۔ گورڈن اپنے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کا باپ ایڈورڈ آپورٹ اسی شہر میں ڈاکٹر تھا اور اس کی ماں ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ مقامی اسکول میں تعلیم پوری کرنے کے بعد وہ ہاورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا اور وہیں سے نفسیات میں گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ہاورڈ سے ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

گورڈن آپورٹ نے زندگی بھر نفسیات کی خدمات انجام دیں اور اپنا زیادہ وقت اپنے نظریات کی نشوونما میں صرف کیا۔ آپورٹ کے کئی نظریات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کی بہت سی تخلیقات میں سب سے زیادہ اہم تخلیق The Nature of Prejudice تسلیم کی جاتی ہے۔ ہم علم النفس کے لئے اس کی خدمات کا اگر یکے بعد دیگرے بیان کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اُس کی اس کوشش کا ذکر کرنا چاہئے جس کے ذریعہ اُس نے شخصیت کے خصائص کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کیا۔ اُس نے آکسفورڈ ڈکشنری کے ہر لفظ کا جائزہ لیا اور اس میں سے تقریباً تین ہزار ایسے الفاظ نکالے جو فرد کی شخصیت کی کسی نہ کسی خصوصیت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اُس نے ان الفاظ کی بنیاد پر شخصیت کے خصائص کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصہ کو اس نے Cardinal Traits یعنی بنیادی خصائص کہا اور اس کے تحت اُن خصوصیات کو شامل کیا جو فرد کے کردار کے تعلق سے ہوتی ہیں۔ دوسرے حصہ کو اس نے Central Traits یعنی مرکزی خصائص کا نام دیا۔ ان سے اُس کا مطلب اُن خصائص سے تھا جو ہر شخص میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ لیکن شخصیت کی پہچان کے لیے وہ کتنے کم یا زیادہ ہوتے ہیں، اس پر انحصار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایمانداری یا سچ بولنے کی عادت وغیرہ۔ تیسرے نمبر پر اس نے ثانوی خصائص یعنی Secondary Traits کو رکھا اور ان سے اس کا مطلب ان خصوصیات سے تھا جو فرد میں بعض مخصوص حالت میں پیدا



ہو جاتی ہیں اور بعض اس کی اپنی شخصیت کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس میں پسند اور ناپسندیدگی بھی شامل ہے۔

شخصیت کے اس نظریہ کو اس نے تفصیل سے بیان کر کے ایک مقالہ لکھا جس کا

عنوان تھا : An Experimental Study of the Traits of Personality

With Special Reference to the Problems of Social

Diagnosis اور اسی مقالہ پر اس کو ہارڈ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے

نوازا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء تک اس نے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور یہ دورہ اس کو خاص طور

سے ملنے والی اسکالرشپ کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اس سفر کے دوران اس نے جرمنی میں

کچھ عرصہ قیام کیا اور کچھ وقت کیمبرج یونیورسٹی میں۔ جرمنی کے قیام کے دوران وہ

اپنے زمانہ کے مشہور دانشوروں سے ملا اور ساتھ ہی اس نے ورتھائمر اور کوہلر جیسے

مفکرین سے تبادلہ خیالات کیا۔ ان مفکرین سے ملاقات کے بعد ہی اس نے کیسٹلٹ

نفسیات میں دلچسپی دکھائی۔ جرمنی سے وہ برطانیہ چلا گیا جہاں اس نے دو سال

گزارے اور وہاں بھی اس زمانہ کے مشاہیر سے تبادلہ خیالات کی اور بہت سے

نفسیاتی مسائل پر گفتگو کی۔ اس دورہ سے اس کو نفسیات کے لیے کافی مواد ملا جو اس کی

تحلیقات کے لیے مفید ثابت ہوا۔

۱۹۲۵ء میں اس نے Ada Lufkin سے شادی کر لی جو خود نفسیات سے تعلق

رکھتی تھی اور مرضیاتی نفسیات میں تربیت یافتہ تھی اور پریکٹس کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ

ہارڈ یونیورسٹی میں واپس آ گیا اور وہاں ایک کورس کی ابتداء کی، جس کو Personality

Its Psychological & Social Aspects : کا نام دیا۔ یہ اپنی طرز کا پہلا

کورس تھا جو امریکہ میں شروع کیا گیا تھا۔ اس لیے اس کو کافی مقبولیت ملی۔ اس

سلسلہ میں اس نے ایک ایسے شخص کا بغیر نام لیے ذکر کیا ہے جس سے کو وہ بشرنواز

کہتا ہے اور جو فلاح انسانیت کی تحریک سے جڑا ہوا تھا۔ اس شخص سے مل کر آپورٹ

بہت متاثر ہوا اور اس نے لکھا کہ یہ اس شخص سے ملاقات کا اثر ہے کہ..... ”میں ہر



فرد میں اپنے آپ کو پاتا ہوں۔“

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک اُس نے سماجی نفسیات اور شخصیات پر زیادہ توجہ دی اور اُن ہی مضامین میں اُس نے تعلیم دی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد وہ مستقل طور پر ہاورڈ یونیورسٹی سے جڑ گیا اور مختلف مضامین کے پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم دیتا رہا۔ وہ خود کہتا ہے کہ میری زندگی کے یہ ۳۷ سال بڑے اہم ہیں کیونکہ ایک طرف وہ تعلیم دیتا تھا تو دوسری طرف دُنیا کے مشاہیر سے رابطہ قائم کیے رہتا تھا اور اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے دوسری جنگ عظیم میں نفسیاتی ایمرجنسی کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس طرح اس کا واسطہ جنگجو جوانوں سے بھی پڑا اور جنگی قیدیوں سے بھی اور اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ ان کے معاملات پر نفسیات کا اطلاق کیا۔ اس نے اس دوران کئی تحقیقی کام کئے۔ تعصب اور گروہی تصادم کے نفسیاتی وجوہات اور ان کے معاشرہ پر اثرات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ جب وہ ہارورڈ میں تھا تو دس سال تک نفسیات کے شعبہ کے صدر کی حیثیت سے بھی کام کیا اور غیر طبعی نفسیات اور سماجی نفسیات کے جرنل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اس نے ہاورڈ میں رہتے ہوئے ایک اہم تخلیق *Personality : A Psychological Interpretation* کے عنوان سے شائع کی۔ ۱۹۴۶ء میں ہاورڈ یونیورسٹی میں سماجی رشتوں سے متعلق شعبہ کی نئے سرے سے تنظیم کی اور یہ شعبہ آگے چل کر ہاورڈ یونیورسٹی کا ایک بہت ہی مقبول شعبہ تسلیم کیا جانے لگا۔

۱۹۵۴ء میں *Nature of Prejudice* شائع کی جو بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں اس نے تین سو خطوط پر مشتمل ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا *Letters from Janny*۔ یہ خط ایک خاتون نے لکھے تھے جن میں شخصیت کے تعلق سے بہت مفید بحث کی گئی تھی اور ایسے مقالے بھی تھے جو مختلف موقعوں پر سیمینار میں پیش کیے گئے تھے۔ ۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو کیمبرج میں یہ عظیم مفکر پھیپڑے کے کینسر میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔



جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، گورڈن آپورٹ فرائڈ سے پہلی ہی ملاقات میں متاثر ہو گیا تھا اور ساتھ ہی وہ اس کے مفروضات کو تسلیم بھی کرتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو فرائڈ کے نظریات میں قید کر کے نہیں رکھا تھا بلکہ اس نے نفسیات کا ایک مکمل علم کی حیثیت سے مطالعہ کیا، اور نہ ہی اس نے اپنے آپ کو فرائڈ کا ساتھی یا شاگرد کہلوا یا۔ وہ اس سلسلہ میں کافی محتاط تھا اور اس نے اپنے آپ کو فرائڈ کے مخالفین یا اس کے حامیوں میں شمار کیے جانے سے بھی پرہیز کیا۔ اس نے خود کئی ایسے موضوعات کو اہمیت دی جو براہ راست عوام سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً تعصب اور جانبداری کی نفسیاتی اہمیت، افواہیں اور ان کے اثرات، شخصیت کی تعمیر وغیرہ۔

شخصیت کے بارے میں اس کے خیالات پہلے بیان کر دیے گئے ہیں، تعصب کے تعلق سے اس نے جب *Nature of Prejudice* لکھی تو نفسیاتی حلقوں میں اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد اُس کی دوسری تخلیق *Psychology of Rumors* بھی عام لوگوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے وہ بھی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اُس نے اس موضوع پر اپنے ایک ساتھی ماہر نفسیات *Leo Postaman* کے ساتھ تحقیقات کیں اور بہت جلد اُن دونوں کی تحقیقات کے نتائج مقبول ہونا شروع ہو گئے۔ حکومت نے بھی اُن سے استفادہ کیا اور اُس کے خیالات کو نصابی کتابوں میں شامل کیا گیا۔ گورڈن آپورٹ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے پہلی بار *Motive* یعنی محرک اور *Drive* یعنی قوت محرکہ کے فرق کو واضح کیا۔ اس نے لکھا کہ قوت محرکہ ایک محرک کا ردِ عمل ہو سکتی ہے، اس لیے دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ اس نے ایک ایسے شخص کی مثال دی جو ایک کام مکمل کرنے کے لیے اپنی مہارت کا استعمال کرتا ہے، اس لئے نہیں کہ وہ بچپن میں یہی کام مکمل کرنے میں ناکام تھا بلکہ اس لئے کہ اب اس کام کی تکمیل اس کی ضرورت بن گئی ہے۔ اس نے کہا کہ نشوونما کے دوران آموزش فرد کے اندر ایک نئی صلاحیتوں کو پیدا کرنے کا باعث ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک ذریعہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکے۔



اس نے ۱۹۵۰ء میں ایک اور اہم تخلیق پیش کی جس کا نام تھا The Individual & His Religion۔ اس کتاب میں اس نے مذہب کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے کہ کس طرح فرد مذہب یا عقیدہ کا استعمال کرتا ہے اور کس طرح اپنے عقائد کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس نے لکھا کہ مذہبی اصولوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ مذہبی اصول پہلے پہلے ہمارے ذہن میں پختگی کے ساتھ قائم نہیں رہتے بلکہ ہم ان کی پابندی عادتاً کرتے ہیں۔ لیکن فرد جب اپنے عقائد کو ایک تحریک کی شکل میں استعمال کرتا ہے تو وہ اُن اصولوں کا اپنی روزانہ زندگی میں اطلاق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب کا استعمال صحیح معنوں میں اس وقت مفید ہوتا ہے جب اس سلسلہ میں کھلے ذہن سے مذہب کی بنیادی خصوصیات کا استعمال کیا جائے۔ اگر ہم مذہبی معاملات میں جذبات سے کام لے کر اور حقیقت سے گریز کرتے ہوئے کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو وہ منفی خصوصیات کا حامل ہوگا، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ڈاکٹر بوری (Dr. C. George Boeree) آپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی اس تھیوری کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے جو اُس نے شخصیت کے ارتقاء کے تعلق سے پیش کی تھی۔ حالانکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تھیوری میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی تھی، پھر بھی اس نے اپنے نظریہ کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کیا تھا۔ آپورٹ کا خیال تھا کہ فرد کی ذات کا ارتقاء مختلف مرحلوں میں ہوتا ہے اور ہر مرحلہ کو وہ ایک فریضہ یا تفاعل کی شکل میں دیکھتا ہے۔ یعنی ایک خاص عمر میں پہنچنے کے بعد ہر مرحلہ کے لیے جو کام طے کر دیا گیا ہے وہ ہر حالت میں انجام دیا جائے گا۔

مثال کے طور پر سب سے پہلے احساس جسم (Sense of Body) پیدا ہوتا ہے، اور یہ عمر کے پہلے دو سالوں میں ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ جب بچہ اپنے وجود کو محسوس کرنے لگتا ہے اور اس میں احساس لمس پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی جسم کے مختلف اعضاء کے وظائف کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتا ہے اور ان کا استعمال کرتا ہے، ساتھ ہی اس میں اپنی حفاظت کی ضرورت کا احساس بھی بڑھ جاتا ہے۔ اپنی عمر کے پہلے دو



سالوں میں احساس جسم کے ساتھ ساتھ مختص بالذات یعنی Self Identity کی خصوصیت بھی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اس عمر کے بعد ہی فرد میں ماضی، حال اور مستقبل کی پہچان کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس عمر میں ہم اپنی ذات کو دوسروں سے الگ رکھ کر سوچنے لگتے ہیں اور یہ احساس جاگنے لگتا ہے کہ جو میں آج ہوں، وہی کل بھی رہوں گا۔ اس عمر میں انسان اپنی ذات کے تعلق سے تجربات میں دلچسپی رکھتا ہے اور اپنی ذات کی حفاظت میں زیادہ دلچسپی لینے لگتا ہے۔

اس کے خیال میں دو سے چار سال کی عمر میں انسان میں Self Esteem کا دور شروع ہو جاتا ہے اور خودداری یا خود بینی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اسی عمر میں ہمارے اندر ذات کی اقدار کی پہچان قائم ہوتی ہے اور ساتھ ہی دوسروں کی قدر بھی پہچاننے لگتے ہیں۔ اس عمر کا بچہ یہ جاننے لگتا ہے کہ جو بات مجھے ناگوار گزرتی ہے، وہی دوسروں کو بھی ناگوار معلوم ہوگی۔ بچے میں خود توسیع Self Extension کی خاصیت چار سال کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عمر کے بعد فرد کو احساس ہونے لگتا ہے کہ اپنے آپ کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے کچھ اور بھی لوازمات ہیں۔ اس عمر میں ہم اپنے آپ کو اپنے ماحول سے ربط اور دوسروں کے رشتوں سے پہچاننے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کسی نئے آدمی سے اپنا تعارف کراتے ہیں تو اپنے والدین اور اپنے خاندان کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی عمر میں اچھے بُرے کی پہچان قائم ہو جاتی ہے اور ہمیں کوئی نہ بتائے تب بھی بُرے کام کو بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بچے سے یہ نہ کہا جائے کہ کسی اور کو پتھر مارنا بُرا کام ہے، تب بھی وہ یہ جان جاتا ہے کہ یہ کام غلط ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھے بُرے کی پہچان اسی عمر میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد کے مرحلہ کو وہ تصور ذات Self Image کہتا ہے۔ یہ بھی چار سے چھ سال کی عمر میں پروان چڑھتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ فرد اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے جب فرد اپنے آپ کو ایک مثالی فرد بنانے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔



چونکہ اس مرحلہ کے لیے اُس نے Me, as other see me کے فقرہ کا استعمال کیا ہے، اس لیے اُس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اپنی ذات کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے دوسروں کی رائے اس کے لیے اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ کوئی نہیں چاہتا کہ دوسرے اُس کے بارے میں غلط رائے قائم کریں۔ اس کے بعد کا مرحلہ جو پروان چڑھتا ہے، اُس کو وہ Rational Coping کہتا ہے اور اس دور میں عام طور سے فرد میں وہ صلاحیتیں پرورش پاتی ہیں جو دنیا کے ساتھ چلنے میں اُس کی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ عقلی طور پر دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرنا اور ان کی خواہشات کی تکمیل کی کوشش کرنا انسان کی شخصیت کی تعمیر میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اور آخری دور کو وہ کہتا ہے کہ یہ بارہ سال کی عمر کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور ایک طویل عرصہ تک فرد کے ساتھ رہتا ہے۔ اس دور میں فرد اپنی شخصیت کو دنیا کی ضروریات کے حساب سے موزوں بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے اُس نے کہا ہے کہ یہ وہ حصہ ہوتا ہے جب فرد یہ سوچتا ہے کہ ”میں اپنی زندگی کا مالک ہوں۔“ اور اس کو اپنی زندگی اپنی ملکیت ہونے کا احساس ہی اس میں زندگی کو بنانے سنوارنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ایرکسن نے بھی شخصیت کی تعمیر کے سلسلہ میں کچھ مراحل طے کیے تھے، لیکن آپورٹ کے مراحل اس سلسلہ میں کافی حد تک مختلف ہیں۔ آپورٹ دراصل فرد کی نشائی خصوصیات کو نفسیات نمو کے اصولوں کے طرز پر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آپورٹ نے ایک اصطلاح وضع کی تھی The Proprium جسے ہم اردو میں ”عمومی اوصاف“ کہہ سکتے ہیں۔ اس سے اُس کا مطلب فرد کے مزاج یا افتادِ طبع سے تھا۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ جب ہم کسی فرد کی شخصیت کے خصائص کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم اُس کی شخصیت کی پیمائش کر رہے ہیں۔ لیکن جب عمومی اوصاف کا استعمال کرتے ہیں تو اُن سے شخصیت کی پیمائش نہیں ہو سکتی بلکہ اُن سے شخصیت کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اس سے اس کا مطلب فرد کے ادراک، عقائد



اور احساسات سے ہے اور یہ ہر حالت میں مختلف افراد میں الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں اس قسم کے اوصاف اس کی ذات تک ہی محدود ہوتے ہیں اور اُس کی شخصیت کی پہچان اس وقت بنتے ہیں جب وہ دوسرے لوگوں میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن یہ عام طور سے ظاہر نہیں ہوتے جب تک فرد خود ان کا اظہار نہ کرے، اور یہ اظہار ہمارے کردار اور برتاؤ کے ذریعہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں بیان کیا گیا ہے کہ اس نے انسان میں ابتدائی اور ثانوی خصوصیات الگ الگ کر دی تھیں۔

آپورٹ کا ایک اور نظریہ نفسیاتی پختگی کے تعلق سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس فرد میں ذاتی اوصاف عمدہ ہیں تو اس میں نفسیاتی طور پر پختگی آ جاتی ہے اور اس کو بھی اس نے سات حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے کو وہ ذات کی توسیع کہتا ہے، جس کی وجہ سے فرد مختلف معاملات میں ملوث ہونے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ دوسرے کو وہ خلوص سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرد اپنے پُر خلوص رشتہ سے دوسرے افراد میں قدر و منزلت کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ تیسرے کو وہ جذباتی تحفظ کہتا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی ذات کا تحفظ کرتا ہے۔ چوتھے کو وہ حقیقت پسندی کہتا ہے اور پانچویں کو وہ ایسی خصوصیت بتاتا ہے جس کی وجہ سے فرد میں مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چھٹے کو خود اپنی ذات کے اندر جھانکنے کی صلاحیت کہتا ہے اور ساتویں کو وہ زندگی کے فلسفے کو سمجھ کر زندگی بہتر طرز پر گزارنے کی صلاحیت کا نام دیتا ہے۔

حالانکہ ایرک ایرکسن نے بھی شخصیت کے خصائص کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے، لیکن آپورٹ نے خاص طور پر ایسے خصائص کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے جو نفسیات نمو سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی وجہ سے فرد کی اپنی ذات کے نشوونما کی پیمائش ہوتی ہے۔ یہ وہ خصائص ہیں جو فرد میں اُس کی ذات کی پہچان تو بنتے ہیں، لیکن یہ اس کی ذات کے ان خصائص کی حد تک ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان میں خود اپنی ذات کے بارے میں واقفیت حاصل کرتا ہے۔

آپورٹ کے نظریات نے نفسیات میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے اور وہ اپنے



نظریات کی وجہ سے ہمیشہ اپنا وہ مقام قائم رکھے گا، اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ اس نے فرد کی ذات کی اس کے وظائف کے لحاظ سے جو تقسیم کی ہے، وہ بھی خاص ہے۔ مثلاً وہ ایک کو نظریاتی کہتا ہے۔ جیسے ایک سائنسداں کی نظر میں حقیقت کی قدر ہوتی ہے، دوسرے کو وہ معاشی کہتا ہے جیسے ایک تاجر کسی بھی چیز کی افادیت کو اہمیت دیتا ہے۔ کوئی جمالیات کا دلدادہ ہے تو وہ خوبصورتی کی قدر کرتا ہے، سماجی فلاحی کاموں میں مصروف ایک فرد عوام کی فلاح کا خیال رکھتا ہے، سیاست سے تعلق رکھنے والے فرد کی نظر میں اقتدار کی اہمیت ہوتی ہے اور مذہبی رہنما اپنے عقائد کے سامنے باقی تمام باتوں کو غیر اہم سمجھتا ہے۔

اس طرح آپورٹ نے شخصیت سے متعلق نفسیات کے نظریات میں قابل قدر اضافہ کیا ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آپورٹ نے تقریباً بیس کتابیں تخلیق کی ہیں اور بہت سے مقالات جو مختلف اداروں کے جرنل میں شائع ہوئے وہ نفسیات میں اُس کی اہمیت کے ضامن ہیں۔





# امینوئل کانٹ

Immanuel Kant ( 1724- 1804)

جب قدیم فلسفہ کا ذکر آتا ہے تو سب سے پہلے جو نام ذہن میں اُبھرتا ہے، وہ کانٹ کا ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کانٹ اپنے دور کا ایک عظیم فلسفی تھا، فلسفہ پر جس کے اثرات آج بھی پائے جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے بہت سے فلسفیوں نے براہ راست نفسیات کو اپنے نظریات سے متاثر کیا ہے۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کے نظریات سے براہ راست نفسیات متاثر نہیں ہوئی لیکن ان کے فلسفہ سے نفسیات کو بالواسطہ بہت فائدہ پہنچا۔ ان ہی مفکرین میں ایک نام کانٹ کا بھی ہے جس نے فلسفہ میں ایک بہت ہی اہم مقام حاصل کیا اور فلسفہ کے طالب علم آج بھی اس کے نظریات سے استفادہ کرتے ہیں، ساتھ ہی نفسیات کو بھی نئی راہیں دکھائیں اور اپنے نظریات سے نفسیات کے کئی شعبوں کو تقویت بخشی۔

امینوئل کانٹ ۲۲ اپریل ۱۷۲۴ء کو روس میں اس مقام پر پیدا ہوا جو اب لینن گراڈ کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس مقام کو Knosisberg کہا جاتا تھا اور یہ Prussia سلطنت کا صدر مقام ہوا کرتا تھا۔ کانٹ جرمن نژاد تھا اور اس کا باپ Johann G. Kant ایک جرمن کاریگر تھا اور اس کی ماں بھی ایک جرمن کاریگر کی لڑکی تھی جو پالنے بنانے کا کام کرتا تھا۔ کانٹ کی پرورش جس گھر میں ہوئی وہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ۹ بہن بھائی تھے۔ گھر میں مذہبی ماحول تھا اور مذہبی



تعلیم لازمی تھی کیونکہ کانٹ کا باپ خود ایک کٹر مذہبی رہنما تھا۔ اس لیے اُس نے اپنی اولاد کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہ سب لو تھر کے خیالات کے حامی تھے اور یہی وجہ تھی کہ گھر کے سب افراد نے ابرانی زبان سیکھ لی تھی اور لو تھر کی بائبل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ لہذا کانٹ نے بھی اپنی خاندانی روش کو اپناتے ہوئے سخت گیر مذہبی تعلیم حاصل کی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اندر مذہبی امور میں شدت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نظم و ضبط کی پابندی اور اخلاقی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے زندگی گزارنے کا طریقہ اپنا لیا تھا۔ کانٹ نے خود اپنے بچپن کے دور کو سخت اور تکلیف دہ کہا ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ.....

”جس طرز پر مجھے تعلیم دی گئی تھی، اُس کا اثر یہ ہوا کہ میرے اندر عجز و انکساری پیدا ہو گئی تھی اور میں اپنی خواہشات اور مسرتوں کو دوسروں کے لئے قربان کرنے کے جذبہ سے معمور ہو گیا تھا۔“

..... اس لئے اپنی عمر کے اُس دور کو وہ ایسا دور کہتا ہے جس میں خوشیوں اور مسرت کا کوئی مقام ہی نہیں تھا۔

کانٹ نے اپنے شہر کی مقامی یونیورسٹی میں ۱۹۴۰ء میں داخلہ لیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔ اس نے وہاں فلسفہ میں بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ.....

”جب میں بچہ تھا تو میری دلچسپی سائنس اور ریاضی کی جانب تھی، لیکن مجھے جس قسم کی مذہبی تعلیم دی گئی، اُس کی وجہ سے میرے ذہن سے سائنس اور ریاضی کی جانب رغبت ختم ہو گئی۔“

..... یہ اتفاق کی بات ہے کہ فلسفہ کی تعلیم کے دوران ہی اس کو مارٹین جیسا استاد ملا جو بذات خود سائنس اور ریاضی کی ترقی اور نشوونما سے متاثر تھا۔ اس لیے اس نے کانٹ کے اندر خوابیدہ شوق کو بیدار کیا اور نیوٹن کے اصولوں سے روشناس کرایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانٹ میں ریاضی اور سائنس کی جانب پھر توجہ مبذول کرنے کی خواہش جاگ



گئی اور اس کا استاد مارٹن اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا۔

۱۷۴۶ء میں کانٹ کے باپ کا اچانک انتقال ہو گیا، اس لیے اُس کو اپنی تعلیم منقطع کرنا پڑی اور روزی روٹی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے مضافات کے شہروں میں خانگی طور پر ٹیوشن دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح اس نے اپنے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا کیا، ساتھ ہی اس نے اپنا مطالعہ جاری رکھا اور تحقیق کی جانب بھی توجہ دینے لگا۔ ۱۷۴۹ء میں اس نے اپنی پہلی تخلیق *Thoughts on the True Estimation of living Forces* کے نام سے شائع کی۔ اس کے علاوہ بھی اس نے فلسفہ کے مختلف موضوعات پر کئی مقالات لکھے جو کافی مقبول ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اُس زمانہ کے مشہور فلسفیوں کی توجہ کانٹ کی جانب گئی اور اس طرح کانٹ کی شہرت دور دور تک پہنچنے لگی۔ اس کی تخلیقات کی بنیاد پر اُس کو ۱۷۵۵ء میں یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے تقرر کر دیا گیا۔

اس طرح پھر ایک بار اس کے رجحان میں تبدیلی آنے لگی اور لیکچرر مقرر ہو جانے کے بعد اُس نے پھر فلسفہ کی جانب رُخ کیا۔ لیکن سائنس سے اس کا لگاؤ ختم نہیں ہوا اور وہ سائنس کے موضوعات پر بھی لکھتا رہا۔ اس طرح وہ سائنس سے بھی مربوط رہا۔ فلسفہ میں مطالعہ اور تحقیق کے بعد اس نے فلسفیانہ مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ۱۷۶۲ء میں اس کی دوسری تخلیق *The False Subtlety of the Four Syllogistic Figures Attempt to Introduce the Concept of Negative Magnitudes into Philosophy* کے عنوان سے اور دوسری *The Only Possible Argument in Support of a Demonstration of the Existence of God* نامی کتاب میں اس نے خدا کے وجود پر فلسفیانہ بحث کی تھی۔ یہ دونوں ایسی تخلیقات تھیں جن کی وجہ سے اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی اور وہ ایک ماہر فلسفی کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ اس کی کتاب کو برلن اکادمی کے سب سے زیادہ اہم انعام کے لئے



منتخب کر لیا گیا۔ ۱۷۷۰ء میں جب وہ ۴۵ سال کا تھا تو اسی یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔

کانٹ نے ۴۶ سال کی عمر میں ہی اپنی دانشوری کا سکہ جما لیا تھا اور جن تخلیقات کا اُوپر ذکر کیا ہے، اُن کی اشاعت کے بعد اُس کی شہرت روس اور جرمنی سے نکل کر اور دوسرے ممالک میں بھی پہنچ گئی اور اس کا پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہونے کے بعد فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے طلباء اس یونیورسٹی کی جانب رُخ کرنے لگے۔ اس نے ایک اور تخلیق Anaugural Dissertation کے نام سے شائع کی جس میں اس نے اپنے بارے میں بہت کچھ معلومات فراہم کیں۔ اس نے اس کتاب میں اس بات کا اعتراف کیا کہ ڈیویڈ ہیوم نے اس کو عقائد کی بندشوں سے آزاد کیا۔ کانٹ کی یہ کتاب فلسفہ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے جس کے ذریعہ اس نے اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور تقریباً گیارہ سال تک وہ روپوش رہا۔ اُس نے اس مدت میں نہ کچھ لکھا اور نہ کوئی تخلیق شائع کی۔ اُس کے کچھ دوستوں نے اُس سے گوشہ نشینی ختم کرنے کی درخواست۔ اس نے اپنے ایک دوست کو اسی درخواست کے جواب میں لکھا کہ.....

”میں نے اپنے آپ کو دُنیا سے الگ تھلگ کر کے جینا سیکھ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے خیر خواہ ہو اور تم میری بھلائی چاہتے ہو لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری بھلائی اور بہتری کس کام میں ہے۔ میں اُن تمام دوستوں اور خیر خواہوں کا ممنون ہوں جو میرے بارے میں سوچتے ہیں لیکن فی الوقت میں ان کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتا جس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔“

۱۷۸۱ء میں کانٹ نے اپنی خاموشی توڑی اور وہ پھر ایک بار دُنیا کے سامنے آیا تو اپنے ساتھ Critique of Pure Reason کے عنوان سے ایسی تخلیق لایا جس نے فلسفہ کی دُنیا میں دھوم مچادی اور اس کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا کہ اس کے تمام ہم عصر



اس سے بہت چھوٹے نظر آنے لگے۔ اس کی یہ تخلیق آج بھی فلسفہ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس نے اس کے بعد بھی بہت سے مقالات لکھے اور کئی تخلیقات شائع کیں، جن کی فہرست طویل ہے۔ اس نے اپنے ایک دوست سے درخواست کی وہ اس کی کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کرے اور اس نے جب اس کی مندرجہ بالا کتاب پر تبصرہ شائع کیا تو پھر ایک بار فلسفہ سے متعلق حلقوں میں کانٹ کی اس کتاب کے چرچے شروع ہو گئے۔

کانٹ نے شادی نہیں کی تھی۔ اس لئے گھر بسانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور وہ دنیا داری اور گھر گرہستی کے جھنجھٹ سے آزاد رہ کر اپنی تمام تر توجہ فلسفہ پر دیتا رہا۔ اس کی تخلیقات کی فہرست طویل ہے اس نے فلسفہ میں اخلاقیات، مذہب، جمالیات جیسے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا اور ماورائی موضوعات پر بھی۔ اس کی تخلیقات کی تعداد تقریباً ۲۸ ہے جو زیادہ مشہور ہوئیں اور ان کے علاوہ بے شمار مقالات ہیں۔ اس کی آخری تخلیق Opus Postumum نامکمل ہی تھی کہ ۱۸۰۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور یہ کتاب اس کی موت کے بعد یونیورسٹی نے نامکمل صورت میں ہی شائع کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت کے تقریباً ۷۰ سال بعد اس کے مقبرہ کی تعمیر کے لئے کوششیں شروع ہوئیں اور ۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۱ء تک مختلف ذرائع سے اس کام کے لئے چندہ جمع کیا گیا تاکہ کانٹ کی شخصیت کے شایان شان اس کا مقبرہ تعمیر کیا جاسکے۔ Pregel دریا کے کنارے اس کے مقبرہ کی تعمیر کی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں جب سویت روس میں انقلاب آیا تو جرمن کی تمام نشانیاں مٹادی گئیں اور کانٹ کا مقبرہ بھی بمباری میں تباہ ہو گیا۔ لیکن پھر حالات بدلے اور ۱۹۹۱ء میں جرمنی نے کانٹ کا قد آدم مجسمہ تیار کر کے سویت یونین کو دیا اور یہ مجسمہ آج بھی لینن گراڈ میں موجود ہے اور وہیں Kant Russian State University قائم کی گئی اس طرح اس کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

ہم نے کانٹ کا تعارف کرتے ہوئے اب تک جو کچھ بیان کیا وہ اس کی ہمہ گیر شخصیت کی ایک جھلک پیش کرتا ہے اور فلسفہ میں اس کے مقام کی نشاندہی بھی کرتا



ہے۔ لیکن اس کتاب میں، جو ”نفسیات کے معمار“ کے نام سے پیش کی جا رہی ہے، کانٹ کو شامل کرنے کی وجوہات واضح نہیں ہوئیں کیونکہ نفسیات کے لیے اس کی خدمات کا کوئی تذکرہ نہیں آیا اور نہ ہی یہ بات صاف ہوئی کہ کانٹ نے نفسیات کے لیے کون سا اہم کارنامہ انجام دیا جس کی وجہ سے اس کا نام نفسیات کے ماہرین کی فرست میں شامل کیا گیا۔ نفسیات میں کانٹ کے ان خیالات کو اہمیت ہے جو اُس نے ذہن اور شعور کے بارے میں پیش کی ہیں یا اخلاقیات اور جمالیات کے تحت اس کی تخلیقات ہیں جن سے نفسیاتی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہمیں یہاں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ وہ دور تھا جب نفسیات فلسفہ سے مکمل طور پر الگ نہیں ہوئی تھی اور فلسفہ کا ایک شعبہ تصور کی جاتی تھی۔

اٹھارویں صدی میں فلسفہ میں نفسیات کی جگہ بعض مفکرین نے Science of Mind کی ترکیب استعمال کی ہے، یعنی نفسیات کے معنی علم ذہن لئے جاتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کانٹ نے اسی نسبت سے ذہن پر اظہار خیال کیا ہے لیکن فلسفیانہ انداز میں اور مابعد الطبعیاتی مسائل کا سہارا لے کر۔ جبکہ آج کا ماہر نفسیات اس مباحث میں پڑنا نہیں چاہتا اور وہ براہ راست ذہن اور شعور کے مسائل پر بحث کرتا ہے اور اس کا زاویہ نگاہ خالص سائنسی ہے، ساتھ ہی وہ تجربہ اور مشاہدہ کے حدود میں رہ کر اُن مسائل پر بحث کرتا ہے اور مابعد الطبعیاتی مسائل اور روح کی حقیقت پر بحث کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرتا کیونکہ روح ایک ایسی ”شے“ ہے جس کا نہ ادراک ممکن ہے اور نہ وہ مشاہدہ میں آ سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اسے علم النفس کا موضوع بنانا درست نہیں، اس موضوع کو فلسفہ اور مذہبیات کے لیے چھوڑ دینا مناسب ہوگا۔

کانٹ کے ہاں ذہن کے بارے میں تفصیل سے بحث ملتی ہے۔ کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ کانٹ کے ہاں ذہن سے متعلق جو خیالات ملتے ہیں وہ مافوق التجربہ تصوریت Idealism پر مبنی ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کانٹ کے ہاں ذہن کا تصور وہی ہے جو تجربی نفسیات میں پیش کیا گیا ہے۔ کانٹ کے خیالات کا اگر خلاصہ پیش کیا



جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ.....

۱۔ ذہن صلاحیتوں کا ایک گروہی مخزن ہے۔

۲۔ ذہن ایک وحدت ہے اور ہماری تمام ذہنی کیفیات میں ایک ہی ذہن موجود ہے۔

۳۔ ذہن کے ذریعہ ہمیں وقوف ہوتا ہے اور تجربات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ کانٹ کے خیال میں ذہن کے افعال مختلف خیالات کے ربط اور ترتیب سے ایک نظریہ قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

کانٹ نے اخلاقیات پر بہت کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ اخلاقیات کا جب ذکر آتا ہے تو کانٹ کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ اس کے ایک ناقد نے اس کو Master of Moral Philosophy کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی تین تخلیقات بہت اہمیت رکھتی ہیں جنہیں اُس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں لکھیں اور اسی لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اس موضوع پر اپنی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اخلاقیات پر اس کی سب سے اہم تخلیق Ground Work of the Metaphysic of Moral ہے جو اُس نے ۱۷۹۵ء میں مکمل کی اور اس کے بعد Critique of Practical Reason جو ۱۷۸۸ء میں شائع ہوئی۔ تیسری اور اس موضوع پر اس کی آخری تخلیق Metaphysics of Morals ہے جو اس نے ۱۷۹۷ء میں مکمل کی۔

کانٹ کا خیال تھا کہ اخلاقیات کا مقصد فرد کا اپنا احساس فرض ہے اور وہ اخلاقی ذمہ داریوں کو Categorical Imperative کہتا ہے۔ اس کے خیال میں تمام اخلاقی اقدار کا پاس اسی خصوصیت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے خیال میں تمام اخلاقی اقدار کی اہمیت بھی ان ہی اصولوں پر منحصر ہے۔ اُس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اخلاقی قوانین دراصل استدلال کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اس کے خیال میں یہ اصول



ہمیں یہ نہیں سکھاتے کہ کیا چیز ہمیں خوشیاں فراہم کرے گی۔ بلکہ ہمیں یہ معلوم کراتے ہیں کہ خوش رہنے کے اقدار کیا ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اخلاقی اصول تمام عقلی عناصر پر لاگو ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں ضمیر کا حکم (Categorical imperative) ایک غیر مشروط ذمہ داری ہے۔ یعنی اس امر میں ذمہ داری نبھانے کی ایک ایسی توانائی ہے جو ہماری خوشی یا ارادہ پر انحصار نہیں کرتی۔ اس نے اپنے اس نظریہ کے تحت کئی اصول وضع کئے۔ مثلاً.....

(۱) کوئی بھی ضابطہ عمل طے کرنے سے پہلے یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ کائنات کے اصول فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو اور ہمیشہ اس اصول کی پابندی ممکن ہو چاہے راستہ میں کتنی بھی رُکاوٹوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

(۲) ضابطہ عمل ایسا ہونا چاہئے جو عمل اور مقصد، دونوں کا مجموعہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی فرد جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو اس کے پس پشت اس کا کوئی ذاتی مقصد ہونا چاہئے۔ اب جھوٹ بولنا ایک فعل ہے اور اس کا مقصد ذاتی مفاد حاصل کرنا ہے۔ یہ دونوں مل کر ضابطہ عمل کی تشکیل کرتے ہیں۔

(۳) ضابطہ عمل کی پابندی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر عقلی بنیادوں پر عمل کیا جائے۔ عقلی بنیاد کا مطلب محض ضابطہ عمل کے ذرائع نہیں ہیں بلکہ تمام ذرائع کا استعمال مشروط طریقہ پر کرنا لازمی ہے۔

کانٹ کے فلسفہ کے مطابق ذہنی افعال کے مطالعہ کے لیے تجربات اور دلائل کا سہارا لینا ضروری ہے اور اس کے بغیر ہم ذہن کے افعال کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

کانٹ کی ایک بہت ہی اہم تصنیف Anthropology from a Pragmatic Point of View ہے جو اس کی موت سے صرف چھ سال پہلے ہی شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس کے اہم خطبات پر اظہارِ خیال کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں اس نے تسلیم کیا ہے کہ خدا اور لافانیت، دونوں کا وجود ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ اگر اس نظریہ کو سائنسی



نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کہیں نہ کہیں شک و شبہ کی گنجائش ضرور نکل آئے گی۔ اُس کے خیال میں یہ دُنیا کے لیے بہتر ہوگا کہ سائنس اس مسئلہ پر کوئی بحث نہ کرے۔ اس نے اس کتاب میں ایک جملہ لکھا ہے جس کا ترجمہ اس طرح کیا جاسکتا ہے.....

”کبھی کبھی یہ میرے لیے لازمی ہو گیا کہ میں علم کی ضرورت سے انکار

کردوں تاکہ اپنے عقائد کو اپنے ذہن میں جگہ دے سکوں۔“

شعور کے بارے میں کانٹ کے خیالات بہت اہم ہیں۔ اس کے خیال میں شعور ذہن کی ایک عنصری صفت ہے۔ جس طرح وسعت مادہ کی ایک بنیادی صفت ہے، اسی طرح شعور بھی ذہن کی بنیادی صفت ہے۔ وقوف، تاثر، اور طلب شعور کی مختلف صورتیں ہیں جو ایک وحدت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ شعوری کیفیات ذات کا حصہ ہوتی ہیں اور شعور کی مدد سے ہی ہم اپنی ذات سے واقف ہوتے ہیں۔ شعور ذاتی ہوتا ہے اور شعوری کیفیات کسی ذہن سے وابستہ ہوتی ہیں۔ جس طرح ذہن ذاتی ہوتا ہے اور کسی ایک شخص کی ذہنی کیفیات دوسرا شخص نہیں جان سکتا۔ اسی طرح شعوری صفات بھی ذاتی ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ شعور موضوع Subject اور معروض Object کی میویت پیدا کر دیتا ہے (یہاں معروض سے مراد وہ شے ہے جس کا شعور کیا جا رہا ہے)۔

کانٹ نے نفسیات کے بارے میں اپنی کتاب The Metaphysical Foundation of Natural Science میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے نفسیات کے لئے Natural Science کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ نفسیات کے لیے تجربی طریقوں کو اپنانا چاہئے۔ اس لیے وہ مشاہدہ باطن کو اہمیت دیتا ہے۔ حالانکہ اس بارے میں اس کے ناقدین نے اس پر اعتراض کیا۔ سب سے پہلے یہ کہ مشاہدہ باطن کرنے والے کا خود کا ذہن بھی کام کرتا ہے اور وہ اپنے مشاہدہ کو اپنے خیالات سے آزاد نہیں کر سکتا۔ کانٹ کے بارے میں یہ بھی خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اس نے علم بشریات



(Anthropology) کی کئی جگہ وکالت کی ہے اور اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ لیکن اس نے نفسیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے بشریات کا سہارا نہیں لیا۔ حالانکہ مشاہدہ باطن کا ذکر تجربی نفسیات کے بجائے بشریات کے تحت بہت واضح طور پر بیان کیا جاسکتا تھا۔

کانٹ نے اپنی کتاب Observation on the Feeling of the Beautiful and Sublime میں جمالیات پر بھی اپنا اظہار خیال کیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں حسن کے احساس اور حسن کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ چونکہ جمالیات بھی نفسیات کا ایک موضوع ہے، اس لیے اس کے خیالات نے اس موضوع کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ کانٹ نے اپنی کتاب میں، تصدیق، ذوق اور تصدیق اخلاق اور سائنٹفک تصدیق میں فرق کی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد کی تخلیق میں اُس نے اس موضوع کی بحث کے لئے ایک باب مخصوص کر دیا ہے۔ اسے اس میں ایک بہت اہم بات کہی کے کہ.....

”حسن (خوبصورتی) کسی مصوّر کے شاہکار کی خصوصیت نہیں ہے اور نہ ہی یہ ایک مظہر ہے بلکہ یہ ایک ایسی مسرت اور خوشی کے احساس کا نام ہے جو اس کو دیکھنے والا اپنے شعور کی مدد سے اور اپنے ذوق کے مطابق (اس کو دیکھنے سے) حاصل کرتا ہے۔“

کانٹ کے فلسفہ کے اثرات مغربی سوچ پر بہت گہرے ہیں اور یہ اثرات اس دور کے تمام مشہور فلسفیوں کے خیالات میں نظر آتے ہیں۔ کانٹ کے نظریات نے جرمنی میں خاص طور پر فلسفہ پر اثر ڈالا ہے اور ’مطلق‘، ’ہستی‘ اور ’خدا‘ کے مفہوم کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ کا ایک طالب علم کانٹ کا مطالعہ کرتا ہے تو آج بھی اس کے فلسفہ کے اثرات کو محسوس کرتا ہے اور یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ بلاشبہ کانٹ اپنے دور کا ایک عظیم ترین فلسفی ہے۔



# برہس فریڈرک اسکینر

Burrhus F. Skinner (1904-90)

۱۹۳۹ء میں فرائڈ کے انتقال کے بعد نفسیات میں ایک خلاء محسوس کیا جانے لگا تھا، اور یہ سوچا جا رہا تھا کہ اب نفسیات میں کیا کوئی ایسا دانشور پیدا ہوگا جو اس علم کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوگا؟ لیکن جلد ہی نفسیات داں حضرات کو یہ معلوم ہوا کہ فرائڈ کے ہم پلہ نہ سہی، پھر بھی ایک ایسا دانشور پیدا ہو چکا ہے جو نفسیات کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا کر اس علم کی ترقی اور ترویج کی کوششوں میں لگ جائے گا۔ جس وقت فرائڈ کا انتقال ہوا، اُس وقت ایک اور دانشور اور مفکر پروان چڑھ رہا تھا اور عالمی سطح پر مشہور ہارورڈ یونیورسٹی میں ایسے ریسرچ اسکالروں کی رہنمائی کر رہا تھا جو نفسیات میں تحقیقی کاموں میں مصروف تھے۔ اس کا نام Burrhus Fredric Skinner تھا۔

اسکینر پینسلوانیا کے ایک چھوٹے سے شہر میں ایک وکیل کے ہاں ۲۰ مارچ ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوا۔ اس کی ماں قدامت پسند خاتون خانہ تھی اور اسی لیے اس کی پرورش بھی پرانی طرز پر ہوئی۔ وہ خود کہتا ہے کہ..... ”حالانکہ میں نے ایک قدامت پسند ماحول میں ہوش سنبھالا، لیکن ہم سب خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔“ لیکن اسکینر کے خاندان کی یہ خوشیاں دیر پا ثابت نہیں ہوئیں کیونکہ اچانک اس کے خاندان کو ایک عظیم صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، جب اُس کا بڑا بھائی صرف ۱۶ برس کی عمر میں ایک دماغی بیماری کا شکار ہو کر انتقال کر گیا۔ اس صدمہ نے اس کے ماں اور باپ دونوں پر اتنا گہرا



اثر کیا کہ اُن کی زندگی میں پھر کسی خوشی نے قدم نہیں رکھا اور نہ ہی اُن دونوں کے چہروں پر کبھی مسکراہٹ دیکھی گئی۔ اُن دونوں کی غمزدہ زندگی میں ہی اسکیئر کی پرورش ہوئی۔ اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی لیکن اپنے مذہب سے منکر ہو گیا۔ وہ ایسے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا جہاں روزانہ اجتماعی عبادت میں شرکت کرنا لازمی تھا۔ لیکن وہ اس میں شرکت کرنے سے کتراتا تھا۔ اسکول میں وہ کسی کھیل میں بھی دلچسپی نہیں لیتا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی کسی تفریحی پارٹی میں شرکت کی۔ وہ اپنا تمام وقت صرف اپنی تعلیم کے لیے صرف کرتا تھا۔ اگر اُکتا جاتا تو ادب کی طرف رجوع ہوتا۔ اس لیے اُس نے یہ اعتراف کیا کہ ابتدا میں وہ ایک کہانی کار بننا چاہتا تھا۔ اس کی مختصر کہانیاں اسکول کے جرنل میں شائع ہوتی تھیں اور اس کے بعد مقامی اخبارات میں بھی چھپنے لگیں۔ اس کے بعد وہ کہانیوں کے ساتھ ساتھ علمی مضامین بھی لکھنے لگا، جن کی وجہ سے علمی حلقہ میں اس کی پہچان قائم ہونے لگی۔ اس حالت میں وہ خوش تھا بلکہ اس طرح اس کے شوق میں اضافہ ہوتا رہا اور اس نے اپنے آپ کو اپنے گھر کے ایک کونے میں قید کر دیا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ نہ کسی سے ملتا تھا نہ کہیں جاتا تھا۔ بس اپنے ہی گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر لکھتا رہتا تھا۔

مقامی کالج سے گریجوٹ ہونے کے بعد ہی وہ نیویارک چلا گیا اور وہاں کچھ دنوں تک لا اُبالی اور بے مقصد زندگی گزارنے کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا، جہاں اُس کو ایسے ساتھی ملے جن کو نفسیات سے دلچسپی تھی۔ اس لئے اسکیئر کو بھی اس علم سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے ۱۹۳۰ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اگلے سال ہی ۱۹۳۱ء میں اس کو تحقیقی کام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ ۱۹۳۶ء تک وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں ایسے طلباء کے گانڈ کی حیثیت سے کام کرتا رہا جو نفسیات کے مختلف موضوعات پر تحقیق کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ Minnesota کی یونیورسٹی میں بلا لیا گیا۔ وہیں اس کی ملاقات Yvonne Blue سے ہوئی اور کچھ دن بعد ہی اس نے اس سے شادی کر لی۔ ان کے دو لڑکیاں ہوئیں۔ اس کی دوسری لڑکی نفسیات میں کافی



مشہور ہوئی کیونکہ اس کو اسکینر کے عجیب و غریب تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لئے شیشہ کا ایک مکعب نما بکس بنوایا تھا اور وہ اپنی بیٹی کو اس میں رکھ کر اس کی حرکات کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں وہ انڈیانا یونیورسٹی میں نفسیات کے شعبہ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ یہاں وہ مطمئن تھا لیکن تین سال بعد ہی اس کو ہارورڈ یونیورسٹی میں پھر مدعو کر لیا گیا اور اس کو وہاں مستقل ملازمت کی پیشکش کی۔ اس وقت ہارورڈ یونیورسٹی کی دنیا بھر میں اہمیت تھی اور امریکہ کے مشہور دانشور وہاں موجود تھے۔ اس لئے وہ اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً یہ ملازمت قبول کر لی۔ وہاں اس کو مستقل طور پر نفسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا۔ اسکینر کا کہنا تھا کہ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہی اس کی منزل تھی۔ اسکینر نے ۱۹۴۸ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کی ملازمت اختیار کی۔ وہ اپنے کام میں اتنا محو رہتا تھا کہ اس کو اپنے ارد گرد کی کچھ خبر ہی نہیں تھی اور ساتھ ہی وہ اپنی ذمہ داریوں کو نہایت محنت اور لگن کے ساتھ نبھاتا تھا۔ اس کی ان خصوصیات کی وجہ سے ہارورڈ کی انتظامیہ نے اس کو نفسیاتی تحقیقات کے ڈپارٹمنٹ کا انچارج مقرر کر دیا جہاں اس نے سینکڑوں ریسرچ اسکالرز کی رہنمائی کی اور ساتھ ہی اپنا باقی وقت بھی تخلیقی امور میں صرف کیا۔

اسکینر نے اپنے بارے میں ایک مضمون میں لکھا تھا کہ وہ انگریزی ادب سے بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے انگریزی میں شاعری بھی کی اور مختصر کہانیاں بھی لکھیں اور اسی تعلق سے وہ پہچانا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کے جرنل میں اس نے کرداریت پر بھی کئی مقالات لکھے۔ لیکن وہ ایک خاص طبقہ میں ہی مقبول ہوئے۔ اسکینر کی شہرت اس کی پہلی کتاب Walden Two سے ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے یطو پیائی جیسے مثالی تمدن کی وکالت کی تھی (یطو پیانام سے ایک کتاب سر تھامس مور نے سولہویں صدی میں شائع کی تھی اور اس میں ایک فرضی جزیرہ کا ذکر تھا جہاں ایک مختلف لیکن مثالی تمدن اور سیاسی نظام قائم تھا۔ سر تھامس مور کے اس مثالی نظام حیات کو ناقابل عمل تصور کیا



جاتا تھا لیکن اس کے اس خیال کو ایک مکتب فکر کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور انگریزی میں اس تعلق سے کئی نئے الفاظ بھی شامل ہو گئے تھے) اسکینر کی اس کتاب کو مذہبی رہنماؤں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اگر اسکینر کے خیال کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم بحیثیت ایک انسان کے اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اسکینر نے ان تمام مخالفین کا جواب اپنی دوسری کتاب میں دیا جس کا نام تھا Beyond Freedom and Dignity۔ یہ کتاب اس کی بہترین تخلیق تصور کی جاتی ہے۔ اس نے لکھا کہ جب ہم اپنی آزادی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس معاشرہ کی مخالفت کرتے ہیں جو ہمیں اپنی مرضی کے کام کرنے سے روکتا ہے اور ایسا کرنے پر ہم کو سزا دیتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو ہماری آزادی کو چھین کر ہمیں اپنے اصولوں پر چلنے کے لیے زور دیتا ہے ہماری حمایت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس نے وقار کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کسی فرد کی موت کے بعد ہم یہ کہیں کہ اس نے باوقار زندگی گزاری تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فرد نے اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے ایسے کردار کا مظاہرہ کیا جس کو سماج اور معاشرہ پسند کرتا ہے اور سماج اور معاشرہ کی پسند ہی اس فرد کے کردار کے لیے ایک تقویت کا کام کرتی تھی جس کو وہ اچھے کردار کا انعام سمجھتا ہے۔

اسی طرح جب وہ نیچرز کالج میں پروفیسر تھا تو اس نے ایک مقالے میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہر اسکول میں بچوں کی ذہانت لی پیائش کا انتظام کرنا چاہیے اور ایک کلاس کو کم سے کم دو حصوں میں بانٹ دینا چاہیے۔ ایک حصہ میں ان بچوں کو شامل کیا جائے جو ذہانت کا اعلیٰ معیار رکھتے ہیں اور دوسرے حصہ میں ان بچوں کو رکھا جائے جن کا فذر ذہانت اوسط کے قریب ہے۔ اس تجویز سے اس کا مقصد یہ تھا کہ کلاس میں یہ فرق قائم کر دینے سے ذہین بچوں پر جو محنت کی جائے گی، اس کے نتائج اچھے برآمد ہو سکتے ہیں اور دوسرے حصہ کے بچوں پر خاص توجہ دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جو بچے ذہنی اعتبار سے کمزور ہیں، ان پر زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس تجویز میں



وزن تھا۔ درس و تدریس سے متعلق حضرات اس بات کا روزانہ تجربہ کرتے ہیں کہ کلاس میں ایسے بچوں پر جو محنت کی جاتی ہے، جن کا قدر ذہانت اوسط سے کم ہے، اس محنت کا فائدہ ان بچوں کو نہیں پہنچتا جو ذہین ہیں اور ذہانت کا اونچا معیار رکھتے ہیں۔ لیکن اسکینر کی اس کتاب کو ایسے لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو خاص طور پر مذہبی امور میں اہمیت رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسکینر کے اس خیال کو اگر تسلیم کر لیا جاتا ہے تو ہم بحیثیت ایک انسان اپنے وقار اور اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس کتاب پر اتنی شدت سے تنقید ہوئی کہ اسکینر کو اس کا جواب دینا پڑا اور اس نے اپنی دوسری کتاب Beyond Freedom and Dignity کے نام سے شائع کی جو اس کی مایہ ناز تخلیق تسلیم کی جاتی ہے۔ اس نے اس کتاب میں اپنے ناقدین کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ جب ہم اپنی آزادی کی بات کرتے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اس نے لکھا کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس معاشرہ کی مخالفت کرتے ہیں جو ہمیں اپنی مرضی کے کام کرنے سے روکتا ہے اور ایسا کرنے پر ہم کو سزا دیتا ہے۔ یعنی ایک ایسا معاشرہ جو ہماری آزادی کو ہم سے چھین کر ہمیں اپنے اصولوں پر چلنے کے لئے دباؤ ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس نے وقار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر کسی فرد کی موت کے بعد ہم یہ کہیں کہ اس نے باوقار زندگی گزاری تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فرد نے اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لیے ایسے کردار کا مظاہرہ کیا جس کو سماج اور معاشرہ پسند کرتا ہے اور اس سماج اور معاشرہ کی پسند ہی اس کے کردار کے لیے ایک تقویت کا کام انجام دیتی ہے، جس کو وہ اچھے کردار کا انعام سمجھتا ہے۔

اسی طرح جب وہ ٹیچرز کالج میں پروفیسر تھا تو اس نے اپنے ایک مقالہ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسکولوں میں بچوں کی ذہانت کی آزمائش کا انتظام ایسا ہونا چاہئے اور ایک کلاس کو کم سے کم دو حصوں میں بانٹ دینا چاہیے۔ ایک حصہ میں ان بچوں کو شامل کیا جائے جو ذہانت کا اعلیٰ معیار رکھتے ہوں اور دوسرے حصہ میں ان بچوں کو رکھا جائے جن کی ذہانت کا معیار (IQ) اوسط کے قریب ہے۔ اس تجویز سے اس کا مطلب



یہ تھا کہ کلاس میں یہ فرق قائم کر دینے سے ذہین بچوں پر جو محنت کی جائے گی اس کے نتائج اچھے برآمد ہوں گے۔ دوسرے حصہ میں بچوں پر خاص توجہ دی جاسکتی ہے کیونکہ وہ ذہانت کے اعتبار سے کم درجہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان پر زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی اس تجویز کی ماہرین تعلیم نے مخالفت کی۔ اگر غور کیا جائے تو اس تجویز میں ایک وزن تھا۔ تعلیم سے متعلق حضرات اس بات کا روزانہ تجربہ کرتے ہیں کہ کلاس میں ایسے بچوں پر جو محنت کی جاتی ہے، جن کا قدر ذہانت اوسط سے کم ہے اس محنت کا اثر ان بچوں پر نہیں ہوتا جو ذہانت کا اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، اور اگر معلم کی یہ محنت ان کے کام آتی تو ان کی معلومات ان کے علم میں اضافہ ہوتا۔

تصور کیجئے کہ علم ریاضی کا ایک معلم کلاس میں ایک مسئلہ کو سمجھاتا ہے تو اعلیٰ ذہنی معیار رکھنے والے طالب علم پہلی بار میں ہی اس کو سمجھ جاتے ہیں جبکہ وہ بچے جن کا قدر ذہانت اوسط ہے، ان کو یہی سوال دوبارہ سمجھانا پڑتا ہے، اور دوسری بار سمجھانے میں معلم نے جو محنت کی یا جو وقت صرف کیا وہ ان طلباء کے لئے ضائع سمجھا جائے گا جو پہلے ہی اس سوال کو سمجھ چکے ہیں۔ اگر کلاس میں کچھ کند ذہن بچے بھی موجود ہیں تو معلم کو اسی سوال کو ایک بار اور سمجھانے کی کوشش کرنا پڑے گی اور یہ تیسری کوشش ان طلباء کے لئے کچھ کام نہیں آئے گی جو پہلے ہی اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ اسکیئر نے اس نظریہ کو سائنٹفک طریقہ پر سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ اس زمانے میں ممکن تصور نہیں کیا گیا، اور ساتھ ہی نفسیاتی طور پر بھی اس کو مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے اسکیئر کی اس تجویز کی مخالفت کی گئی اور اس کو ناقابل عمل تصور کیا گیا۔

جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے، ممبئی میں کئی بڑے ہائی اسکولوں میں اسکیئر کی تجویز پر غیر منظم طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ چونکہ ایسے اسکولوں میں ایک کلاس کے کئی ڈویژن ہوتے ہیں۔ اس لئے ساتویں یا آٹھویں کلاس کے امتحانات کے نتائج کی بنیاد پر طلباء کو امتحانات میں ان کے نتائج کی بنیاد پر ان کی ڈویژن طے کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ڈویژن میں ان طلباء کو رکھا جاتا ہے جنہوں نے امتحان



میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے، اور دوسری ڈویژن میں ان بچوں کو شامل کیا جاتا ہے جن کی کارکردگی کا معیار دوئم درجہ پر تھا۔ اس طرح معلم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس ڈویژن میں طلباء کی ذہانت کا معیار کیا ہے۔ ایسے اسکولوں میں عام طور پر میٹرک کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور میرٹ لسٹ میں زیادہ بچے آتے ہیں۔

ایک ایسے اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے میری گفتگو ہوئی جس اسکول سے ہر سال میٹرک کے امتحان میں امتیازی شان سے پاس ہونے والے بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے ان کے طریقہ کار کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی تیاری آٹھویں کلاس کے نتائج کے بعد ہی شروع کر دیتے ہیں اور جن طلباء نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے، ان کو الگ رکھ کر ان پر محنت کی جاتی ہے۔ نویں کلاس کے امتحانات کے نتائج کے بعد پھر ان میں سے ایسے طلباء کو منتخب کیا جاتا ہے، جن کے نتائج اچھے تھے، اور پھر ان چندہ طلباء پر سال بھر توجہ دی جاتی ہے، ان کے لیے علیحدہ کلاس کا انتظام کیا جاتا ہے۔ سالانہ امتحان آنے سے دو تین ماہ پہلے ان طلباء کے لیے مخصوص کمپ لگایا جاتا ہے جہاں وہ رہتے ہیں اور ان پر مسلسل توجہ رکھی جاتی ہے۔ ان کو خاص طریقہ پر تعلیم دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ان تمام کوششوں کا نتیجہ اچھا ہی نکلتا ہے اور اچھا ہی نکلتا ہے۔

اسی طرح اسکیئر نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ایسے اداروں میں جہاں نفسیاتی مریض رکھے جاتے ہیں یا کم عمر مجرموں کو رکھا جاتا ہے، وہاں انعامات ایک سلسلہ شروع کرنا چاہئے۔ اچھے کاموں کے لیے انعام کی شکل میں ان مریضوں یا مجرموں کو کوپن کی شکل میں انعام دینا چاہئے اور یہ کوپن ایسے ہوں کہ ان کے عوض وہ اپنی مرضی کے مطابق مواقع حاصل کر سکیں۔ ایسے مواقع جن سے ان کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ اس کوپن کے عوض میں کھیل کے لیے اضافی وقت حاصل کر سکتے ہیں، یا اس کوپن کے بدلے اپنی پسند کی کوئی چیز حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نے کافی



تجربات کے بعد یہ نتائج اخذ کیے تھے کہ نفسیاتی مریضوں کو آسودگی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور جس کردار سے وہ اپنی آسودگی حاصل کرتے ہیں، وہ ان کو مہیا کرنا چاہیے۔ اگر اچھے کاموں کے عوض ان کو ایسے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں، جن کے ذریعہ وہ آسودگی حاصل کر سکیں تو اُن کے کردار میں یقیناً بہتری پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح نو عمر مجرموں کے لیے جو اصلاح خانے قائم کیے جاتے ہیں وہاں اس قسم کے انتظام کے بہت عمدہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ نفسیات میں Reinforcement (یعنی تقویت) کی اصطلاح اعصاب کو براہیختہ کرنے کے اس عمل کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی دوسرے عمل کی شدت میں اضافہ کا باعث ہو اور عام طور سے یہ تحلیل نفسی میں خوابوں کے تعلق سے استعمال ہوتی ہے، ساتھ ہی اس اصطلاح کو انعام اور ستائش کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے فرد میں وہ کام کرنے کی تحریک بار بار پیدا ہو جس کی وجہ سے اس کو انعام کا حقدار ٹھہرایا گیا ہو۔ اس طرح ستائش بھی انعام کی ایک شکل ہے۔ اگر بچے کے کسی اچھے فعل کی وجہ سے اس کی تعریف کی جائے تو وہ اس فعل کو دہرانے کی بار بار کوشش کرے گا۔

اس مسئلہ پر اس نے تفصیل سے روشنی ڈالی اور سزا اور جزا کے تعلق سے اس نے کئی مقالات لکھے۔ اسکینر کا یہ نظریہ Operant Conditioning (عاملی التزام) کے نام سے مشہور ہے اور اگر اس کا خلاصہ بیان کیا جائے تو وہی ہے جو اوپر تقویت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے۔ اسکینر نے اس سلسلہ میں جو کام کیا اس کی بنیاد پر Behaviour Modification کا طریقہ ایجاد کیا گیا اور اس کو نفسیاتی مریضوں کے شفا خانوں میں اور اسکولوں میں آزمایا گیا۔ اس طریقہ سے مطلب تھا کہ کسی فرد کے نامناسب کردار کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ معلوم کیا جائے کہ اُس کردار کی تحریک کس تہج کے ذریعہ پیدا کی گئی؟ اور اگر اس تہج کو دور کر دیا جائے تو اس فرد میں اس نامناسب کردار کو دہرائے جانے کی توقع کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کسی اچھے اور مناسب کردار کے پس پشت کیا تحریک تھی، اُس کی جانچ کی جائے اور اُس کردار کو دہرانے کے لیے



اس تحریک کا استعمال کیا جائے۔

اسکینر نے ایک نئی اصطلاح وضع کی جس کو وہ Shaping کہتا تھا اور اس سے اس کا مفہوم تھا کہ ”کسی متوقع کردار کے لیے جوابی فعل کو تقویت پہنچانا۔“ اس کو سمجھانے کے لیے بالکل آسان طریقہ پر اس نے کہا کہ میری لڑکی پھسلنے والے کھیل سے بہت خائف تھی، جبکہ اس کے سامنے اس سے چھوٹے بچے اس پھسلن پر اوپر جاتے اور پھسل کر نیچے آ جاتے، اور وہ یہ سب دیکھتی۔ لیکن وہ خود اس عمل سے گھبراتی تھی۔ اسکینر نے ایک دن اُس کو پھسلنے کے آخری سرے پر بٹھا دیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اب اُسے ڈر لگتا ہے؟ تو اُس نے کہا کہ یہاں کیا ڈرنا۔ اسکینر نے اس سے کہا۔ ”تو پھر کود کر نیچے اتر جاؤ۔“ اس کی لڑکی کود کر اتر گئی۔ اس طرح اس نے کئی بار کیا تو بچی کے دل یہ ڈر نکل گیا کہ اوپر سے پھسلتے ہوئے اگر میں نیچے آئی اور گر گئی تو چوٹ لگے گی۔ ایک دو دن کے بعد اس نے اپنی لڑکی کو پھسلنے پر دو فٹ اوپر بٹھا دیا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ یہاں سے پھسل سکتی ہے؟ تو بچی پھسل کر نیچے آ گئی۔ دوسرے دن اُس نے لڑکی کو کچھ اور اونچائی پر بٹھایا اور اس طرح وہ ہر روز اس کی اونچائی بڑھاتا رہتا۔ آخر کار آہستہ آہستہ وہ اُس کو سب سے اونچے مقام پر لے گیا اور لڑکی کا خوف ختم ہو گیا۔

اسکینر نے اپنے اس طریقہ کو جانوروں پر آزمایا اور اُن سے ایسے کام لیے جو عام آدمی کے لیے ممکن نہیں تھے۔ اُس نے چوہوں، بلیوں اور کبوتروں کو مخصوص کردار ادا کرنے کے لیے ٹریننگ دی اور جانور اُس کے اشاروں پر یہ کردار ادا کرتے تھے۔ اُس کے شاگردوں کو بہت تعجب ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اسکینر نے کبوتروں کو ایک چھوٹی سی ربر کی گیند کو اشاروں پر اپنے پنجوں سے پھینکنا سکھا دیا تھا۔

اس کے برعکس اس نے ایک اور نظریہ پیش کیا جس کو اس نے Aversive Stimuli کی اصطلاح دی۔ (اُردو میں اس کے مترادف اکراہی تہیج کی اصطلاح استعمال کر سکتے ہیں۔) اس سے اُس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح کسی تہیج کو تقویت پہنچا کر اُس کو بہتر کردار کے لیے تیار کر سکتے ہیں، اُسی طرح کسی تہیج کی شدت کو کم



کر کے اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والے کردار کے احتمال کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اسکینر کرداریت کے مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا اور اُسی مکتب فکر کو فروغ دینے کی کوشش کرتا رہا تھا، ساتھ ہی وہ اختباری نفسیات (تجرباتی نفسیات) میں بھی ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اپنے تجربات کی مدد سے وہ کرداریت کو ترقی کی جانب لے جانے اور اس کو مقبول بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح اسکینر کے طریقوں میں کرداریت اور تجربات دونوں کی افادیت واضح ہو جاتی تھی۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں خود کو ایک سائنسداں کہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ نفسیات میں کرداریت کا نظریہ سائنٹفک اصولوں کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ اُس کا یہ مضمون My Behaviour as a Scientist کے عنوان سے شائع ہوا تھا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے اس مضمون میں اپنی شخصیت کو بالکل واضح کر دیا تھا۔ اس مقالہ کے کچھ اقتباسات سے اس کے خیالات سامنے آجاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے.....

”کرداریت کے حامی ماہرینِ نفسیات کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ دُوسروں کے کردار کے بارے جو رائے رکھتے ہیں، اس کا اطلاق خود اپنے اُوپر نہیں کرتے۔ جبکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میں نے اپنی کتاب Verbal Behaviour میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، خواہ وہ نزگسیت کے تعلق سے ہوں یا سائنسی تجسس کے تعلق سے، اُن کا جس حد تک میرے اپنے اُوپر اطلاق ہوتا ہے، اُتنا ہی اُن چوہوں، کبوتروں اور اُن جانوروں پر، جن پر میں نے تجربات کئے۔ میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ان حقائق کو کبھی شائع نہیں کرتا اگر مجھے یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ حقائق اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ میری زندگی ایک سائنسداں کی زندگی کی طرح گزر رہی ہے۔“

..... وہ لکھتا ہے کہ.....

”مجھے ابتداء سے ہی ایسی تعلیم دی گئی ہے کہ میرے دل میں خدا کا خوف



پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ یعنی میرا ہر کردار فطری تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک بھی دن بغیر کچھ کیے ضائع نہیں کیا۔ میں نے اُس وقت بھی مطالعہ کیا جب میرا دل چاہتا تھا کہ میں مطالعہ نہ کروں۔ اسی طرح جب میرا دل چاہتا تھا کہ آج چھٹی منائی جائے، اُس دن بھی اپنے شاگردوں کو تعلیم دی۔ میں نے ہر لمحہ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال کی اور اپنے تجربات کو اُس دن بھی جاری رکھا جس دن مجھے اپنے گھر والوں کے ساتھ تفریح کے اوقات گزارنے چاہئے تھے۔ میں نے اپنے تجربات کا ہر روز کاریکارڈ رکھا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میں نے اکثر کرمس اور نئے سال کے تہوار بھی تجربات میں گزارے۔“

.....اپنے کام کرنے کے انداز کے بارے میں وہ لکھتا ہے.....

”جب میں تحقیق کرنے والے شاگردوں کی رہنمائی کرتا تھا تو کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے مقررہ وقت کی پابندی نہ کی ہو۔ میں نے اپنے تجربات کی غیر ضروری تشہیر نہیں کی جب تک مجھے یقین نہ ہو کہ میں سائنٹفک دلائل سے کسی تجربہ کے نتائج واضح کر سکتا ہوں۔ میں نے مفروضات پر کبھی یقین نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ حقائق کی تلاش کی ہے۔“

اس نے اپنے اس مقالہ میں اپنے ناقدین کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے.....

”میں نے کبھی اپنے ناقدین کے خیالات کا اثر نہیں لیا، چاہے وہ میری مخالفت میں ہوں یا موافقت میں۔ مثال کے طور پر چومسکی نے میری کتاب Verbal Behaviour پر جو تفصیل سے تبصرہ لکھا ہے، اس کے کچھ ہی صفحات کا مطالعہ کیا ہے۔“

.....اس نے اپنے اس مضمون میں چومسکی کے لئے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔



اسکینر نے نفسیات میں ۲۴ قوانین وضع کئے اور یقینی طور پر اُن قوانین کو اسکینر سے منسوب کرنا چاہئے۔ اُن قوانین میں شماریات کے تعلق سے ۵ قوانین ہیں، حرکیات کے تحت اُس نے ۸ قوانین وضع کئے اور ہم عملی کے لیے گیارہ قوانین ہیں۔

اسکینر نے لاطینی زبان کا لفظ Homunculus استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں ”چھوٹا سا آدمی“۔ اُس کے خیال میں یہ چھوٹا آدمی ہر فرد کے اندر موجود ہوتا ہے اور وہی ہمارے ہر کردار کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہی چھوٹا آدمی ہمارے خیالات میں، ہماری انا، ارادہ، روح کے تصور، شعور کے وجود اور ذات کے احساس کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ یہی چھوٹا آدمی ہماری شخصیت کے خصائص کی بھی تشکیل کرتا ہے۔ وہ Reinforcement یعنی تقویت کے بارے میں کہتا ہے کہ جب تک برائی کو تقویت ملتی رہے گی، بُرائی کو دُنیا سے نہیں مٹایا جاسکتا۔ اس کو صاف کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ اچھائی کو تقویت ملتی ہے تو اچھائی پیدا ہوتی ہے اور جب بُرائی کو تقویت پہنچائی جاتی ہے تو بُرائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے سماج کے ڈھانچے کو، اپنی تہذیب و تمدن کو اس طرح ڈھالیں کہ صرف اچھے کردار کو تقویت ملے اور بُرے کردار کو سزا کا حقدار قرار دیا جائے۔ ہم صحیح طرز پر کرداریت کی تکنیک کا استعمال کر کے اپنی ثقافت، اپنے کلچر کو بہترین شکل دے سکتے ہیں۔ آزادی خیال اور وقار کے لیے وہ کہتا ہے کہ یہ خصوصیات قابل مشاہدہ نہیں ہیں، اس لیے ان سے متعلق مسائل سائنٹفک نفسیات کے تحت زیر بحث آنا ہی نہیں چاہئے۔ اس کے خیال میں نفسیات داں کو صرف قابل مشاہدہ عناصر پر ہی اپنی توجہ اور تحقیق مرکوز کرنا چاہئے۔ یعنی اس کو صرف ماحول اور کردار کو ہی ذہن میں رکھنا ہے۔ اسکینر کی کوششوں سے کرداریت مکتب فکر کو کافی مقبولیت ملی بلکہ بعض ممالک میں تو نفسیات کی جگہ اب Science of Behaviour کی اصطلاح استعمال ہونے لگی ہے۔



# اینا فرائڈ

Anna Freud ( 1895 - 1982)

سگمنڈ فرائڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنا جانشین مقرر کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اُس کی بد قسمتی تھی کہ جس کو اُس نے اس کام کے لیے منتخب کیا، وہی اُس کو چھوڑ کر چلا گیا اور اس نے اپنا الگ مکتب فکر قائم کر لیا۔ اب وہ چاہے کارل ژونگ ہو یا الفریڈ ایڈلر یا پھر کیرن ہارنائی۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ اُس کا جو بھی جانشین ہو، وہ صرف اس کے نظریات اور اس کے وضع کردہ اصولوں کی ہی پابندی کرے اور ان حدود سے باہر جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ ظاہر ہے اس کی ان شرائط پر کوئی بھی اپنی زندگی وقف کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاید فرائڈ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے کام کو نہایت جاں فشانی اور مکمل توجہ سے آگے بڑھانے میں خود اس کی بیٹی آگے آئے گی۔ اینا سگمنڈ فرائڈ کی آخری اولاد تھی۔

سگمنڈ فرائڈ کے کچھ قریبی دوستوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی ایک پوشیدہ اور نامعلوم بیماری کی وجہ سے نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اب کوئی اولاد ہو، اور جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اُمید سے ہے تو اس نے چاہا کہ وہ حمل کو ضائع کرادے۔ لیکن اُس کی بیوی نے اُس کا ساتھ نہیں دیا اور ۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو اینا پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے بعد فرائڈ نے اپنے دوست Dr. Fless کو خط لکھ کر اطلاع دی۔ اس نے خط میں لکھا کہ اگر یہ لڑکا ہوتا، جیسا کہ میری بیوی کو اُمید تھی، تو میں تمہیں بذریعہ تار اطلاع دیتا۔



لیکن چونکہ لڑکی ہوئی ہے، اس لیے تمہیں خط سے اطلاع دے رہا ہوں۔ فرائڈ کے اس خط سے اس کے میلان طبع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اینا کی پیدائش کے بعد فرائڈ کی بیوی بہت اداس اور غمزدہ رہتی تھی۔ اس نے اینا کو اپنا دودھ بھی نہیں پلایا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ اینا کو ایک آیا کے سپرد کر کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی اور کئی مہینہ تک اس نے اینا کی کوئی خبر نہیں لی۔ یہ وہی آیا تھی جس نے اینا سے پہلے بھی دو بچوں کی دیکھ بھال کی تھی۔ شاید اینا کی یہ حالت دیکھ کر سگمنڈ کو اس پر رحم آیا اور اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ اپنی تمام اولاد سے زیادہ اس کو محبت دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اینا اپنے باپ سے زیادہ وابستگی کا اظہار کرتی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اینا ابتداء سے ہی اپنے بہن بھائیوں میں گھل مل کر نہیں رہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُس کو باپ کے علاوہ کسی اور سے اتنا لگاؤ نہیں تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے باپ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ جب تک وہ زندہ رہا، اس کی خدمت کرتی رہی اور اس کے مرنے کے بعد اس کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے انتھک کوششوں میں لگ گئی۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرائڈ کے بعد تحلیل نفسی کی تحریک کو زندہ رکھنے میں اینا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

اینا نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ ایک مرتبہ گھر کے تمام افراد سمندر میں کشتی کے ذریعہ تفریح کرنے کے لیے گئے تو اینا کو اکیلے ہی گھر چھوڑ گئے، اُس وقت اینا نے کچھ نہیں کہا اور اپنے باپ کے پاس رہنے سے مطمئن ہو گئی۔ لیکن سگمنڈ فرائڈ کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے اینا کو سمجھایا اور اس کی زندہ دلی کی بہت تعریف کی۔ اینا کا بیان ہے کہ اُس دن مجھے اپنے باپ سے جو پیار اور دُلا ر ملا، وہ میرے لیے اس خوشی سے کہیں زیادہ تھا جو گھر والوں کے ساتھ تفریح پر جا کر ملتی۔ اینا کی اس حالت کی وجہ سے اس کی آیا بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی اور اس کے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ اس سے پیار کرتی تھی۔ اینا نے ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا کہ اس کو اپنی بڑی بہن سے کبھی کبھی رشک ہوتا تھا، کیونکہ وہ اس سے زیادہ



خوبصورت تھی۔ لیکن سگمنڈ فرائڈ جب ایسا محسوس کرتا تھا تو ایسا سے کہا کرتا تھا کہ خوبصورتی سے زیادہ اہمیت ذہانت کی ہوتی ہے اور جو تمہارے پاس ہے، وہ تمہاری بہن کے پاس نہیں ہے۔

اینا نے اپنی تعلیم ۱۹۰۱ء سے شروع کی، لیکن اس نے اسکول میں کچھ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ خود کہتی تھی کہ.....

”اسکول میں میرا دل نہیں لگتا تھا جبکہ گھر پر میں اپنے آپ کو زیادہ پرسکون محسوس کرتی تھی۔“

..... وہ سگمنڈ فرائڈ کے پاس آنے والے مہمانوں سے بہت کچھ سیکھتی تھی۔ اُس نے ان لوگوں سے کئی زبانیں سیکھ لی تھیں۔ ابتداء میں وہ ان زبانوں میں صرف بات چیت کر سکتی تھی، بعد میں اس نے اطالوی، جرمن اور ابرانی زبانوں میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی اور ان زبانوں کی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا کرتی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں سگمنڈ فرائڈ کے گھریلو حالات ناخوشگوار ہو گئے۔ اُس کے دو بیٹے الگ ہو گئے۔ اس وقت اینا کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔ اُس کو اس بات کا احساس تھا کہ بھائیوں کے مستقبل کے بارے میں اس کا باپ فکر مند رہتا ہے اور اس کو اس بات کا افسوس ہے کہ بیٹوں نے اس کا پیشہ اختیار نہیں کیا، تاکہ اس کے کام کو آگے بڑھایا جاسکے۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے کہا کہ وہ اُس کی تحریک میں دلچسپی لینا چاہتی ہے۔ اس نے تحلیل نفسی کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھ رکھا تھا۔ شاید اس طرح وہ اپنے باپ کے دُکھ دور کرنا چاہتی تھی۔

ایک دن فرائڈ اینا کو لے کر چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور روح افزا مقام تھا۔ راستہ کے دونوں جانب خوبصورت بنگلے تھے۔ فرائڈ نے اینا سے کہا کہ یہ بنگلے باہر سے بہت خوبصورت دکھائی دے رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ان میں رہنے والے بھی پرسکون اور قابلِ رشک زندگی گزار رہے ہوں گے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر ان بنگلوں کے اندر کے حالات معلوم کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے مکین بھی تمہاری



ہماری طرح پریشان ہیں۔ یہی حال انسان کا ہے کہ وہ باہر سے جو نظر آتا ہے وہ اندر نہیں ہوتا۔ اس کے اندر کے حالات اس سے مختلف ہوتے ہیں۔ فرائڈ کو احساس ہو گیا کہ ایسا اس کی تحریک میں دلچسپی لے رہی ہے تو اُس نے ایسا کو اجازت دے دی کہ وہ بدھ کے دن ہونے والی میٹنگوں میں شرکت کر سکتی ہے، لیکن اُس کو بحث میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اُس کے بعد ایسا بدھ کے دن فرائڈ کے گھر ہونے والی میٹنگوں میں شرکت کرنے لگی اور گھر میں ایک سیڑھی پر بیٹھ کر وہ غور سے اُس تحریک کے بارے میں ہونے والی بحث کو سنا کرتی تھی۔

۱۹۱۲ء میں ایسا نے گریجویشن مکمل کر لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے سامنے ایک سوال کھڑا ہو گیا کہ اب وہ کیا کرے اور اپنے مستقبل کے لیے کون سی راہ اختیار کرے؟ اسی دوران فرائڈ نے اُس کو اُس کی نانی کے پاس سسلی روانہ کر دیا تا کہ وہ اپنی صحت کی طرف توجہ دے۔ فرائڈ کے اس فیصلہ کے پس پشت اصل وجہ یہ تھی کہ اس کی بڑی لڑکی صوفیہ نے اپنی شادی کا اعلان کر دیا تھا اور وہ بھی ایک ایسے فرد کے ساتھ جس کو نہ وہ اچھی طرح جانتی تھی اور نہ اس کے والدین اس سے واقف تھے۔ اس نے یہ فیصلہ چند ملاقاتوں کے بعد ہی کر لیا تھا۔ سگمنڈ فرائڈ اپنی بیٹی کے اس فیصلہ سے خوش نہیں تھا۔ اتنا ہی نہیں، وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا اپنی بہن کی شادی میں شرکت کرے۔ وہ خط کے ذریعہ ایسا کو گھر کی تمام خبریں دیتا رہتا تھا۔ اُس نے ایک خط میں لکھا کہ.....

”مجھے افسوس ہے کہ تم اپنی بڑی بہن کی شادی میں شرکت نہیں کر سکتیں،

لیکن اس سے زیادہ یہ اہم ہے کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو۔“

ایسا کو اس خط سے اپنی بہن کی شادی کے بارے میں معلوم ہوا تو اس کو ایک صدمہ پہنچا، لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

۱۹۱۴ء میں ایسا نے ابتدائی اسکولوں میں تعلیم دینے کی تربیت حاصل کی اور یہ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ برطانیہ چلی گئی جہاں اُس کو اپنے اتالیق لیوکان کے ساتھ رہنا تھا۔ لیوکان سگمنڈ فرائڈ کی مریضہ رہ چکی تھی اور اس کی بہت احسان مند تھی۔



جب ایناریلوے سے اُتری تو اُس کے استقبال کے لیے اُس کی اتالیق کے علاوہ ایک اور شخص بھی پھولوں کا گلدستہ لے کر کھڑا تھا۔ اس کا نام Dr. Ernst Jones تھا۔ اینا کے لیے یہ شخص اجنبی تھا لیکن سگمنڈ فرائڈ اُس کو جانتا تھا اور اُس نے لیوکان کو خاص طور پر لکھا تھا کہ ڈاکٹر جونس اینا سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ لیکن نہ جانے کس طرح اس کو اینا کے آنے کی خبر مل گئی اور لیوکان اُس کو اسٹیشن پر آنے سے نہ روک سکی۔ اُس وقت اینا کی عمر ۱۸ سال تھی اور جونس کی عمر ۳۵ سال تھی۔ لیوکان نے اینا کو فرائڈ کے وہ خطوط دکھائے جن میں اس نے ڈاکٹر جونس سے دُور رہنے کی تاکید کی تھی۔ اینا نے اپنے باپ کے کہنے پر عمل کیا، جبکہ ڈاکٹر جونس ہر لمحہ اُس کے قریب آنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیوکان نے فرائڈ کو ان تمام حالات سے باخبر کیا تو فرائڈ نے اپنی پیاری بیٹی کو ایک خط لکھا.....

”مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر جونس تم سے تعلقات بڑھانے میں سنجیدہ ہے اور تمہاری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی مرد تمہاری طرف کھینچتا چلا آ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کچی عمر میں تم اُس کے جال میں پھنس سکتی ہو۔ اس لیے تم کو پہلے سے ہی متنبہ کرتا ہوں کہ اس سے ہوشیار رہنا اور جوانی کی رُو میں بہک نہ جانا۔ میرے خیال میں یہ بات صاف کر دینا ضروری ہے کہ میں تمہاری بہنوں کی طرح تمہیں اس سلسلہ میں آزادی دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ اُن کی بات الگ تھی اور تمہاری بات الگ ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اپنی زندگی کے بارے میں اہم فیصلہ کرتے وقت ہمیں نظر انداز نہیں کرو گی اور ہمیں وہ خوشیاں دو گی جن پر ہمارا حق ہے۔“

اینا اپنے باپ سے اس قدر لگاؤ رکھتی تھی کہ اُس کی بات کو رد کرنے کی ہمت نہیں جٹا سکتی تھی۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر جونس کی طرف مائل تھی، لیکن سگمنڈ فرائڈ کے اس خط کے بعد اُس نے ڈاکٹر جونس سے قطع تعلق کر لیا۔



۱۹۱۵ء میں اینا نے ٹیچرس ٹریننگ مکمل کر لی اور مقامی اسکول میں ابتدائی کلاسوں میں تعلیم دینے لگی، ساتھ ہی اُس نے سگمنڈ فرائڈ کی کتابوں کا جرمنی میں ترجمہ شروع کر دیا۔ کتابوں کے ترجمہ کے دوران وہ فرائڈ کے نظریات کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کی کوشش کرتی تھی اور ضرورت پڑنے پر خط و کتابت کے ذریعہ اپنے باپ سے مشورہ بھی لیتی تھی۔ اُس نے اپنی کلاس کے بچوں پر نفسیات کا اطلاق کیا، اس نے اُن کا نفسیاتی جائزہ لینا شروع کیا اور ہر بچہ کا ایک ریکارڈ مرتب کیا۔ وہ ہر بچہ پر گہری نظر رکھتی، اُن کے کردار کا مشاہدہ کرتی اور اس طرح ان کی شخصیت کے خصائص جاننے کی کوشش کرتی۔ اینا کی ان کوششوں کے اچھے نتائج برآمد ہوئے اور اُس نے ان تجربات سے آگے جا کر بہت فائدہ اُٹھایا۔ ۱۹۱۷ء میں اس کو تپ دق کا عارضہ لاحق ہو گیا، جس کی وجہ سے اُس کو اسکول سے طویل مدت کے لیے غیر حاضر رہنا پڑا۔ فرائڈ کے کچھ مخالفین کا یہ کہنا تھا کہ اینا اپنے اندر ایک گھٹن محسوس کرتی تھی کیونکہ وہ اپنے باپ کی جابرانہ طبیعت کی وجہ سے اپنے پسندیدہ فرد کو اپنا جیون ساتھی نہ بنا سکی، اس لیے وہ ٹی۔ بی کا شکار ہو گئی۔ بہر حال اس بات کو ہم مخالفین کا ایک حربہ سمجھ کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں تپ دق کا کوئی مؤثر علاج میسر نہیں تھا، اس لیے اس کی کمزوری میں اضافہ ہوتا رہا اور اس کی کمزوری کی وجہ سے اور دوسری بیماریوں نے بھی حملہ کر دیا۔ اس لیے وہ اسکول میں درس و تدریس کی ذمہ داریوں کو نہیں نبھاسکی۔

۱۹۱۸ء میں اُس نے ایک منصوبہ شروع کیا، جس کو اس نے Project Teaching کا نام دیا۔ اُس کے اس منصوبہ کی خبر سن کر ہنگری کی ایک تنظیم نے اُس کو مدعو کیا۔ حالانکہ اُس کی تقرری عارضی تھی، لیکن یہ منصوبہ اتنا کامیاب ہوا کہ اُس کے چلے آنے کے بعد بھی اس تنظیم نے اُس کو جاری رکھا، کیونکہ اس منصوبے سے جڑے ہوئے طلباء میں ایک نئی لگن اور شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ اسی دوران فرائڈ کا پورا خاندان انفلوئنزا کا شکار ہوا، اور یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ اینا کی بڑی بہن کی موت واقع ہو گئی۔ اینا بھی اس بیماری میں مبتلا ہوئی۔ ایک تو پہلے سے ہی صحت کا خراب ہونا اور پھر جسمانی



کمزوری میں اس بیماری کا شدید حملہ، جس کی وجہ سے ایسا ایک طویل عرصہ تک کسی کام کے قابل نہیں رہی اور اس نے درس و تدریس کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ خود اپنی تحلیل نفسی کرے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے باپ سے مشورہ کرتی رہی اور اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرتی رہی۔

پھر اُس کی زندگی میں ایک اور شخص آیا جس کا نام ہنس تھا اور ایسا کے بڑے بھائی مارٹن کا دوست تھا۔ پیشہ سے وہ ڈاکٹر تھا اور سگمنڈ فرائڈ کی تحلیل نفسی کا حامی تھا اور اسی طریقہ سے وہ علاج کیا کرتا تھا۔ دونوں کی ملاقات ایک کانفرنس میں ہوئی اور پھر دونوں اکثر ملنے لگے۔ سگمنڈ کو جب ان ملاقات کے بارے معلوم ہوا تو اس نے ہنس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور اس سے ملاقات بھی کی۔ ۱۹۲۰ء میں ایک ایسا موقع آیا کہ ہیک میں منعقد ہونے والی تحلیل نفسی کانفرنس میں فرائڈ، ایسا اور ہنس، تینوں نے شرکت کی اور اس طرح سگمنڈ فرائڈ کو ہنس کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس سے تبادلہ خیالات کر کے اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد سگمنڈ فرائڈ کا ہنس کے بارے میں نظریہ بدل گیا اور اُس نے ہنس کو ایسا کے لیے مناسب نہیں سمجھا۔ جب ایسا کو اپنے باپ کے خیالات کا پتہ چلا تو اس نے فرائڈ کو ایک خط لکھا اور ہنس سے اپنے تعلقات کے بارے میں اعتراف تو کیا، لیکن اس نے یہ بھی لکھ دیا کہ اپنے باپ کے فیصلہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے ہنس سے شادی کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے اس فیصلہ سے خوش نہیں تھی اور یہ فیصلہ صرف اپنے باپ کی خوشنودی کے لیے کیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں ہی وہ ایک ایسی تنظیم سے رضا کارانہ طور پر منسلک ہو گئی جو ایسے یہودی بچوں کی فلاح و بہبودی کے لیے کام کرتی تھی جو یتیم ہو گئے تھے یا جنگ کی وجہ سے بے گھر ہو گئے تھے۔ اس تنظیم سے جڑ جانے کے بعد اُس کو بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کے اچھے مواقع ملے اور ان سے اس نے بہت فائدہ اٹھایا۔ وہاں جب وہ بچوں سے گفتگو کرتی تھی تو وہ اُن کے ذہن میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتی تھی اور اس طرح



ان کی جذباتی کیفیت اور نفسیاتی رد عمل کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ یہ تجربات آگے چل کر اس کے بہت کام آئے کیونکہ اس نے بعد میں بچوں کی تحلیل نفسی کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اینا نے خود اپنی تحلیل نفسی کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اس سلسلہ میں وہ سگمنڈ فرائڈ سے بھی تبادلہ خیالات کرتی رہتی تھی۔ سگمنڈ نے اس کام کے لیے چار سال کا وقفہ لیا اور ۱۹۲۲ء میں اُس نے اینا کی تحلیل نفسی مکمل کر لی۔ اس وقت فرائڈ کو اپنی بیٹی کے لاشعور میں دبی ہوئی کیفیات کا علم ہوا اور اُس کو احساس ہوا کہ دو مرتبہ اُس نے اپنی بیٹی کو اپنا گھر بسانے سے روکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اینا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کبھی شادی نہیں کرے گی۔ اینا کی ذہنی اُلجھنوں کو جان لینے کے بعد اور اس کی جذباتی کیفیت سے واقف ہونے کے بعد سگمنڈ فرائڈ خود جذباتی ہو گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اینا کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور اس کی خواہشات اور تمناؤں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس کے بعد اس نے ایسا ہی کیا اور اینا کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۲۳ء میں اینا کو معلوم ہوا کہ سگمنڈ جبرے کے کینسر کا شکار ہو گیا ہے اور ڈاکٹروں نے یہ بات صرف اینا کو ہی بتائی تھی۔ لیکن جب فرائڈ کے جبرے کا پہلا آپریشن ہوا تو اُس کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ کس جان لیوا بیماری میں مبتلا ہے۔ ادھر اینا بھی اب اپنے باپ کی دیکھ بھال میں خاص خیال رکھتی تھی۔ فرائڈ کے دوستوں میں سے ایک کا خیال تھا کہ اُس وقت فرائڈ معاشی طور پر بھی بہت کمزور ہو گیا تھا اور اکثر اپنے دوستوں سے قرض لے کر اپنا کام چلایا کرتا تھا۔ اینا کو اس بات کی بھی فکر تھی اور اس نے اپنے باپ کی اس سلسلہ میں بھی مدد کی اور وہ خود اس کے ساتھ اس کی کلینک میں موجود رہتی تھی۔

۱۹۲۵ء میں اینا ایک مریض کے علاج کے دوران اُس کی ماں سے ملی جو خاص طور پر فرائڈ سے علاج کرانے کے لیے امریکہ سے وِیانا آئی تھی۔ اُس کے ساتھ کئی



بچے تھے لیکن اس کا شوہر اس کے ساتھ نہیں تھا، کیونکہ وہ خود ذہنی بیماریوں کا شکار تھا اور گھر بھر کے لیے مسائل پیدا کیا کرتا تھا۔ اُس خاتون کا نام ڈور تھی تھا۔ اینا اُس خاندان سے بہت متاثر ہوئی اور اُن دونوں میں ایک دوسرے کے لیے اتنی وابستگی تھی کہ کچھ لوگ اُن پر ہم جنسیت کا الزام لگانے لگے۔ لیکن اُن دونوں نے اس بات کا خیال نہیں کیا اور اپنی دوستی زندگی بھر نبھائی۔ اسی طرح ایک اور خاتون Eva اینا سے ملی۔ وہ بھی اپنے لڑکے کا علاج کرانے ویانا آئی تھی اور اینا نے اُس کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ فرائڈ کے آپریشن کے بعد اینا نے اس کے زیادہ تر کام اپنے ذمہ لے لیے تھے اور ساتھ ہی وہ فرائڈ کی تخلیقات کا جرمنی زبان میں ترجمہ بھی کر رہی تھی، جس سے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ ۱۹۲۹ء کے بعد فرائڈ اپنے کلینک میں بہت کم آتا تھا۔ اس نے تحلیل نفسی کی تحریک کے ترجمان کی حیثیت سے ایک رسالہ بھی شروع کیا تھا جس کا نام Verlag تھا۔ اب اس کی ادارت کی ذمہ داری بھی اینا نے سنبھال لی تھی۔

اینا کی شخصیت نفسیات کے لیے صرف اس لیے اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ وہ سکمند فرائڈ کی بیٹی تھی اور اس نے فرائڈ کے کام کو آگے بڑھایا، بلکہ وہ خود ایک ماہر نفسیات تھی اور نفسیات کے لیے اُس کی خدمات خاص طور پر اس لیے قابل ذکر ہیں کیونکہ اُس نے بچوں کی نفسیات میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا اور بچوں کی تحلیل نفسی کا طریقہ ایجاد کیا۔ جبکہ اس کام کے لیے فرائڈ نے مجبوری جتائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تلامذہ کے طریقہ سے تحلیل نفسی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مریض تحلیل کار کے سوالات کے بغیر سوچے جواب دے اور جواب دینے میں وقفہ نہ لگائے۔ یہ بات بچوں کے ساتھ ممکن نہیں کیونکہ اُن کے لیے کسی بھی سوال کے جواب میں یقینی طور پر وقفہ رد عمل طویل ہوگا جو تحلیل نفسی کے مقاصد کو حل نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں اینا جتنی مشق کی اتنی ہی مہارت حاصل کی اور ایک ایسا بھی موقع آیا کہ اُس کو اس بارے میں اپنے باپ سے پذیرائی ملی، کیونکہ فرائڈ جانتا تھا کہ بچوں کے مسائل الگ ہوتے ہیں اور بڑوں کے الگ، اور اسی طرح اُن کے امراض، کیفیات اور اُن کے سوچنے کے انداز بھی مختلف



ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن وجوہات سے بڑے افراد مرض کا شکار ہوتے ہیں، وہ وجوہات بچوں کے امراض کا باعث نہ ہوتی ہوں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے افراد نشوونما کے آخری مراحل میں ہوتے ہیں جبکہ بچے ابتدائی مراحل میں، اور اُن کے مسائل اُن کے جسمانی اور نفسیاتی نشوونما سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسا نے اس سلسلہ میں بہت اہم کام انجام دئے، کیونکہ وہ بچوں کی شخصیت کی تشکیل میں درپیش آنے والے مسائل پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی تھی اور بچوں کے والدین کی اس سلسلہ میں رہنمائی کرتی تھی۔

ایسا نے محسوس کیا کہ وہ خود ایک نفسیاتی مریض ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اس کی زندگی اپنے والد کی تیمارداری اور اپنے کام میں مصروفیت تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ سگمنڈ فرائڈ کی صحت کچھ بہتر ہو گئی تو ۱۹۲۷ء میں وہ اپنی دوست ڈور تھی کے ساتھ شمالی اٹلی کے سفر کے لیے نکل گئی تاکہ وہاں کے پُر فضا مقامات سے لطف اندوز ہو کر اپنی بوریات کو دور کر سکے۔ اس سفر سے اس کی اور ڈور تھی کی دوستی کو اور زیادہ پائیداری ملی اور دونوں نے محسوس کیا جیسے وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتیں۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر ڈور تھی، ایسا اور اس کے باپ فرائڈ کی بہت احسانمند تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایسا کے سامنے وہ اپنی شخصیت کو دبا ہوا محسوس کرتی تھی۔ دونوں نے مل کر وہاں ایک چھوٹا سا بنگلہ بھی خرید لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ سال میں ایک دو مرتبہ ضرور یہاں آیا کریں گی۔ اس پُر فضا ماحول کا اثر یہ ہوا کہ ایسا نے اپنے باپ کو لکھ دیا کہ وہ یہاں بہت زیادہ پُر مسرت محسوس کر رہی ہے اور وہ اس مقام پر دو تین ہفتہ اور رہنا چاہتی ہے۔ اس نے وہاں کے قیام کے دوران ایک کتاب بھی لکھی جس کا عنوان تھا: Psychoanalysis for Teachers and Paraents اور جب واپس آنے پر اُس نے اس کتاب کا مسودہ فرائڈ کو دکھایا تو اُس نے اس تخلیق کی تعریف کی۔

۱۹۲۹ء کے بعد ملک میں انقلاب کے آثار نمودار ہونے لگے اور ہر جگہ افراتفری کا



ماحول پیدا ہو گیا، جس کے ساتھ ہی ملک میں معاشی نِزان کے آثار دکھائی دینے لگے۔ آسٹیریا کے حکمران نے کوشش کی کہ وہ اپنے ملک کو جنگ کی حولنا کیوں سے دُور رکھے اور اُس نے اپنے آپ کو جرمنی سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا اور ۱۹۳۱ء میں اُس کے ملک پر ہٹلر نے قبضہ کر لیا اور اس کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ان حالات کی وجہ سے ایٹا کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا اور اس کی آمدنی کے ذرائع محدود ہو گئے۔ وہ جس رسالہ کی اشاعت سے کچھ آمدنی کر پاتی تھی، اُس کی فروخت بھی کم ہو گئی اور بند ہونے کی کگار پر پہنچ گیا۔

یہودیوں کو جس بات کا خطرہ تھا، وہ سامنے آ گئی اور ہٹلر نے وِیانا میں بھی اُن پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اس نے احکامات جاری کیے کہ ہر یہودی کے گھر کی تلاشی لی جائے اور جہاں جہاں یہودی مل کر بیٹھتے ہیں، ایسے اداروں کو بند کر دیا جائے اور اُن کی جائیداد پر قبضہ کر لیا جائے۔ ایسی صورت میں اب فرائڈ کے گھر پر ہر بدھ کو ہونے والے اجلاس بھی بند ہو گئے اور ایٹا نے محسوس کیا کہ وہ اب اس تحریک کو آگے بڑھانے میں ناکام رہے گی، کیونکہ فرائڈ کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اب زیادہ وقت اس کام کے لیے نہیں دے سکتا تھا۔ یہودیوں نے وِیانا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور جس طرح موقع ملا، اُس نے اس ملک سے نکل جانا ہی بہتر سمجھا۔ وِیانا کی تحلیل نفسی سوسائٹی کی مرکزی حیثیت تھی اور ایٹا اور سگمنڈ فرائڈ یہ چاہتے تھے کہ وِیانا سائیکو انالائٹیکل سوسائٹی کمزور نہ ہونے پائے اور وہ دونوں اپنی اس کوشش میں مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ چونکہ تحلیل نفسی سے منسلک بہت سے لوگ وِیانا چھوڑ چکے تھے، اس لیے اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایٹا اُس سوسائٹی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس طرح اُس کو دو محاذوں پر کام کرنا تھا۔ ایک طرف وہ خود اپنی قائم کی ہوئی تنظیم Child Guidance Centre کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھی تو دوسری طرف وِیانا کی تحلیل نفسی کی سوسائٹی کی وائس چیرمین مقرر کر دی گئی تھی۔ پھر اپنے بیمار باپ کی تیمارداری بھی اُسی کے ذمہ تھی جس کو وہ باقی تمام ذمہ



داریوں سے اہم تصور کرتی تھی۔

بچوں کی تحلیل نفسی سے متعلق اُس کی تحریک زور پکڑنے لگی تھی اور دُنیا کے مختلف ممالک نے اِس طرف توجہ کی۔ خاص طور پر امریکہ میں اِس سلسلہ میں زیادہ دلچسپی پائی جاتی تھی۔ امریکہ میں ایک رسالے کی اشاعت شروع کر دی گئی تھی جس کا کام اِس موضوع کی تشہیر کرنا تھا۔ اِس رسالے کی مہمان مدیر کی حیثیت سے اینا کو مدعو کیا گیا۔ حالات سازگار نہ ہوتے ہوئے بھی اُس نے اِس جریدہ کے ادارتی بورڈ میں شرکت کی حامی بھری، ساتھ ہی اُس نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعہ اِس نے بچوں کی تحلیل نفسی پر بہت اہم کام انجام دیے۔ اِس موضوع کو عالمگیر بنانے میں اِس کی کوششیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اِسی جریدہ کا ۱۹۳۵ء میں ایک خصوصی نمبر جاری کیا گیا جو بچوں کی تحلیل نفسی کے لیے اینا کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتا تھا۔ اِس شمارے کی اشاعت کے بعد اینا کے کام کی اہمیت پوری دُنیا کے سامنے آئی اور اِس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اِس شعبہ سے منسلک افراد دُور دُور سے اُس سے ملنے آیا کرتے تھے۔

جیسا کہ سگمنڈ فرائڈ کے تذکرہ میں بیان کیا گیا ہے، ہٹلر نے ۱۹۳۳ء میں تحلیل نفسی پر ویانا میں پابندی عائد کر دی تھی۔ اِس لیے یہ زمانہ فرائڈ کے خاندان کے لیے کافی تکلیف دہ تھا۔ نازیوں کے ظلم سے یہودی بہت پریشان تھے اور اُن کو طرح طرح سے ایذا میں دی جاتی تھیں اور پریشان کیا جاتا تھا۔ فرائڈ کی امریکہ میں کافی عزت کی جاتی تھی، اِسی طرح برطانیہ میں بھی اُس کے کام کی کافی قدر کی جاتی تھی۔ اِس نے برطانیہ میں اپنے حامی اور ہمدرد افراد کے وسیلہ سے کسی طرح ویانا سے نکل جانے کی اجازت حاصل کر لی اور وہ ۱۹۳۶ء میں لندن چلا گیا۔ اُس وقت تک اُس کی بیماری کافی بڑھ چکی تھی اور اُس کو سخت تکلیف کا سامنا تھا اور یہ بات اینا کو ہر وقت پریشان رکھتی تھی اور یہ پریشانی فرائڈ کی موت کے بعد ہی ختم ہوئی۔

اینا نے لندن آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہاں اِس کے کام کی قدر بھی



کی جاتی تھی۔ لیکن وہاں اس کو کچھ مخالفین سے بھی واسطہ پڑا، یہ وہ لوگ تھے جو فرائڈ کے بھی مخالف رہ چکے تھے۔ اینا کے ساتھ اُس کی دوست ڈور تھی بھی لندن آگئی تھی۔ اس نے اینا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مخالفین سے حراساں نہ ہو بلکہ اپنا کام جاری رکھے۔ اُن دونوں نے مل کر لندن میں ایک ادارہ قائم کیا اور اُس کے ذریعہ ایسے بچوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا جاتا تھا جو جنگ کی وجہ سے بے سہارا ہو گئے تھے۔ اُن بچوں کو مادرانہ شفقت نہ ملنے کی وجہ سے اُن کی نفسیاتی کیفیت پر گہرے اثرات پڑتے تھے۔ اینا نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا اور ایک ایسی فلاحی تنظیم قائم کی جو ایسے بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس تنظیم میں ایسی رضا کار خواتین کو مدعو کیا جاتا تھا جو اپنی اولاد سے محروم ہو چکی تھیں اور ان کو تربیت دی جاتی تھی کہ وہ اس تنظیم میں موجود بے سہارا بچوں کو مادرانہ شفقت دے کر اُن سے ایک رشتہ قائم کریں اور اُن سے وابستگی کا احساس دلائیں، تاکہ بچے اپنے والدین کی کمی کو محسوس نہ کریں۔ اینا کی یہ کوشش بہت کامیاب ہوئی اور لندن کے عوام نے اس کی بہت ہمت افزائی کی۔ یہ تنظیم آج بھی قائم ہے اور اب ایک یتیم خانہ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس تنظیم کے تحت جن بچوں کو رکھا گیا تھا ان کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کیا گیا اور اس موضوع پر اینا نے کئی مقالات لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں اینا نے بچوں کے نفسیاتی علاج کے لئے ایک کورس کی ابتداء کی، جس کے تحت ایسے ڈاکٹروں کو تربیت دی جاتی تھی جو بچوں کے امراض میں مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ تربیت گاہ مقبول ہوئی اور اس میں لوگوں نے کافی دلچسپی دکھائی۔ پانچ سال کے بعد اینا نے اسی تربیت گاہ سے منسلک ایک کلینک بھی قائم کر دی، جہاں بچوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تربیت پانے والے ڈاکٹروں کے لیے تجربہ کے ذرائع بھی دستیاب ہو گئے تھے۔ اینا کے اس قدم سے کافی اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اینا نے بچوں کی نفسیات بھی ایک مضمون کی حیثیت سے شامل کر دیا اور اس موضوع پر وہ خود لیکچر دیتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ادارہ بچوں کی



نفسیات کے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا اور لندن میں کافی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس تنظیم سے برطانیہ کے بہت سے ماہرینِ نفسیات بھی منسلک ہو گئے اور بچوں کی نفسیات پر کام کرنے لگے۔

۱۹۵۰ء تک اس ادارہ کی شہرت دُنیا کے بہت سے ممالک تک پہنچ گئی تھی، خاص طور پر امریکہ میں اس سلسلہ میں کافی دلچسپی لی جا رہی تھی اور اینا کو وہاں سال میں کئی بار لیکچر کے لئے مدعو کیا جاتا تھا۔ اینا نے بچوں کی ذہنی کیفیت اور نفسیاتی مسائل کے سلسلہ میں تقریباً بیس سال تک مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہاں ایسے بچوں کے علاج کے لیے ادارے قائم کیے جنہیں مادرانہ شفقت اور جذباتی وابستگی کی ضرورت تھی۔ اپنے موضوع سے اس کی والہانہ دلچسپی، جو دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اُسے چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتی تھی اور اس سلسلہ میں اُس کی دوست ڈور تھی برابر اس کے شانہ بہ شانہ اُس سے تعاون کرتی تھی۔ اینا کو ”پُر جوش فیض بخش معلمہ“ کہا جاتا تھا۔ اس کی خدمات کو سراہنے کے لیے اُس نے جو ادارہ لندن میں قائم کیا تھا، اس کا نام Anna Freud Centre رکھ دیا گیا۔ اینا فرائڈ اپنی شہرت کے ایک بلند مقام پر پہنچنے کے بعد ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو انتقال کر گئی۔ جس گھر میں وہ رہتی تھی، اُس کو فرائڈ میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا، ساتھ ہی اسی جگہ تحلیل نفسی سے متعلق تحریک کا مرکز بھی قائم کر دیا گیا۔

اینا فرائڈ نے زندگی بھر ایک فعال زندگی گزاری۔ بچوں کی نفسیات کے بارے میں اس کی کوششوں کا اوپر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نفسیات میں اُس کے دفائی میکانیہ سے متعلق نظریہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے باپ کے مفروضہ (ایڈ) کو زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ اُس کے خیال میں انا کی نشوونما کی اہمیت زیادہ تھی، جس کی وجہ سے فرد مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے تگ و دو کرتا رہتا ہے۔ اس نے اپنے ساتھی دوسرے ماہرینِ نفسیات، خاص طور پر Erik Erikson، Edith Jacobson اور Margerate Mahler کے خیالات اور تجربات سے بھی استفادہ کیا۔ اس نے ایسے ماہرینِ نفسیات کا ایک گروپ تشکیل دیا تھا



جو بچوں کی نفسیات سے دلچسپی رکھتے تھے اور اس گروپ میں بچوں کے مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اینا کی ان کوششوں کی وجہ سے طفلانہ نشوونما سے متعلق بعض نظریات وضع کیے گئے اور یہ بات واضح کی گئی کہ بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت اُن کے نشوونما پر اثر انداز ہوتی ہے اور ساتھ ہی اُن کی شخصیت کی تعمیر میں بھی اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ حالانکہ اب بچوں کی نفسیات کا شعبہ نفسیاتِ نمو میں ضم ہو گیا ہے، لیکن اینا فرائڈ نے اس سلسلہ میں جو کام کیے ہیں، اُن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس نے بچوں میں پیدا ہونے والے نفسیاتی عارضوں کے علاج اور اُن کی پہچان کی جو تکنیک ایجاد کی تھی، اُس کی وجہ سے اینا فرائڈ کا نام نفسیات میں ہمیشہ باقی رہے گا۔ اینا فرائڈ کی تخلیقات The Writings of Anna Freud کی شکل میں سات جلدوں میں دستیاب ہیں، جس میں اس کی تمام تخلیقات شامل ہیں اور اس میں اس کی شہرہ آفاق تخلیق The Ego and the Mechanism of Defense بھی شامل ہے۔ اینا نے اپنے باپ کی زندگی اور اس کے کام کو ۲۴ جلدوں میں پیش کیا ہے، جس میں اُس نے سگمنڈ فرائڈ کے تمام مفروضات اور نظریات کو ایک جگہ جمع کر کے پیش کیا ہے اور اس مجموعہ کو پڑھنے کے بعد فرائڈ کو بہتر طریقہ پر سمجھا جاسکتا ہے اور اسی کام کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے اپنے باپ سے وابستگی کا حق ادا کر دیا۔





# ڈیوڈ ہیوم

David Hume ( 1711-1776)

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ برطانیہ کے لوگ کسی بھی فرد کے بارے میں اپنا خیال قائم کرنے سے پہلے اُس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرتے ہیں۔ یہ خاصیت تو ہر علاقے کے عوام میں ہونا ضروری ہے۔ اس کو صرف برطانیہ کے عوام سے منسوب کر دینا مناسب نہیں ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ کے دانشوروں اور مفکرین نے ڈیوڈ ہیوم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہیوم کی ہمہ گیر شخصیت کو مختلف زاویوں سے جانچا ہے، پرکھا ہے، اور پھر کہا ہے کہ.....

”ہیوم ہماری سیاست ہے، ہیوم ہماری تجارت ہے، وہ ہمارا مذہب ہے

اور وہی ہماری تہذیب کی شان ہے۔“

یہ بیان اُنیسویں صدی کے مشہور فلسفی جیمس اسٹرلنگ کا ہے اور اُس کے اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اُنیسویں صدی میں ڈیوڈ ہیوم کی دانشوری اور فکری بلندیوں کو نہ صرف تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ ان کی قدر کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ تھی کہ ہیوم نے بعض ایسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا تھا جو اُس وقت تک فلسفہ میں زیرِ بحث نہیں آئے تھے۔

مثال کے طور پر ذاتی شناخت کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ کسی فرد کی شخصی



خصوصیات مستقل نہیں رہتیں۔ ایسے زمانہ میں جب مذہب پر کسی اعتراض کو بہت بُرا سمجھا جاتا تھا، اُس نے اس موضوع پر کھل کر بحث کی اور کہا کہ مذہب کی بنیاد چند معجزات پر نہیں رکھنی چاہئے اور ہمیں ایسے عقائد کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے جو اتفاقات کو معجزات سمجھ کر اُن کو اپنے عقیدے کی بنیاد سمجھ لیتے ہیں۔

ڈیوڈ ہیوم اشاک ہوم کے ایک متوسط گھرانے میں ۱۷۱۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ جس خاندان میں وہ پیدا ہوا تھا اُس کی دلچسپی سیاست اور مذہبی رسومات میں زیادہ تھی، اس لیے ہیوم بچپن سے ہی اپنے بزرگوں کے ساتھ مقامی گر جاگھر میں عبادت کے لیے جایا کرتا تھا۔ ڈیوڈ ہیوم کی ابتدائی تعلیم اُس زمانہ کے رواج کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔ وہ بہت چھوٹا تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری اُس کی بیوہ ماں کے ہی سپرد تھی جو چرچ کے پادریوں کے مشورہ پر عمل کرتی تھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا تھا ہے کہ ہیوم کی تعلیم و تربیت میں مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اُس کے خطوط سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کس طرح بچپن میں ہی اُس کو مذہبی امور میں دلچسپی لینا سکھایا جاتا تھا اور اُس کی زندگی اخلاق اور مذہبی پابندیوں کے گھیرے میں گزری تھی۔

جب وہ گیارہ برس کا تھا تو اپنے شہر سے ایڈنبرا آ گیا جہاں اُس نے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اُس کے خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اُس نے مذہبی تعلیم کو جاری رکھا اور اپنا زیادہ وقت وہ مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں گزارتا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کا ہوا تو ایڈنبرا کے ماحول سے اُکتا گیا اور اپنے شہر واپس آ گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خانگی طور پر اپنی تعلیم جاری رکھے گا، اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ قانون کو اپنا موضوع بنائے گا۔ یہ فیصلہ اُس نے کیوں کیا؟ اس بات کا اُس کے خطوط میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اُس کی توجہ فلسفہ کی جانب مبذول ہو گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس دور میں فلسفہ کافی مقبول تھا۔ اس لیے اُس نے قانون کی تعلیم منقطع کر دی اور ایک معلم کے ذریعہ گھر پر ہی فلسفہ کی تعلیم حاصل



کرنے لگا۔ کچھ مفکرین نے اس بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ وہ مذہبی کتابیں پڑھا کرتا تھا اور اُن کتابوں میں مذہب سے متعلق فلسفیانہ طور پر خدا کے وجود کے بارے میں بحث ملتی تھی، اس لیے اُس نے فلسفہ کو ہی اپنے لیے بہتر سمجھا۔ فلسفہ کی تعلیم کے دوران اُس نے مذہب سے متعلق اپنے خیالات قلمبند کرنے شروع کئے۔ مذہبی امور سے متعلق اپنے خیالات پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی، جس میں مذہب سے متعلق کئی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ڈیوڈ ہیوم کی یہ کتاب شائع نہ ہو سکی کیونکہ اس کا مسودہ ضائع ہو گیا تھا، لیکن اس کتاب کے کچھ صفحات لوگوں کے پاس بعد میں ملے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے.....

”جب میری عمر ۲۰ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی، اُس وقت میں نے خدا کے وجود کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اُس وقت مجھے خدا کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اس لیے میرے ذہن میں اُس کے وجود کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے اور اس مسئلہ پر میں جتنا سوچتا اور گہرائی میں جانے کی کوشش کرتا، اتنا ہی ملحد ہوتا جاتا تھا۔“

اُس نے یہ بھی اعتراف کیا تھا کہ مذہب کے بارے میں اُس نے یونانی زبان میں جو کچھ پڑھا تھا، قانون کی کتابوں سے اُس خیال کو تقویت ملی۔ ۳۰ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اپنی خانگی تعلیم کے دوران ڈیوڈ ہیوم نے فرانس کا بھی دورہ کیا اور وہاں کچھ عرصہ مقیم رہا۔ اُس نے اُن ہی دنوں میں اپنی ایک بہت ہی اہم تخلیق *Treatise of Human Nature* مکمل کی۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کی پہلی دو جلدیں مصنف کے نام کے بغیر شائع ہوئیں، پھر بھی اُس کی یہ تخلیق فلسفہ سے تعلق رکھنے والے دانشوروں میں بحث کا موضوع بن گئی، کیونکہ اُس زمانہ میں یہ بہت ہمت کا کام سمجھا جاتا تھا کہ ایسے موضوع پر اتنے صاف انداز میں بحث کی جائے۔ چونکہ اس پر مصنف کا نام نہیں تھا، اس لیے اُس کی پہلی قسط کے بعد اُس پر اعتراضات کئے گئے اور اس پر تبصروں میں طنز یہ انداز پایا جاتا تھا۔ لیکن جب اُس کی



تیسری جلد ڈیوڈ ہیوم کے نام سے شائع ہوئی تو اُس نے فلسفہ کے حلقوں میں دھوم مچا دی۔ اس کی یہ تخلیق بہت مقبول ہوئی کیونکہ اس میں بہت سے اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔

۱۷۴۱-۴۲ میں ڈیوڈ ہیوم نے اپنی دوسری تخلیق Essays, Moral and Political شائع کی۔ یہ بھی دو جلدوں میں تھی اور اس میں اُس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اُس کی زبان ایسی ہو جو عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کتاب مقبول ہوئی اور اس کتاب کی وجہ سے ڈیوڈ ہیوم نے اپنی پہچان ایک فلسفی کی حیثیت سے قائم کر لی۔

اُسی زمانہ میں ایڈنبرا یونیورسٹی میں فلسفہ اخلاقیات کے شعبہ میں پروفیسر کی جگہ خالی ہونا تھی۔ ڈیوڈ ہیوم نے اس اسامی کے لیے درخواست دی۔ اُسی جگہ کے لئے William Cleghorn بھی اُمیدوار تھا اور اس کو یونیورسٹی میں اس شعبہ کے صدر کی حمایت حاصل تھی۔ اس نے اپنے ایک دوست کے نام سے ڈیوڈ ہیوم کے اُن خیالات کی تشہیر کی جو اس نے اپنی کتاب میں مذہب کے بارے میں لکھے تھے اور کونسل میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ڈیوڈ ایک دہریہ ہے اور اس جگہ اُس کا تقرر کیا گیا تو اس یونیورسٹی سے جو لوگ تعلیم حاصل کر کے نکلیں گے، وہ بھی ڈیوڈ کے خیالات سے متفق ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کونسل کے پندرہ اراکین میں سے بارہ نے ڈیوڈ کی مخالفت کی اور ڈیوڈ کو اپنی اُمیدواری سے دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن اُس نے اپنے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا اور ایک کتابچہ A Letter from a Gentleman to his Friend in Edinburgh کے نام سے شائع کر دیا۔

اس طرح اُس کا کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ ۱۷۴۵ء میں اُس کو ایک جنرل کے سیکریٹری کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اور وہ اُس کے ساتھ ایک مہم پر چلا گیا۔ اس دوران بھی وہ فلسفہ سے منسلک رہا اور تخلیقی کام جاری رکھے۔ ۱۷۴۸ء میں اُس نے Of National Character کے عنوان سے ایک



مضمون شائع کیا جس میں اُس نے چرچ کے پادریوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اُس نے لکھا کہ یہ پادری دراصل خود پسندی اور تکبر سے معمور ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو مذہب کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اُس پیشہ سے بڑی بڑی خواہشیں رکھتے ہیں اور اُس پیشہ کو وہ انتقام کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اُس کا یہ مضمون چرچ سے عقیدت رکھنے والوں کو پسند نہیں آیا اور اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ لیکن دانشوروں کا ایک ایسا بھی طبقہ تھا، جس نے ڈیوڈ ہیوم کی اس ہمت کی داد دی اور اُس کو سراہا۔ اس ہمت افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیوڈ ہیوم نے اُسی سال اپنی ایک اور تخلیق مکمل کر کے شائع کر دی جس کا عنوان Enquiry Concerning Human Understanding تھا۔ اس کتاب میں بھی اُس نے مذہبی روایات پر براہِ راست حملہ کیا اور عیسائیت کو ڈھکوسلوں اور نام نہاد معجزات کے مذہب کا نام دیا۔ اس کتاب میں دراصل اُن ہی خیالات کا صاف صاف اظہار کیا تھا جو وہ پہلی کتاب میں نہیں کر سکا تھا۔

۱۷۵۱ء میں اس نے ایک اور کتاب Concerning the Principles of Morals کے عنوان سے شائع کی۔ حالانکہ اس کتاب میں اُس نے مذہب پر براہِ راست کوئی تنقید نہیں کی تھی، لیکن اُس نے اخلاقیات کے تحت ایک نظام قائم کرنے پر زور دیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ انسانی جذبات کے تحت اخلاقی اقدار کی افادیت کو اہمیت دی جانی چاہیے، نہ کہ مذہبی توہمات پر۔ اُس کی اس تخلیق کو بھی ہر طرف سے زبردست تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور اُس کی مخالفت میں ملک کے کئی مشہور مفکرین بھی شامل ہو گئے اور سب نے ڈیوڈ ہیوم کو ملحد اور دہریہ کا لقب دے دیا۔ اُس کے اس مضمون پر تنقید کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اُس نے ایک اور مقالہ Political Discourses شائع کیا۔ اس مقالہ کی وجہ سے ڈیوڈ ہیوم کا نام معاشیات اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والے مفکرین تک پہنچا اور اُس کی کافی پذیرائی کی گئی۔ اس مقالے کی تعریف کرنے والوں میں آدم سمیٹھ، گوڈون اور تھومس مالتھس جیسے عظیم دانشور بھی شامل تھے اور اس کی وجہ سے ڈیوڈ ہیوم کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کے پہلے ناقدین اور وہ



لوگ، جنہوں نے اس پر ملحد ہونے کا الزام لگایا تھا، وہ خاموش ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ ہیوم کا نام فلسفیوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ اگلے سال ہی اُس نے اپنی اس کامیابی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پھر ایک بار گلاسگو یونیورسٹی میں پروفیسر کی اسامی کے لیے درخواست دی۔ لیکن یہاں بھی اُس کو ناکامی ملی۔ اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو فلسفہ کا معلم ہونے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

۱۷۵۲ء میں اُس کو ایڈنبرا کے وکیلوں کی لائبریری میں بحیثیت لائبریرین ملازمت مل گئی۔ اس عہدہ پر تقرر ہونے کے بعد کہا جاتا ہے کہ ڈیوڈ ہیوم کی شخصیت میں نکھار آنا شروع ہوا اور اُس نے فلسفہ کے بجائے تاریخ میں مطالعہ شروع کر دیا اور لائبریری کے ذخیرہ کتب سے استفادہ کرتے ہوئے اس نے History of England کی چھ جلدیں مکمل کر لیں۔ اس کتاب کا عنوان ہی ایسا تھا کہ وہ برطانیہ کے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہو گئی۔ لیکن پہلی ہی جلد شائع ہونے کے بعد ڈیوڈ ہیوم کی زوردار مخالفت شروع ہو گئی کیونکہ اُس نے اس میں بھی عیسائیت پر رکیک حملے کیے تھے۔ چونکہ یہ کتاب عام لوگوں نے بھی پڑھی تھی، اس لیے اس بار مخالفت میں ملک کے دانشور ہی نہیں، بلکہ عوام بھی شریک ہو گئے۔ اس کتاب میں اُس نے اس مذہب کے دونوں فرقوں کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ اُس نے رومن کیتھولک کو توہمات کو بڑھاوا دینے والا مسلک قرار دیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ رومن کیتھولک کے تمام عقائد کی بنیاد ضعیف الاعتقادی پر رکھی ہے، دوسری طرف اُس نے Protestant تحریک کے حامیوں کی بھی مخالفت کی اور انہیں مذہبی جذبات سے کھیلنے والا اور پُر جوش اور متعصب کا خطاب دے ڈالا۔ اُس نے لکھا کہ اس تحریک کی بنیادیں اُن لوگوں نے رکھی ہیں جو خود غیر حقیقی مذہب سے متعلق جوش کی وجہ سے جانبداری کے جذبہ سے پُر تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں پر مذہبی عقائد جنون کی حد تک چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے اُس کی عیسائیت پر اتنی سخت تنقید کی وجہ سے عوام کا بھی ایک بڑا طبقہ اُس کا مخالف ہو گیا۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک فرقہ پر وہ تنقید کرتا تو کم از کم دوسرا فرقہ اُس کی



حمایت کو آتا۔ لیکن اُس نے دونوں فرقوں کی مخالفت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس مذہب کی مخالفت ہی اُس کا مقصد ہے۔ اس لیے چاروں طرف سے اُس پر تنقید ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اپنی کتاب سے وہ دونوں باب حذف کر دیے جن میں اُس نے مذہب پر تنقید کی تھی۔ اس کے ساتھ اُس نے مذہب کے موضوع پر دو بہت ہی اہم تخلیقات شائع کیں۔ یہ دونوں کتابیں اس نے The Dialogues Concerning Natural Religion اور The Natural history of Religion کے عنوان سے مکمل کیں۔ دوسری کتاب تو اس نے ۱۷۵۷ء میں شائع کر دی اور اپنے دوستوں اور بھی خواہوں کے مشورہ کو تسلیم کرتے ہوئے پہلی کتاب کی اشاعت روک دی اور یہ کتاب اُس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی بلکہ اُس کی موت کے تین سال بعد ۱۷۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اپنی اس کتاب کے سلسلہ میں ڈیوڈ ہیوم اتنا پُر جوش تھا کہ وہ کتاب کے مواد کو پوشیدہ نہ رکھ سکا اور اُس کے مضمون کا لب لباب اپنی اگلی تخلیق Five Dissertations میں ایک باب کی شکل میں شامل کر دیا، ساتھ ہی اس کتاب میں Of Suicide کے عنوان سے ایک باب شامل کیا جس میں اُس نے انسانوں کے خودکشی کے فیصلہ کی وکالت کرتے ہوئے لکھا کہ.....

”زندگی انسان کی ہے اور یہ اُس کا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے اُسے جئے، ساتھ ہی یہ بھی اُس کا حق ہے کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے اپنی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کر لے اور اس سلسلہ میں اُس کے مذہب کا اس میں کوئی دخل نہیں۔“ اس طرح چونکہ عیسائیت میں خودکشی کو جرم قرار دیا تھا اور ڈیوڈ نے اس کی مخالفت کی۔“

..... ساتھ ہی ایک اور باب میں اس نے لکھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور اس طرح اُس نے مذہب کے ایک اور اصول کی مخالفت کر ڈالی۔ یہ کتاب جیسے ہی بازار میں آئی، ہر جگہ اُس کی مخالفت کیں آوازیں اٹھنے لگیں، ہر جگہ مظاہرے کئے گئے اور ایک عوامی تحریک چلا کر یہ مطالبہ کیا کہ اس کتاب کے مصنف



اور پبلشر کو موت کی سزا دی جائے اور چوراہے پر اُن دونوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے تاکہ آئندہ کوئی اس طرح مذہب پر حملے نہ کر سکے۔ اس طرح کے احتجاج سے مجبور ہو کر پبلشر نے اس کتاب کی تمام جلدیں واپس لے لیں اور اس میں سے وہ دو باب، جن پر سب سے زیادہ اعتراض تھا، حذف کر کے ایک نیا باب Of Standard of Taste کے عنوان سے اُس میں اضافہ کیا اور کتاب کا نام بھی بدل کر Four Dissertations رکھا اور اس کو پھر شائع کر دیا۔

ہیوم کی عمر ۵۰ سال کی تھی جب اس کو ۱۷۶۳ء میں Earl of Hertford کے ساتھ پیرس میں سفارت خانہ جانے کی پیشکش کی گئی۔ ہیوم نے یہ پیشکش اس لیے قبول کر لی کیونکہ اُس کو اُمید تھی کہ مستقبل میں اس کا تقرر بحیثیت سیکریٹری ہو جائے گا اور اس کی یہ اُمید بھی پوری ہو گئی۔ پیرس میں اُس نے اپنے کام کی وجہ سے سب کا دل جیت لیا اور اُس کی فکری بلندیوں کو تسلیم کرتے ہوئے وہاں کے دانشوروں نے بھی اس کی خدمات کو سراہا۔ وہ تین سال بعد ہی ایڈنبرا واپس آ گیا اور اپنے تخلیقی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ وہ کوشش کرتا رہا کہ ملک کے سربراہوں سے اپنے تعلقات بڑھائے اور اسی کوشش میں اُس نے بہت سے عہدہ داروں سے اپنے تعلقات بڑھا لیے، ساتھ ہی اُس زمانہ کے مشہور مفکرین سے بھی ملتا رہا اور اپنا ایک حلقہ تیار کر لیا۔ اس نے جن دانشوروں سے اپنے تعلقات پیدا کیے اُن میں روسیو بھی تھا، جس کو سوئزرلینڈ کی حکومت نے ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا تھا۔ ڈیوڈ ہیوم نے اس کو برطانیہ بلا لیا، اور اتنا ہی نہیں، اُس کے لیے حکومت کی جانب سے وظیفہ بھی منظور کرا دیا۔ لیکن روسیو نے اُس کی مہربانیوں کا غلط مطلب لیا اور اس نے ہیوم پر الزام لگایا کہ وہ ایک سازش کے تحت روسیو کا کیریئر تباہ کرنا چاہتا ہے۔ ڈیوڈ ہیوم نے اس کے جواب میں ایک کتابچہ A Concise and Genuine of Dispute Between Mr. Hume and Rousseau شائع کر دیا اور اس میں ان خطوط کی نقول بھی شائع کر دیں جو اُن دونوں کے درمیان ہوئے تھے۔ برطانیہ کے علمی حلقہ میں اس کتابچہ کی وجہ سے ہیوم کو



اُن الزامات سے بری کر دیا جو روسیو نے لگائے تھے اور ساتھ ہی اُن سب کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ روسیو ذہنی طور پر بیمار ہے اور اس بات سے روسیو کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے بعد ڈیوڈ ہیوم پھر دو سال کے لیے ایک سفیر کے سیکریٹری کی حیثیت سے ملک سے باہر رہا اور ۱۷۶۸ء میں واپس آ گیا۔

اس کے بعد وہ کہیں نہیں گیا اور اپنی تخلیقات پر نظرِ ثانی کرتا رہا۔ ۸ سال کی مدت اُس نے برطانیہ کے ہی نہیں بلکہ یورپ کے دوسرے ممالک سے آنے والے مشاہیر کے ساتھ رہ کر گزارے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو اُن دنوں آنتوں کی بیماری ہو گئی، جس کی وجہ سے وہ ملک سے باہر جانے سے کتراتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کو آنتوں کی ٹی۔بی ہو گئی تھی اور وہ اس بیماری میں طویل عرصہ تک مبتلا رہا۔ اُس کی موت سے چند ماہ پہلے ڈاکٹروں کے مشورہ سے اُس کو آب و ہوا بدلنے کے لیے ایڈنبرا سے باہر بھی لے جایا گیا۔ لیکن اس کو سکون نہیں ملا اور واپس اپنے گھر آ گیا، اور اُسی حالت میں وہ ۱۷۷۶ء میں انتقال کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہیوم نے مرنے سے کوئی چھ ماہ پہلے اپنی سوانح My Own Life کے عنوان سے مرتب کی تھی اور اُس نے اس کتاب میں دو باب روسیو اور بیٹی سے اپنے اختلافات کے بارے میں بھی لکھے تھے۔ لیکن اُس نے اس کتاب میں شامل نہیں کیے اور اُس کی موت کے بعد ان دونوں ابواب کے مسودے ملے۔

اُس کی زندگی کے آخری دنوں میں ملک کے مشہور دانشور اس کی عیادت کو آتے تھے۔ اُن میں آدم سمتھ اور جیمس بوسویل بھی شامل تھے اور ان دونوں نے اپنی آخری ملاقاتوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہیوم آخری وقت تک خوش و خرم تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اب اُس کی موت قریب ہے، اُس کے چہرے پر کبھی مایوسی یا اُداسی نظر نہیں آئی۔ آدم سمتھ کو ہیوم اپنا قریبی دوست کہتا تھا، لیکن وہ کبھی کبھی ہیوم پر طنز بھی کیا کرتا تھا۔ اُس نے ڈیوڈ ہیوم کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ ہیوم کی موت کے تقریباً چھ ماہ بعد شائع ہوا۔ اسمتھ نے یہ اعتراف کیا کہ ہیوم کی شخصیت برطانیہ کے لیے قابلِ فخر ہے۔ اس نے یہ بھی



لکھا کہ ہیوم کی دانشوری اور فکر کا معیار اتنا بلند تھا کہ شاید ہی مستقبل میں کوئی فلسفی اس کے مقابل کا پیدا ہو۔

ڈیوڈ ہیوم نے براہ راست نفسیات کو اپنا موضوع نہیں بنایا، لیکن جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے، نفسیات فلسفہ سے الگ تھی ہی نہیں اور فلسفہ میں اُن موضوعات پر بحث ہو، جو نفسیات کے تحت آتے ہیں، تو اس سے نفسیات کو فائدہ پہنچتا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس زمانہ میں لکھنے والے نے ایسے موضوعات پر اظہار خیال کرتے وقت نفسیات کو اپنے ذہن میں نہ رکھا ہو، لیکن اب، جبکہ نفسیات ایک الگ علم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، ہم ان تحریروں کو مختلف خانوں میں رکھ کر ان پر بحث کر سکتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات نے ڈیوڈ ہیوم کی تحریروں کا نفسیات سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور خاص طور پر نظریہ اختلافیت کے حامی ڈیوڈ ہیوم کو ہی اس نظریہ کا بانی تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح Monoism (نظریہ وحدت وجود، یہ عقیدہ کہ مادہ اور روح کی تفریق غلط ہے، یہ دونوں ایک ہیں۔) کے حامی بھی یہ مانتے ہیں کہ ڈیوڈ ہیوم نے نفسیات کی اہم خدمات انجام دی ہیں، خاص طور پر جسم اور روح کے تعلق سے اس کا خیال کہ صرف Idea جو ہمارے حواس کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں، اُن کی اہمیت ہے۔ ڈیوڈ ہیوم نے اختلافیت کے تین اصولوں میں سے ایک بہت اہم یعنی اصول علت (The Principle of Cause and effect) وضع کیا۔ اُس کے خیال میں یہ اصول دراصل اصول اتصال سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ یعنی اس اصول میں علت اور تاثیر، دونوں میں اتصال کے بعد ہی اس اصول کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ اُس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ علت اور معلول کے اتصال کے بعد ہی تصور عین (Idea) کا وجود ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے دونوں اصولوں کو ایک دوسرے میں ضم کر کے اصول علت و معمول کو ختم کر دیا۔ لیکن N.K. Smith (جس نے ڈیوڈ ہیوم کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے) کے خیال میں ہیوم نے نظریہ علت و معلول کے وجود سے انکار نہیں کیا بلکہ زمانی اور مکانی اتصال کے بعد اس کی شکل تبدیل کر دی۔ اُس نے اس طرح



صاف اور واضح تاثر (جس کو ہم حسیت یا ادراک کہہ سکتے ہیں) اور واضح آئیڈیا (جس کو ہم شبیہ اور یادداشت کہہ سکتے ہیں) میں فرق ظاہر کیا۔ اُس کے اس نظریے کو سامنے رکھ کر وونٹ اور ساختیت کے حامی مفکرین نے ان دونوں اصولوں میں ایک واضح تفریق پیدا کی تھی۔

حالانکہ ڈیوڈ ہیوم نے باقاعدہ کسی کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور اُس کو کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری بھی نہیں ملی تھی، اس کے باوجود وہ اپنی تخلیقات کی وجہ سے کافی اہم شخصیت مانا جاتا ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ برطانیہ کے عظیم ترین فلسفیوں کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس کی ہمہ گیر شخصیت نے برطانیہ کی سیاست اور وہاں کی معاشیات میں اہم خدمات انجام دیں۔ ڈیوڈ ہیوم کے مقالات کی فہرست اگر دیکھی جائے تو بہت طویل ہے اور اس نے بہت سے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کی تخلیقات کی فہرست میں نفسیات کے علاوہ اخلاقیات پر بھی مقالات ملتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا جا چکا ہے کہ اس کی بعض تحریروں کی سخت مخالفت کی گئی اور یہ تحریریں خاص طور پر مذہب سے متعلق تھیں۔ اُس نے ایک مقالہ پریس کی آزادی پر بھی لکھا، ایک حکومت کے اصولوں پر اور ایک پارلیمنٹ کی آزادی پر۔ اسی طرح سیاسی اخلاقیات پر بھی اُس کے مضامین ملتے ہیں۔ اُس نے حکومت کے اصولوں پر بھی اظہار خیال کیا اور ایسے موضوعات پر بھی جو عام آدمیوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے ایک مقالہ عشق اور شادی کے عنوان سے ملتا ہے، ایک کثیرتالازدواج اور طلاق کے بارے میں بھی۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی ادب پر بھی کئی مقالات لکھے۔

اُس کی سب سے اہم خدمات عالمی تجارت کے تعلق سے سمجھی جاتی ہیں۔ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ دنیا کے بڑے بڑے ممالک سے تجارت کے ذریعہ ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اُس کا کہنا تھا کہ ملک کی دولت ضروری اشیاء کی مقدار پر منحصر ہوتی ہے۔ اُس نے اپنے ملک میں اس بات پر بھی زور دیا کہ سود کی شرح کم کر دینی چاہئے تاکہ ملک کی دولت کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہو



سکے۔ اس سلسلہ میں اس کے دو مقالات Of Money اور Of Jealousy Trade کافی مشہور ہیں۔

ڈیوڈ ہیوم کی تخلیقات کی تعداد ۱۹ بتائی جاتی ہے اور ان کے علاوہ اُس کے کچھ مقالات ایسے بھی ہیں جو اُس نے لکھے، لیکن شائع نہیں کئے، اور اُن کے مسودے اُس کی موت کے بعد ملے۔ اُس کے خطوط کا مجموعہ پانچ جلدوں میں شائع ہوا۔ ان جلدوں میں وہ خطوط بھی شامل تھے جو کہ ہیوم نے لکھے تھے، اور وہ بھی جو ملک کے مشہور دانشوروں نے ہیوم کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ڈیوڈ ہیوم کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آ جاتے ہیں اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معاصر مشکریں میں کتنی وقعت رکھتا تھا۔ اگر برطانوی عوام اس کو ملک کا سب سے اہم فلسفی مانتی ہے تو وہ غلط نہیں ہے۔

○○



**Tibbi Books for  
Atiba Karam**



P18



# یادداشتیں



نفسیات پر سید اقبال امر وہوی کی چوتھی تخلیق ”نفسیات کے معمار“ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ”اصطلاحات نفسیات: تشریح و تفہیم“ اردو میں اپنی طرز کی پہلی کوشش تھی۔ جس سے نفسیات کے طلباء نے بھرپور استفادہ حاصل کیا، اور اس طرز پر دوسرے سائنسی علوم کی اصطلاحات کی تشریح شائع کرنے کے لیے ایک راہ بھی دکھائی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے پڑوسی ملک میں جہاں نفسیات پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں، اور جامعات میں اردو کے ذریعہ نفسیات کی تعلیم کا انتظام بھی ہے، وہاں اس کتاب کی افادیت کو تسلیم کیا گیا اور اس کو ”نفسیات کا انسائیکلو پیڈیا“ کے نام سے نگارشات پبلشرز نے شائع بھی کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے نہ تو مصنف سے اور نہ ہی پبلشر سے اجازت لی، اور نہ اطلاع دی۔ معلوم ہوا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں نفسیات کے طلباء میں یہ کتاب بہت مقبول ہے اور انٹرنیٹ پر پبلشر نے اسے Best Seller کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ چونکہ دونوں ممالک میں کاپی رائٹ کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہے، اس لیے قانونی چارہ جوئی کی بھی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی اسی ادارے سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے ”قہے“ میں شائع ہونے والے سید اقبال امر وہوی کے نفسیاتی مضامین پڑوسی ملک کے مختلف جرائد میں نقل کیے گئے ہیں۔ مگر انہوں نے اخلاقی طور پر سہ ماہی ”قہے“ کا حوالہ دے کر ہی شائع کیے ہیں۔

یہ بات بھی ہمارے علم میں آئی ہے کہ مصنف کی تیسری کتاب ”روزمرہ کی نفسیات“ کو بھی کسی اور نام سے وہاں شائع کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب ”نفسیات کے معمار“ مصنف کی ایک اہم تصنیف ہے۔ نفسیات کی ابتداء سے اب تک اس علم کو مختلف دانشوروں نے اپنے نظریات کے ذریعہ کس طرح ایک مکمل اور ترقی یافتہ علم کی شکل دی ہے، یہ بات ہمیں اُن مشاہیر کے حالات زندگی، ان کے نظریات اور اُن کے کام کے ذریعہ تفصیل جان کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ نفسیات حالانکہ زندگی سے بہت قریب ہے، اور اس کی معلومات بہتر طریقے پر زندگی گزارنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اردو داں طبقے میں یہ علم اب بھی ایک دقیق، مشکل اور فلسفیانہ علم تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ عام قاری اس کتاب سے کیا حاصل کر سکے گا، لیکن بعض دانشوروں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اردو میں تعلیم یافتہ طبقہ اور دانشور حضرات اس کتاب کو ضرور پسند فرمائیں گے، اور نفسیات کے طالب علم اس سے بہتر طریقے سے فیضیاب ہو سکیں گے۔

— ناشر

**TAKHLEEQKAR PUBLISHERS**

205, St. No. 6, J-Ext., Laxmi Nagar, Delhi-110092

Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com